306

انٹرمیڈیٹ (TOSS)

(سینئر سکنڈری کورس)

اردو

اسٹیڈی میٹریل

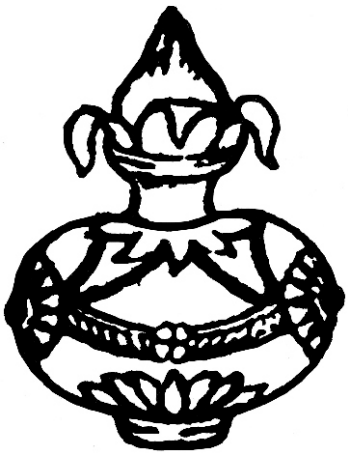

تلنگانہ اوپن اسکول سوسائٹی (TOSS) حیدرآباد

Telangana Open School Society, SCERT Campus, Opp. to L.B. Stadium, Basheerbagh, Hyderabad - 500 001.
Phone : 040-23299568, Swebsite : telanganaopenschool.org. E-mail : dirtoshyd@gmail.com

©TELANGANA OPEN SCHOOL SOCIETY
GOVERNMENT OF TELANGANA, HYDERABAD

First Print : 2015 (2000)
Second Print : 2015 (1486)
Third Print : 2016 (1528)
Reprint : 2018-2019
No .of Copies :

All Rights Reserved

No part of this publication may be reproduced ,stored in a retrieval system or transmitted ,in any form or by any means without the prior permission ,in writing of the publisher ,nor be otherwise circulated in any form of binding or cover.

Printed at :
Telangana Govenrment Text Book Press
Mint Compound ,Hyderabad.

Art & Design
Mhod. Abdullah Sulaiman, Quba Graphics, Hyd. 09704172672

مجلس نصاب

ڈائرکٹر

عالیجناب اے ستیہ نارائینا ریڈی

تلنگانہ اوپن اسکول سوسائٹی حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

محترمہ سی پدمجا

اوپن اسکول سوسائٹی حیدرآباد

ایڈیٹر

محمد مشاہد

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ تعلیم وتربیت

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-500032

مرتبین

● ڈاکٹر محمد صبغت اللہ شریف	لکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج، حسینی علم، حیدرآباد
● خواجہ سراج احمد فرید	لکچرر، سرسوت ڈگری کالج، حیدرآباد
● محمد عبدالبصیر	لکچرر، اے پی آر جے سی، نظام آباد
● ڈاکٹر عتیق اقبال	ریڈر، اردو آرٹس ایوننگ کالج، حمایت نگر، حیدرآباد
● محمد فیض اللہ	لکچرر، گورنمنٹ جونیر کالج، رائے چوٹی، کڑپہ
● عبدالرزاق	اسکول اسسٹنٹ، گورنمنٹ ہائی اسکول، گاندھی روڈ، محبوب نگر
● انورالدین	ایم اے۔ ایم فل

ترتیب وتزئین محمد عبداللہ سلیمان مظاہری قبا گرافکس حیدرآباد، تلنگانہ +91 97041 72672

Open School Society, Telangana State

Urdu -306

STUDY MATERIAL

Chief Editor

Sri A.Satyanarayana Reddy

MA.M.Ed

Director TOSS ,Hyderabad.

Course Co-ordinator

C.Padmaja

*M.A.*M.P*hil*

Regional Co-ordinator Open School Society .Hyd.

Editor

Mr .Mohammad Mushahid

Asst .Prof .Education Department

Moulana Azad National Urdu University ,Hyderabad - 500032

Writers

★ ***Dr. Md. Sibgathullah Shareef***

Lecturer Govt .Degree & PG College For Women Hussainialam Hyd.

★ ***K.S.A Fareed***

Lecturer Saraswath Eng .College Hyd.

★ ***Mohd Abdul Baseer***

Lecturer APRJC Nizambad

★ ***Dr .Ateeq Iqbal***

Reader Urdu Arts Evening College Hyd

★ ***Md. Faizullah***

Lecturer Govt .Junior College Raichoti ,Kadapa

★ ***Abdul Razzaq***

School Asst .Govt .High School Gandhinagar Road Mehboobnagar

★ ***Anwar Uddin***

*M.A.*M.P*hil*

★ ***Art & Design***

Mhod. Abdullah Sulaiman *Quba Graphics, Hyderabad - 5-*

FORE WARD

Education plays an important role in the modern society. Many innovations can be achieved through Education. Hence the Department of Education is giving equal importance to non-formal education through Open Distance Learning (ODL) mode on the lines of formal education. This is the first State Open School established in the country in the year 1991 offering courses up to Upper primary Level till 2008. From the academic year 2008-2009 SSC Course was introduced and Intermediate Course from the year 2010-2011. The qualified learners from the Open School are eligible for both higher studies and employment. So far 7,67,190 learners were enrolled in the Open Schools and 4,50,024 learners have successfully completed their courses.

With the aim of improving the administration at the grass-root level the Telangana Government re-organized the existing Districts and formed 31 new Districts. The formation of new Districts provide wide range of employment and Business opportunities besides self employment. Given the freedom and flexibilities available, the Open School system provides a second chance of learning for those who could not fulfill their dreams of formal education.

Government of Telangana is keen in providing quality education by supplying study materials along with the text books to enable the learners to take the exam with ease. Highly experienced professionals and subject experts are involved in preparing curriculum and study material based on subject wise blue prints. The study material for the academic year 2018-19 is being printed and supplied to all the learners throughout the state.

I wish the learners of Open School make best use of the study material to brighten their future opportunities and rise up to the occasion in building Bangaru Telangana.

With best wishes .....

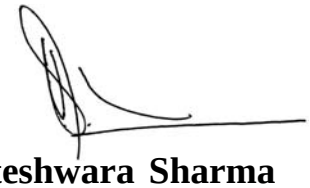

S. Venkateshwara Sharma
DIRECTOR,
Telangana Open School Society,
Hyderabad

فہرست

کتاب نمبر1

ماڈیول1: افسانوی اور غیر افسانوی ادب

1. افسانوی و غیر افسانوی ادب کا ارتقاء 1 -9
2. حق وفاداری 10 -17
3. پوس کی رات 18 -25
4. چوتھی کا جوڑا 26 -29
5. بھولا 30 -34
6. دروازے کھول دو 35 -41
7. مس چڑیا کی کہانی 42 -48
8. برج بانو 49 -55
9. چچا چھکن نے تیمارداری کی 56 -61
10. امید کی خوشی 62 -70

ماڈیول2: نظم کا ارتقاء

11. نظم کا ارتقاء (تاریخ) 71 -74
12. نئی تہذیب 75 -77
13. پرچھائیاں 78 -81
14. چاند تاروں کا بند 82 -85
15. خاک وطن 86 -90

کتاب نمبر2

ماڈیول3: غزل کا ارتقاء

16. غزل کا ارتقاء (تاریخ) 91 -99
17. میر تقی میرؔ 100 -106
18. غالبؔ 107 -112
19. مومنؔ 113 -119
20. آتشؔ 120 -126
21. حسرتؔ 127 -129
22. محمد علویؔ 130 -131

ماڈیول4: نظم کی دیگر اصناف

23. نظم کی دیگر اصناف (تاریخ) 132 -137
24. قصیدہ 138 -142
25. مرثیہ 143 -149
26. مثنوی 150 -154
27. رباعیات 155 -159
28. قطعات 160 -164

اختیاری کتاب 3A:

29A. خط و کتابت، دفتری نوٹ 165 -167
30A. صحافت اور رپورٹ 168 -170
31A. اداریہ 171 -174
32A. سرخی - 175 -
33A. کمپیوٹر کے ذریعہ ہونے والے کام 176 -178

اختیاری کتاب 3B:

29B. فیچر - 179 -
30B. انٹرویو 180 -183
31B. خبریں تیار کرنا 184 -190
32B. اشتہار تیار کرنا 191 -196
33B. الکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت 197 -201

اختیاری کتاب 3C

29C. ترجمے کی تعریف، ضرورت اور اہمیت 202 -206
30C. ترجمے کے اصول 207 -209
31C. ترجمے کی ٹیکنک 210 -213
32C. فن ترجمہ اور اس کی قسمیں 214 -218

اضافی سوالات

نظم، نثر اور اختیاری کتب سے 219 -263

01 : افسانوی وغیر افسانوی دور کا ارتقاء

I. ذیل کے سوالات کے تفصیلی جواب دیجئے ؟8 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. افسانوی ادب کا مختصر جائزہ لیجئے ؟

جواب: ادب فنون لطیفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ادب سے مراد حسن خیال، مواد کی ترتیب اور الفاظ کے مخصوص استعمال کا حسین اظہار ہے۔زندگی کا ہر پل، ہر لمحہ اور ہر واقعہ ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ادب کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک افسانوی ادب دوسرا غیر افسانوی ادب۔فرضی کرداروں اور فرضی واقعات کا تانا بانا جوڑ کر قصے کہانیوں کی شکل میں بیان کرنے کا نام ''افسانوی ادب'' ہے جبکہ دنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو قصد یں کے بغیر ادب اور فن کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے تو ایسی نثر کو ''غیر افسانوی ادب'' کہتے ہیں۔افسانوی ادب میں داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ کو شامل کیا جاتا ہے۔آئے ان کا مختصر جائزہ لیں۔

داستان:۔

داستان ایک ایسی طویل کہانی کو کہتے ہیں جس میں قصہ در قصہ یعنی کہانی میں کہانی موجود ہو۔داستان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی ایک کہانی نہیں رہتی بلکہ ایک کہانی ختم ہونے سے پہلے دوسری کہانی شروع ہوتی ہے اور دوسری جنم ہونے سے پہلے تیسری کہانی شروع ہوتی ہے۔داستان میں جو واقعات اور کردار ہوتے ہیں ان کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اس میں ایسی باتیں پیش کی جاتی ہیں جس کو انسانی عقل تسلیم نہیں کرتی۔داستان میں جو اہم کردار ہوتا ہے وہ ہر قسم کے عیب سے پاک اور ہر فن سے واقف ہوتا ہے کبھی بھی اس کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

اردو میں داستان گوئی کا رواج کافی قدیم ہے مگر 1800ء میں جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس کے ذریعہ کئی داستان لکھی گئی اور کئی ایک دوسری زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ اردو میں منتقل کی گئی۔اردو کی چند مشہور داستانیں یہ ہیں سب رس، نوطرز مرصع، داستانِ امیر حمزہ، الف لیلہ، آرائش محفل، باغ و بہار، بوستاج خیال، فسائد عجائب وغیرہ۔

ناول:۔

ناول وہ نثری قصہ ہے جس میں ہماری زندگی کی تصویر ہو بہو پیش کی گئی ہو۔ پیدائش سے لے کر موت تک انسان کو جو معاملات پیش آتے ہیں جس طرح وہ حالات سے مقابلہ کرتا ہے جس طرح وہ حالات کو یا حالات اسے تبدیل کر دیتے ہیں وہ سب ناول کا موضوع ہے۔ مختصر یہ کہ ناول ایک ایسا آئینہ ہے جس میں زندگی کے سارے روپ دیکھے جا سکتے ہیں۔

اردو میں ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے۔ 1869ء میں انہوں نے 'مراۃ العروس' ناول لکھ کر اردو ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ موجودہ دور میں بھی ناول لکھے جا رہے ہیں۔

افسانہ:۔

افسانہ مختصر کہانی کو کہتے ہیں۔ جس طرح ناول میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کا ذکر ہوتا ہے اسی طرح افسانہ میں صرف انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو یا ایک واقعہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اس میں مختصر کردار، مختصر وقت، مختصر مکالمے ہوتے ہیں۔ افسانہ میں وحدت تاثر کی کافی اہمیت ہے۔

اردو میں افسانوں کی ابتداء کرنے والوں میں پریم چند، سجاد حیدر بلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوس اور مجنوں گورکھپوری کے نام ملتے ہیں مگر فنی اعتبار سے افسانہ کی بنیاد ڈالنے والے منشی پریم چند ہیں۔ جنہوں نے کئی افسانوی مجموع شائع کئے۔ کفن ان کا شاہ کار اور کامیاب افسانہ ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ اردو میں افسانہ لکھنے والے یہ ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسین منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین وغیرہ۔

ڈرامہ:۔

کسی کہانی یا واقعہ کو کردار کے ذریعہ ناظرین کے سامنے اسٹیج پر پیش کرنے کو ڈرامہ کہتے ہیں۔ ڈرامہ میں واقعہ کو عمل کے ذریعہ کر کے دیکھانا اہم ہوتا ہے۔ اردو میں کئی ایک ڈرامہ لکھے گئے ہیں لیکن جو مقام امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی' کو ملی وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ آخر میں ایک بات یہ ہے کہ بعض ناقدین ڈرامے کو افسانوی ادب میں شامل نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ صرف داستان، ناول اور افسانہ ہی کو افسانوی ادب کہتے ہیں۔

سوال 2. غیر افسانوی ادب کا مختصر جائزہ لیجئے؟

جواب: ادب کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک افسانوی ادب جس میں فرضی واقعات کو فرضی کردار کے ذریعہ فنی اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں داستانِ، ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہے۔ دوسرا غیر افسانوی ادب جس میں دنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو قصیدیں کے بغیر ادب اور فن کے تقاضوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں تذکرہ نگاری، تحقیق وتنقید، مکاتب، مضمون نگاری، صحافت، طنز و مزاج، آپ بیتی، خاکہ نگاری، انشائیہ اور سفر نامہ شامل ہیں۔ آیئے اب غیر افسانوی ادب کا مختصر جائزہ لیں۔

تذکرہ نگاری:۔

تذکرہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں مصنف اپنے دور کے شعرأ کے نام، پیدائش وفات، تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ تذکرہ میں مختلف شعرأ کا مختصر ذکر ہوتا ہے۔ یہ صنف اردو میں فارسی کے اثر سے آئی۔ اردو شعرأ کا تذکرہ ''نکات الشعرأ'' ہے جس کے مصنف میر تقی میرؔ ہیں۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزادؔ کا تذکرہ 'آبِ حیات' نے کافی شہرت حاصل کیا۔ اردو کے چند تذکرے یہ ہیں۔ آثار الشعرائے ہنود، سخن شعرأ، جلوہ خضر، گل رعنا وغیرہ۔

تنقید:۔

اچھائی اور برائی کے درمیان فیصلہ کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ ادب میں کسی فن پارے کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ اس کے مقام ومرتبہ کا تعین کر کے خوبیوں اور خامیوں کا اظہار کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ اردو میں تنقید کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی کی کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کئی ناقدین اردو زبان و ادب کو ملے ہیں۔

تحقیق:۔

سچائی کی تلاش تحقیق ہے۔ کسی بھی قدیم تخلیق یا کتاب کی تلاش وجستجو کر کے اس کی حقیقت تک پہنچنا ''تحقیق'' کہلاتی ہے۔ اس میدان میں کام کرنے والوں کو محققین کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام، مسعود حسین خاں اردو کے محققین ہیں۔ تحقیق میں کون، کیوں، کب اور کیسے سوالات کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔

مضمون نگاری:۔

کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کرنے کا نام مضمون نگاری ہے۔مضمون نگاری میں موضوع کی پابندی نہیں ہوتی مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ غور وفکر کے ساتھ موضوع کے تمام گوشوں کو پیش کیا جائے۔ مضمون نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کے تعلق سے کثیر معلومات حاصل کریں اور واضح انداز میں اس کو پیش کریں۔مضمون میں وسعت اور معلومات کا خزانہ ہو۔اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا سرسید کے تہذیب 'الاخلاق' سے ہوتی ہے۔

سوانح نگاری:۔

کسی فرد کی زندگی کے تمام حالات و کیفیات کے ساتھ ساتھ ماحول اور نفسیاتی عوامل کا تفصیلی ذکر کرنا سوانح عمری کہلاتا ہے۔اس میں فرد واحد کی تمام زندگی کی کہانی پیش کی جاتی ہے۔اردو میں سوانح نگاری کا آغاز حالی کی کتاب 'حیات سعدی' سے ہوتا ہے۔اس کے بعد شبلی، وحیدالدین سلیم وغیرہ نے اس صنف کو ترقی دی۔

آپ بیتی یا خودنوشت:۔

کسی فرد کی کہانی کو وہ خود کتابی شکل میں تحریر کرتا ہے تو اس کو آپ بیتی یا خودنوشت کہتے ہیں۔آپ بیتی میں فرد واحد اپنے تمام زندگی کے واقعات کو وہ خود بیان کرتا ہے۔اردو میں 'تواریخ عجیب' پہلی آپ بیتی ہے جس کے مصنف جعفر ہے۔اس کے علاوہ ظہیر دھلوی، جوش ملیح آبادی اور خواجہ حسن نظامی نے اپنی اپنی آپ بیتیاں تحریر کئے ہیں۔

صحافت:۔

اخبار میں خبریں لکھ کر شائع کروانا صحافت کہلاتا ہے۔صحیفہ کے لغوی معنی کتاب کے ہیں مگر خبروں کی اشاعت میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔اردو صحافت کی ابتدا 1822ء سے ہوتی ہے جب لالہ سدا سکھ نے اخبار ''جام جہاں نما' شائع کیا یہ اخبار فارسی میں شائع ہوا تھا مگر اس کا کچھ حصہ اردو میں بھی تھا۔اردو کا پہلا مکمل اخبار مولانا محمد حسین آزاد کے دادا مولانا محمد باقر نے 1836ء کو شائع کیا۔جس میں ادبی علمی اور تاریخی مضامین بھی شامل تھے۔

انشائیہ:۔

انشائیہ میں عام طور پر انتہائی اہم اور سنجیدہ خیالات کو لطیف انداز میں قدرے تخیل آمیزی کے ساتھ

پیش کیا جاتا ہے۔انشائیہ دراصل داخلی اور خارجی کیفیت با اثرات کا آزاد بیان ہے۔انشائیہ میں کسی بھی قسم کی پابندی نہیں رہتی۔انشائیہ نگار بے جھجھک ہر موضوع پر کھل کر لکھ سکتا ہے۔اردو میں انشائیہ کے نمونے 'آبِ حیات' میں نظر آتے ہیں۔فرحت اللہ بیگ مشہور انشائیہ نگار ہیں۔

طنز ومزاح:۔

طنز کے معنی چھیڑ چھاڑ کے ہیں جبکہ مزاح کے معنی ہنسی مذاق کے ہیں لیکن عام طور پر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں جسکے معنی یہ ہیں کہ کسی کی برائی یا کمزوری کو پردے میں رکھ کر چھپے ہوئے انداز میں پیش کی جائے۔ظاہر میں وہ اچھائی یا مذاق نظر آئے مگر باطن واندر میں اس سے کسی کی غلطی کی اصلاح ہو، یہی طنز ومزاح ہے۔اردو کے داستانوں میں اس کے نقوش ملتے ہیں مگر غالب کے خطوط طنز ومزاح سے بھرے ہوئے ہیں۔اسی طرح لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار 'اودھ پنچ' میں بھی کافی طنز ومزاح کے مضامین ملتے ہیں۔اردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشآر، فرحت اللہ بیگ، پطرسن بخاری، رشید احمد صدیقی وغیرہ بہترین طنز و مزاح نگار ہیں۔

مکتوب نگاری:۔

خطوط نگاری ہی کا نام مکتوب نگاری ہے جس میں کوئی شخص، شاعر یا ادیب دوسروں کو خطوط لکھتا ہے۔ اردو میں غالبؔ سے خطوط نگاری کی ابتدا ہوئی ہے۔غالب نے خطوط نگاری کے تمام قدیم اصول وضوابط اور رسمی بات چیت کو ختم کر کے بلا تکلیف کے انداز کا آغاز کیا۔

اردو میں غالب کے ساتھ ساتھ حالی، شبلی، اکبرالہ آبادی، ابوالکلام آزآد، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے خطوط مشہور ہیں۔

خاکہ نگاری:۔

خاکہ میں کسی شخص کی زندگی کی ایسی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں جس سے اس کی شخصیت یا سیرت نمایاں ہوں۔اس شخص کی ہر کیفیت، رفتار وگفتار، طرزِ زندگی اور عام رویے کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔اردو کا باقاعدہ خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔عابد حسین، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی وگیرہ بہترین خاکہ نگار ہیں۔

مذکورہ تمام اصناف غیر افسانوی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔جن میں حقیقت اور سچائی شامل ہوتی ہے۔

II. ذیل کے سوال کا مختصر جواب دیجئے۔4 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. اردو نثر کی ابتدا کس طرح ہوئی لکھئے؟

جواب: دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو میں بھی نثر کا آغاز شاعری کے بعد ہوا۔ جدید تحقیق کے مطابق اردو نثر کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری سے ہوئی۔ ابتداء میں مذہبی عالم اپنے مریدوں اور مذہبی لوگوں کے لئے دینی تعلیم پر مشتمل چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے۔ یہ رسالے مذہبی تھے۔ عوام کی سمجھ کے لئے ان رسالوں میں عام فہم زبان استعمال کی گئی تھی۔ اب تک میراں جی شمس العشاق، برہان الدین حاتم، شیخ عین الدین گنج العلم کے کچھ مذہبی رسالے ملتے ہیں۔ مذہبی رسالے لکھنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عام لوگ دیسی زبان جانتے تھے۔ اس لئے صوفیائے کرام اپنے خیالات عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے دیسی بولیوں اور زبانوں کا استعمال کیا تھا۔ دکن میں ملا وجہی نے نثر میں سب رس لکھی جسے اس دور کی کامیاب ادبی نثر کہا جاتا ہے۔ اس کی زبان عام فہم اور بامحاورہ ہے۔

شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتداء محمد شاہی عہد (1719-1748) سے ہوتی ہے۔ 1731ء میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا۔ اس میں واقعہ کربلا کے ساتھ ساتھ امام حسین اور ان کے رفقاء کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات اور مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا رواج کم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی فارسی، عربی کی مذہبی اور صوفیانہ کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ 1775ء میں میر حسن عطا تحسین نے ایک فارسی داستان ''قصہ جہاد درویش'' کا 'نوطرزِ مرصع' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس طرح اردو نثر کی ابتدا مذہبی وصوفیانہ رسالوں سے ہوتی ہے۔

سوال 2. غالب نے اردو نثر میں کن اصناف کو متاثر کیا؟

جواب: غالب نے اردو نثر میں صنفِ مکتوب نگاری کو متاثر کیا۔ غالب کے زمانے میں جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں فارسی الفاظ کی کثرت، القاب وآداب میں زیادہ تکلف استعمال کیا جاتا تھا۔ غالب نے اس طریقہ کو بدل دیا۔ انہوں نے عام فہم زبان میں خطوط لکھنا شروع کیا۔ وہ اپنے مخاطب کو بے جا القاب وآداب کے بجائے مختصر الفاظ استعمال کرنے لگے اور تکلف کو برطرف کر کے ایسی تحریریں لکھیں کہ سامنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا غالب خط نہیں لکھے ہیں بلکہ اپنے سامنے ٹھہر کر گفتگو کر رہے ہیں۔ انہوں نے خط کے تمام قواعد

سے گریز کیا اور دل کی باتوں کو بے تکلف اپنے خطوط میں پیش کیا۔

اردو میں مکتوب نگاری کی ابتداء بھی غالب ہی سے ہوتی ہے اس سے پہلے اردو میں دو ایک شخص کے خطوط ملتے ہیں مگر اس میں فارسی زبان زیادہ استعمال کی گئی ہے۔اس کے برخلاف غالب نے اپنے خطوط میں عام قاری کے لئے کئی معلومات فراہم کئے اور زبان والقاب بھی عام فہم استعمال کئے۔غرض کہ اردو خطوط نگاری میں غالب کا انداز تحریر سب سے الگ اور اعلیٰ ہے کئی مصنفوں نے غالب کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی مگر ایسا انداز تحریر کسی کو نصیب نہ ہوسکا۔

سوال 3. ڈپٹی نذیر احمد کے تعلق سے آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔جنہوں نے اردو کا پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' 1869ء میں لکھا۔اردو میں اس سے قبل داستانیں لکھیں گئیں تھیں۔نذیر احمد نے اپنی لڑکیوں کی تربیت کے لئے ایک قصہ 'اکبری واصغری' کے نام سے لکھا تھا۔یہی کتاب آگے چل کر اردو کا پہلا ناول بن گئی۔ڈپٹی نذیر احمد کے چند مشہور ناول یہ ہیں۔بنات النعش ،توبتہ النصوح ،ابن الوقت ،روبتہ صادقہ ،فسانۂ مبتلاء وغیرہ۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اپنے ناولوں پر حکومت کی جانب سے کئی انعامات بھی دئے گئے۔آپ کا ناول ''توبتہ النصوح' ایک شاہ کار ہے جس کا کردار مرزا ظاہر دار بیگ اردو کے لافانی کرداروں میں شامل ہے۔آپ نے اپنے ناولوں کو سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ان کا مقصد قوم کی ذہنی اور معاشی پستی کو دور کرنا تھا۔ان کے ناول فنی اعتبار سے کمزور ہی سہی مگر یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اردو نثر کو ایک نیا انداز بخشا۔

سوال 4. مضمون نگاری پر ایک نوٹ لکھئے۔

جواب: مضمون نگاری کو انگریزی میں (Eassy Writing) کہتے ہیں۔کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کرنے کا نام مضمون نگاری ہے۔مضمون نگاری میں موضوع کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ مضمون نگار کوئی بھی موضوع لے سکتا ہے اور اپنی معلومات کو واضح انداز میں پیش کرسکتا ہے۔مضمون نگار کے لئے یہ پابندی ہے کہ وہ جس موضوع کا انتخاب کیا ہے اس تعلق سے زیادہ سے زیادہ معلومات رکھتا ہو اور وہ واضح اور کھلے ہوئے انداز میں اپنی معلومات کو پیش کریں۔اردو میں تعلیمی ،اصلاحی ،معاشرتی ،اخلاقی تاریخی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔سرسید احمد خاں اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنہوں نے اپنے رسالہ 'تہذیب الاخلاق'

میں مضمون نگاری کی ابتداء کی۔اس رسالے میں سرسید نے ہر طرح کے موضوعات پر کھلے ہوئے انداز میں اپنی معلومات کو پیش کیا ہے۔

سرسید کے علاوہ اردو مضمون نگاروں میں حالی، محمد حسن آزاد، ذکا اللہ، ماسٹر رام چندر، وحیدالدین سلیم، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

II. ہر سوال کا دو تا تین سطور میں جواب دیجئے۔2 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟

جواب: فورٹ ولیم کالج سن 1800ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا جس کا اہم مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں کو سکھانا تھا۔ان زبانوں میں اردو کو بہت اہمیت حاصل تھی کیوں کہ اردو ہی وہ زبان تھی جو ملک کے بہت سے حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔انگریز اسے عام طور پر ہندوستانی کہتے تھے اور اسی کو یہاں کی عام زبان قرار دیتے تھے۔اس کالج میں اہم رول ادا کرنے والے ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے۔

سوال 2. فورٹ ولیم کے چند مصنفین کے نام لکھئے؟

جواب: فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے چند مشہور مصنفین کے نام یہ ہیں میر امن، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، کاظم علی جوان، نہال حیدر لاہوری، للولال جی وغیرہ۔

سوال 3. فورٹ ولیم کالج کی کونسی کتاب کو سب سے زیادہ شہرت ملی؟

جواب: فورٹ ولیم کالج میں ایسی کتابیں لکھوائی گئیں جو عام دلچسپی کی داستانیں یعنی اصلاحی، اخلاقی، تاریخی اور تعلیمی موضوعات پر مبنی تھیں۔ان کتابوں کی زبان انتہائی سیدھی سادھی تھیں۔کالج کے تمام کتابوں میں جو شہرت و مقبولیت میر امن کے 'باغ و بہار' کو ملی وہ کسی دوسری کتاب کو نہ مل سکی۔

سوال 4. فسانہ آزاد کے تعلق سے لکھئے؟

جواب: ''فسانہ آزاد'' پنڈت رتن ناتھ سرشار کا شاہ کار سمجھا جاتا ہے۔اس کتاب میں لکھنو کی تہذیب و معاشرت اور روزمرہ زندگی کی بڑی جاندار عکاسی کی گئی ہے۔سرشار کا یہ طویل افسانہ لکھنوی تہذیب کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ داستان اور ناول کے درمیان کی ایک اہم کڑی ہے۔اس کہانی میں فوجی اور آزاد ایسے کردار ہیں جو اردو کے لافانی کردار ہیں۔

سوال5. ناول ''امراؤ جان ادا'' کے تعلق سے لکھئے؟

جواب: مرزا محمد ہادی رسوا نے لکھنؤ کی ایک طوائف کی زندگی کو موضوع بنا کر 1899ء میں یہ ناول ''امراؤ جان ادا'' لکھا ہے جس میں لکھنوی تہذیب کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ناول مرزا ہادی رسوا کی شاہکار ہے جس میں ناول کے فن کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی یہ ناول اہمیت کے قابل ہے۔ اس ناول میں طوائف کی زندگی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔

IV. ذیل کے سوالوں کے جواب ایک لفظ یا جملے میں دیجئے؟

1. اردو نثر کی ابتداء کب ہوئی؟

جواب: آٹھویں صدی ہجری سے۔

2. فورٹ ولیم کالج کب اور کہاں قائم ہوئی؟

جواب: 1800ء کلکتہ

3. عبدالحلیم شرؔر کے ناولوں کا موضوع کیا ہے؟

جواب: تاریخی

4. میر تقی میرؔ کے تذکرۂ کا نام کیا تھا؟

جواب: نکات الشعرأ

5. آب حیات کس کا تذکرہ ہے؟

جواب: محمد حسین آزاد

6. یادوں کی برأت کس کی سوانح عمری ہے؟

جواب: جوش ملیح آبادی

7. اودھ اخبار کہاں سے شاء ہوتا تھا؟

جواب: لکھنؤ

8. اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ نگار کون ہے؟

جواب: مرزا فرحت اللہ بیگ

02 : حق وفاداری

حیدر بخش حیدری

I. تفصیلی جواب۔8 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. ''سبق حق وفاداری'' کا خلاصہ لکھئے؟

جواب: ایک دن طبرستان کے بادشاہ نے اپنے محل میں ایک مجلس منعقد کی۔اس مجلس میں کھانے کی ہر قسم کی چیزیں کباب وغیرہ اور پینے کے لئے شرابیں وغیرہ کا انتظام کیا۔اس محفل میں طبرستان شہر کے امیر، شہزادے، وذیر، استاد بلکہ جتنے اہل کمال تھے سب حاضر ہوئے۔اس پر کیف محفل کے درمیان اچانک ایک اجنبی شخص بے دھڑک چلا آیا۔تمام مجلس والے حیران ہو گئے اس سے سوال کئے کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ اجنبی شخص نے جواب دیا وہ شیروں کو پکڑنے والا، تیر اندازی اور تلوار چلانے میں ماہر ہے بلکہ ہر ایک فن کا ماہر ہے پہلے امیر خجند کے پاس نوکر تھا اس نے میری قدر نہیں کی اس لئے طبرستان کے بادشاہ کے پاس آیا ہوں اگر وہ مجھے کام دے گا تو میں اس کام کو اچھی طرح انجام دونگا اور وقت آنے پر اپنی جان تک قربان کرونگا۔طبرستان کے بادشاہ نے اجنبی شخص کی گفتگو سن کر اس کو پاسبانی کی خدمت دی چنانچہ اجنبی شخص اس دن سے بادشاہ کے محفل کی پاسبانی کرتا رہا۔

ایک رات بادشاہ محل کے اوپری حصہ پر کھڑا ادھر ادھر پھر رہا تھا۔اس کی نظر نیچے ٹھہرے ہوئے شخص پر پڑی جو بادشاہ نے اس سے سوال کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ محفل کا پاسبان ہے کئی دن سے محل کی نگرانی کر رہا ہے۔پاسبان نے مزید کہا کہ وہ کئی دن سے بادشاہ کو دیکھنے کا منتظر تھا آج دیدار ہوا اور دل خوش ہوا۔اسی وقت اچانک ایک آواز آئی ''میں جاتی ہوں ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھر لاوے'' بادشاہ نے یہ آواز سن کر تعجب ہوا اور پاسبان سے پوچھا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ پاسبان نے جواب دیا کہ میں بھی کئی دن سے یہ آواز سن رہا ہوں مگر میں محل کا نگران کار ہوں محل چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔اگر بادشاہ حضور اجازت دیں تو فوراً جاؤنگا اور دریافت کر کے اطلاع دونگا۔بادشاہ نے پاسبان کو اجازت دی اور پاسبان اس آواز کو معلوم کرنے کے لیے نکل پڑا۔بادشاہ بھی ایک کالی کمبل اوڑھ کر پاسبان کے پیچھے نکلا۔

پاسبان جب جنگل میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے آواز آرہی تھی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک حسین

خوبصورت عورت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر یہی الفاظ دہرا رہی ہے۔ پاسبان نے سوال کیا کہ اے عورت تو کون ہے اور یہ الفاظ کئی راتوں سے کیوں کہہ رہی ہے؟ عورت نے جواب دیا کہ وہ طبرستان کے بادشاہ کی عمر کی تصویر ہے۔ بادشاہ کی عمر مکمل ہونے کو ہے اس کا چند دن میں انتقال ہو جائے گا۔ پاسبان یہ سن کر بہت پریشان ہوا اور عورت سے سوال کیا کہ بادشاہ کی عمر میں کس طرح اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ عورت نے جواب دیا کہ ایک طریقہ ہے اگر تو اپنے بیٹے کو بادشاہ کے بدلہ ذبح کرے گا تو بادشاہ کی عمر میں اضافہ ہوگا۔ پاسبان نے اس عورت سے کہا کہ اے صورت عمر بادشاہ، اپنی عمر اور اپنے بیٹے کی عمر بادشاہ کے لئے قربان کرتا ہوں تو جلدی مت کر یہیں کھڑی رہ میں ابھی اپنے بیٹے کو لاتا ہوں اور اس کو ذبح کرتا ہوں۔

پاسبان گھر پہنچ کر تمام واقعہ اپنے بیٹے کو سنایا۔ بیٹا وفادار اور نیک بخت تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ایسے عادل، منصف صاحب سخا بادشاہ کے لئے میں ایک ہی نہیں بلکہ گھر کے تمام افراد کام آ جائیں تو ابا حضور آپ ہمت مت ہارنا بلکہ تمام لوگوں کو بادشاہ کے لئے قربان کر دینا اگر بادشاہ زندہ رہا تو ایک عالم کی پرورش کرے گا۔ آپ مجھے جلد لے جائیں اور بادشاہ کے بدلے ذبح کریں۔ پاسبان نے اس عورت کے پاس اپنے لڑکے کو لے گیا لڑکے کے ہاتھ پیر اور آنکھوں کو باندھ کر تیز تلوار لے کر جب ذبح کرنے لگا تو عورت نے فوراً پاسبان کو روک لیا اور کہا کہ اے پاسبان اپنے بیٹے کو ذبح مت کر اور اس کا گلا مت کاٹ۔ اللہ تعالیٰ کو تیری ہمت پر رحم آیا اور بادشاہ کی عمر میں ساٹھ سال کا اضافہ کیا ہے۔ جب یہ بات پاسبان نے سنا تو خوش ہوا اور یہ خبر بادشاہ کو سنانے دوڑا۔ طبرستان کے بادشاہ نے یہ تمام واقعہ آنکھوں سے دیکھا اور پاسبان کے بیٹے کی ہمت و جرأت کو بھی معلوم کیا۔ پھر دوڑ کر محل کے اوپری حصہ میں آ کر ادھر ادھر پھرنے لگا۔

پاسبان بادشاہ کے حضور میں آیا اور خدمات بجالایا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کس کی آواز تھی۔ پاسبان نے جواب دیا کہ بادشاہ سلامت ایک عورت اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے آئی تھی میں نے اس کو میٹھی میٹھی باتوں سے سمجھا کر دونوں کو ملا دیا ہے وہ عورت 60 برس تک اپنے شوہر کے گھر سے نہیں نکلے گی۔ بادشاہ نے پاسبان کی دانائی، قربانی اور اس کے بیٹے کی ہمت کو دیکھا تھا چنانچہ بادشاہ نے کہا کہ پاسبان جس وقت تو خبر لینے چلا تھا میں بھی تیرے پیچھے آیا تھا۔ تیرے اور اس عورت کے سوال جواب اور تیرے بیٹے کی ہمت کو میں نے دیکھا ہے۔ خیر اس سے پہلے تو غریب محتاج، ذلیل و پریشان تھا۔ اب میری پاسبانی میں نوکر ہوا ہے۔ روز بروز تو ترقی کرے گا اور میں تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔ یہ کہہ کر بادشاہ آرام کرنے گیا۔ صبح ہونے پر

بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا اور شہر کے سب وزیروں، امیروں اور اہل کاروں کو جمع کر کے اعلان کیا کہ میرے بعد پاسبان اس سلطنت کا وارث بنے گا اور یہی میرا ولی عہد ہے۔ اس طرح پاسبان اپنی وفاداری اور ہمت سے ولی عہد مقرر ہوا۔

سوال 2. سبق ''حق وفاداری'' کا مرکزی خیال بیان کیجئے؟

جواب: قصہ ''حق وفاداری'' دراصل حیدر بخش حیدری کی مشہور داستان ''طوطا کہانی'' سے لیا گیا ہے۔ جس میں پاسبان کی ہمت، بہادری اور وفاداری کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔

ایک پاسبان جو کئی فنون کا ماہر ہے۔ شیروں کو پکڑنے، تلوار چلانے اور تیراندازی کے ساتھ ساتھ اپنے تیر سے پتھر کو بھی دو ٹکڑے کرنے کی ہمت و طاقت رکھتا ہے۔ یہ پاسبان پہلے امیر خچند کے پاس نوکر تھا۔ امیر خچند نے اس کی عزت نہیں کی تو اس نے طبرستان کے دربار میں آیا اور اپنی قابلیت کا دعویٰ کیا۔ جس پر طبرستان کے بادشاہ نے اس کو محل کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری دی اور وہ محفل کی پاسبانی پر معمور ہو گیا۔

بادشاہ نے پاسبان کی وفاداری اور ہمت کا امتحان لینے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور ایک عورت کو بادشاہ کی عمر کی تصویر بنا کر بروز آدھی رات کے وقت ایک آواز ''میں جاتی ہوں'' ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے'' پکارنے کو کہا چنانچہ ہر روز ایک عورت محل کے قریب کے جنگل سے یہ آواز پکارنے لگی۔ جس کو پاسبان روز آنہ سن رہا تھا۔ ایک رات بادشاہ نے عمداً محل کے بالائی حصہ میں چہل قدمی کرتے ہوئے پاسبان سے سوال کرتا ہے کہ تو کون ہے جس پر پاسبان اپنی پاسبانی کا ذکر کرتا ہے اور بادشاہ کے دیدار پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ اچانک عورت کی آواز سنائی دیتی ہے جس پر بادشاہ پاسبان سے سوال کرتا ہے کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے۔ پاسبان جواب دیتا ہے کہ یہ آواز کئی دن سے روز آنہ آدھی رات کے وقت آرہی ہے مگر وہ محل کی پاسبانی و نگرانی کے لئے مقرر ہے اس لئے اس آواز کو معلوم نہ کر سکا۔ وہ بادشاہ سے گذارش کرتا ہے کہ اگر وہ اجازت دیں تو فوراً جائے گا اور بہت جلد اس کی خبر لے آئے گا۔ بادشاہ اجازت دیتا ہے ساتھ ہی ساتھ بادشاہ بھی عمداً پاسبان کے پیچھے چلتا ہے تا کہ اس عورت اور پاسبان کے درمیان کی گفتگو سنے۔

پاسبان بغیر کسی قسم کے ڈر کے ہمت کے ساتھ آواز کی طرف جاتا ہے۔ وہاں دیکھتا ہے کہ ایک حسین خوبصورت پری پیکر صورت کی عورت کھڑی ہے اور یہی آواز بار بار کہہ رہی ہے۔ پاسبان کے سوال کرنے پر

عورت جواب دیتی ہے کہ وہ طبرستان کے بادشاہ کی عمر کی تصویر ہے۔ بادشاہ کی عمر عنقریب ختم ہونے والی ہے یہ سنکر پاسبان پریشان ہوتا ہے اور اس عورت سے التجا کرتا ہے کہ کیا کوئی دوسری صورت ہے جس کے ذریعہ بادشاہ کی عمر میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ عورت جواب دیتی ہے کہ اگر تو اپنے بیٹے کو بادشاہ کی عمر کے لئے ذبح کرے تو بادشاہ کی عمر میں اضافہ ہوگا۔ پاسبان اس بات کو سنکر خوش ہوتا ہے اور اپنی وفاداری کی مثال پیش کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو لاکر عورت کے پاس رکھتا ہے۔ بیٹے کے ہاتھ پیر اور آنکھ بند کرکے جب ذبح کرنے کی نیت سے تلوار نکالتا ہے تو عورت پاسبان کو روک لیتی ہے اور کہتی ہے کہ حق تعالیٰ نے تیری وفاداری اور تیرے بیٹے کی قربانی کو پسند کیا ہے اور بادشاہ کی عمر میں 60 سال کا اضافہ کیا ہے۔ پاسبان یہ جواب سنکر خوش ہوتا ہے اور اس آواز کی خبر کو سنانے کے لیے بادشاہ کے محل کو آتا ہے۔ یہ تمام واقعہ بادشاہ خود دیکھ کر اور ساتھ ہی ساتھ پاسبان کے بیٹے کی قربانی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خاموش محفل پر آخر پھر دوبارہ چہل قدمی کرنا شروع کرتا ہے۔

پاسبان محل کو آکر بادشاہ کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ یہ آواز ایک عورت کی تھی جو اپنے شوہر سے جھگڑ کر کے آئی تھی اس نے اس کو میٹھی میٹھی باتین بتا کر سمجھا کر دوبارہ دونوں کو ملا دیا۔ وہ دوبارہ شوہر سے جھگڑا نہیں کرے گی اور 60 سال تک مل جھل کر رہے گی۔ بادشاہ نے پاسبان کی اس بات سے بہت خوش ہوا۔ پاسبان کی وفاداری، ہمت اور جان فشانی اور اس کے بیٹے کی ہمت کو دیکھ کر اور بھی خوش ہوا۔ دوسرے روز دربار میں تمام شہزادوں، امیروں اور وزیروں کے سامنے اعلان کیا کہ پاسبان آج سے اس سلطنت کا ولی عہد ہے۔

اس سبق میں بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی شخص، وفاداری، ہمت، جاں فشانی سے کام کرکے دنیا میں اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک بن سکتا ہے۔ یہی اس سبق کا مرکزی خیال ہے۔

II. مختصر جوابی سوالات۔ 4 نشانات مقرر ہیں۔

سوال 1. ذیل کی عبارت کا بحوالہ متن تشریح کیجئے؟

میں شمشیر زن ہوں، شیر گر ہوں اور تیر اندازی بھی ایسی جانتا ہوں کہ تیر میرا سنگ خارا کو پھوڑتا ہے بلکہ پہاڑ کے بھی دو سار ہوتا ہے؟

جواب: مندرجہ بالا عبارت داستانِ ''طوطی کہانی'' کے اقتباس ''حق وفاداری'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف حیدر بخش حیدری ہیں۔

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ ایک مرتبہ طبرستان کی مجلس میں ایک اجنبی شخص آیا جس کی آمد پر محفل کا ہر شخص اس سے سوال کرنے لگا کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے جس پر اجنبی شخص کہتا ہے کہ وہ بہترین تلوار چلانا جانتا ہے اور شیروں کو پکڑنے کے فن سے بھی واقف ہے ساتھ ہی ساتھ تیر انداز میں تیر ایسے چلاتا ہے کہ اس کا تیر پتھر کو بھی دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس طرح اجنبی شخص اپنی قابلیت کا ظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ کئی فنون کا ماہر ہے۔ اس کو اگر محفل میں کوئی ملازمت مل جائے تو وہ اپنی قابلیت کی بنیاد پر محل کی نگرانی کرے گا اور تمام لوگوں کو خوش کرے گا۔

سوال 2. بادشاہ نے پاسبان کی دانائی کس طرح معلوم کی لکھئے؟

جواب: طبرستان کے بادشاہ نے اپنے محل کے پاسبان کی ہمت، وفاداری اور دانائی کا امتحان لینے کے لیے ایک منصوبہ بنا کر روزانہ رات کے وقت ایک عورت کے ذریعہ آواز دینے لگا۔ ''میں جاتی ہوں، ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے'' اور خود ایک رات بادشاہ نے پاسبان سے سوال کیا کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے جس پر پاسبان نے جواب دیا کہ یہ آواز کئی راتوں سے آرہی ہے اگر بادشاہ اجازت دیں تو ابھی جاؤں گا اور جلد معلوم کر کے آؤں گا۔ بادشاہ نے اجازت دی تو پاسبان جنگل کی طرف بڑھنے لگا اسی وقت بادشاہ بھی کالی کمبل اوڑھ کر پاسبان کے پیچھے چلنے لگا جب پاسبان نے اس عورت سے بات چیت کی تو بادشاہ دور کھڑے ہو کر چھپ کر تمام بات چیت سنی اور جب پاسبان اپنے لڑکے کی قربانی کے تعلق سے اپنے لڑکے سے بات چیت کے لئے گھر گیا تو بادشاہ نے بھی یہاں کا واقعہ معلوم کرایا۔ بعد میں جب پاسبان دوبارہ محل کی طرف واپس ہونے لگا تو بادشاہ نے بھی فوراً محل کے بالائی حصہ پر آیا اور چہل قدمی کرنے لگا۔ جب پاسبان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے سوال کیا کہ یہ کس کی آواز تھی۔ پاسبان نے جواب دیا کہ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے آئی تھی میں نے اسے سمجھا دیا ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ 60 سال تک اپنے شوہر کے گھر میں رہے گی۔ بادشاہ اصل بات چیت سے واقف تھا۔ پاسبان کی وفاداری اور اس کی دانائی و عقلمندی سے بادشاہ بے حد خوش ہوا اور اس کو ولی عہد کے انعام سے نوازا۔

سوال 3. طبرستان کی مجلس میں آنے والا اجنبی کون تھا اور کیوں آیا تھا؟

جواب: بادشاہ طبرستان کی طرف سے دی جانے والی پر تکلف دعوت میں اچانک آجانے والا اجنبی ایک عام آدمی تھا۔ وہ تیر اندازی، تلوار بازی اور شیروں کو پکڑنے میں ماہر اور جاں باز تھا۔ وہ پہلے خچند کے امیر کے پاس

ملازم تھا لیکن امیر نے اس کی ماہرانہ صلاحیتوں اور خوبیوں کی کوئی قدر نہیں کی اسی لئے اس نے امیر کی نوکری چھوڑ کر طبرستان کی بادشاہ کے پاس یہ امید لے کر آیا تھا کہ شاید وہ اس کی قدر کرے گا اور اپنے ہاں ملازم رکھے گا تا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے اس کا صلہ پا سکے۔

سوال 4. پاسبان کو بادشاہ نے آدھی رات کے وقت کونسی چیز لانے کو بھیجا؟

جواب: ایک رات بادشاہ نے اپنے محفل کی چھت پر کھڑا اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر نیچے کھڑے ایک آدمی پر پڑی۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے۔ آدمی نے بتایا کہ وہ پاسبان ہے اور اس محل کی نگرانی کر رہا ہے اور یہ کہ بادشاہ کی مبارک صورت دیکھ کر اس کا دل خوشی سے پھر گیا ہے۔ اسی وقت جنگل کی طرف سے ایک عورت کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی ''میں جاتی ہوں، ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے''۔

بادشاہ یہ آواز سن کر حیرت میں پڑ گیا اور پاسبان سے جو خود کئی دنوں سے یہ آواز سن رہا تھا جنگل جانے اور تفصیلات معلوم کر کے آنے کے لیے کہا چنانچہ پاسبان جنگل کی طرف گیا اور اس آواز کی تفصیلات معلوم کر کے واپس لوٹ کر اس کی اطلاع بادشاہ کو پہنچائی۔

سوال 5. حیدر بخش حیدری کے اسلوب کے تعلق سے لکھئے؟

جواب: حیدر بخش حیدری کا شمار فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے عربی اور فارسی کے سخت و دقیق الفاظ سے گریز کرتے ہوئے آسان اردو الفاظ، محاورے اور ضرب المثال کا استعمال اپنی تحریوں میں کثرت سے کیا ہے۔ ''طوطا کہانی'' دراصل فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران لکھی گئی داستان ہے یہ فارسی قصہ کا ترجمہ ہے۔ اسی لئے اس کی زبان آسان ہے۔

حیدر بخش حیدری کی زبان اور عبارت صاف، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ یہ کتاب آج سے تقریباً 200 سال پہلے لکھی گئی ہے مگر حیدری نے اس کتاب میں عام بول چال کا انداز اختیار کیا ہے۔ اسلوب سادہ، صاف اور رواں ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو اور ہندی کے الفاظ روزمرہ کی زبان میں بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے فارسی کی وہی ترکیبیں اور محاورے استعمال کئے ہیں جو اردو کے مزاج کے مطابق ہیں۔ مجموعی طور پر حیدر بخش حیدری کا اسلوب عام فہم، صاف و آسان ہے۔

III. مختصر ترین سوالات۔ 2 نشانات مقرر ہیں۔

سوال 1. تجسیم کسے کہتے ہیں؟

جواب: کسی جذبے یا نظر نہ آنے والی چیز کو مجسم بنا دینا تجسیم کہلاتا ہے یعنی جو چیز نظر نہیں آتی اس کو جسم میں ڈھال دینا تجسیم ہے مثلاً انسان کی عمر نظر نہیں آتی اس کو جسم دے دینا تجسیم ہے۔ سبق حق وفاداری، میں بادشاہ کی عمر کو عورت کے جسم میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی تجسیم ہے۔

سوال 2. سبق حق وفاداری کس داستان سے اخذ کی گئی اور مصنف کون ہے؟

جواب: سبق حق وفاداری، داستان طوطا کہانی سے اخذ کی گئی ہے جس کے مصنف حیدر بخش حیدری ہیں یہ داستان فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی ہے جس کی زبان صاف اور سلیس ہے۔

سوال 3. بادشاہ نے پاسبان کی دانائی پر کیا انعام دیا؟

جواب: بادشاہ نے جب پاسبان کی دانائی معلوم کیا تو اس نے ایک مجلس کا انتظام کیا جس میں سلطنت کے شہزادے امیر، وزیر تمام لوگ موجود تھے۔ ان تمام کی موجودگی میں بادشاہ نے پاسبان کو ولی عہد کے انعام کا اعلان کیا اور پاسبان کو تمام دولت سونپنے کا وعدہ کیا۔

سوال 4. ذیل کے جملوں کو آج کی اردو میں تحریر کیجئے؟

A. کھانے انہوں نے کھائے۔

B. شرابیں انہوں نے پیں

C. میں پاسبان اس دولت خانے کا ہوں

D. میں خدمت پاسبانی کی رکھتا ہوں۔

جواب: A. انہوں نے کھانے کھائے۔

B. انہوں نے شراب پی

C. میں اس دولت خانے کا پاسبان ہوں

D. میں پاسبانی کرتا ہوں۔

سوال 5. مندرجہ ذیل جملوں کو آج کی زبان میں کیسے لکھے گے؟

1. میں تصویر عمر بادشاہ طبرستان ہوں۔

2. وعدہ اس کا برابر ہوا ہے۔ اب اس واسطے جاتی ہوں۔

3. پھر اس کے پہنچنے سے پہلے دوڑ کر اپنے نہیں بدستور اس بارخانے پر پہنچا۔

4. بادشاہ نے یہ دانائی اور جانفشانی اس کی اور جرأت اس کے بیٹے کی دیکھی تھی۔

5. انشاءاللہ روز بروز بہبودی اور ترقی تیری ہوگی اور گھڑی بہ گھڑی سلوک برسلوک کروں گا۔

جواب:1. میں طبرستان کے بادشاہ عمر کی تصویر ہوں۔

2. اب اس کا وعدہ برابر ہوا ہے اس واسطے میں جاتی ہوں۔

3. بادشاہ نے دوڑ کر اس کے پہنچنے سے پہلے بدستور بالا خانے پر پہنچا۔

4. بادشاہ نے اس کی دانائی و جانفشانی اور اس کے لئے کی جرأت دیکھی تھی۔

5. انشاءاللہ روز بروز تیری ترقی و بہبودی ہوگی اور ہمیشہ تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔

IV.: دئے گئے جملوں میں خالی جگہ کو مناسب الفاظ پر مکمل کیجئے؟ ایک نشان مقرر ہے۔

1. فورٹ ولیم کالج.....شہر میں قائم کیا گیا تھا۔ (کلکتہ)

2. حیدر بخش حیدری کے والد کا نام.....تھا۔ (سید ابوالحسن)

3. حیدر بخش حیدری.....کالج میں ملازمت کی۔ (فورٹ ولیم کالج کلکتہ)

4. حق وفاداری.....داستان سے ماخوذ ہے۔ (طوطا کہانی)

5. داستان طوطا کہانی آج سے تقریباً.....سال پہلے لکھی گئی۔ (200 سال)

6. داستان طوطا کہانی کے مصنف.....ہیں۔ (حیدر بخش حیدری)

7. داستان میں اکثر.....باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (خیالی)

8. کسی جذبے یا خیال کو جسم میں ڈھالنے کو.....کہتے ہیں۔ (تجسیم)

9. بادشاہ کی عمر کی تصور (عورت) نے وعدہ کیا کہ وہ بادشاہ کے جسم میں آئندہ.....سال تک رہے گی۔
(60 سال)

10. تصویر عمر بادشاہ طبرستان.....کی قربانی چاہتی تھی۔ (پاسبان کے لڑکے کی)

03 : پوس کی رات

منشی پریم چند

I. تفصیلی جوابات۔8 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. افسانہ ''پوس کی رات'' خلاصہ لکھئے۔

جواب: افسانہ پوش کی رات منشی پریم چند کا لکھا ہوا ہے جس میں ایک کسان کی زندگی کا حال پیش کیا گیا۔ ایسا کسان جو ہر طرح کی راحتوں سے محروم ہے۔ اس کی پیداوار بھی اس کی نہیں ہے۔ اس کے فرض کا بوجھ ایسا قرض ہے جو اس کے سر سے اترتا ہی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سردی میں جکڑے واکڑے ہی رہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود اس کسان کو اپنی عزت کا خیال ہمیشہ رہتا ہے اور وہ دنیا کے سامنے ذلیل ہونے سے بچنے کے لئے اپنے آپ پر ظلم کرتا رہتا ہے۔

اس افسانے میں تین کردار اہم ہیں۔ ہلکو، منی اور ان کا کتا جبرا۔ ہلکو دیہات کا ایک مفروض کسان ہے۔ کھیت میں کاشت کاری کر کے وہ اپنے گھر کے لئے کم اور دوسرے زمینداروں کو زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔ منی ہلکو کی بیوی ہے جو ظالم زمینداروں کی مخالفت کرتی ہے مگر ہلکو کی عزت کے خیال سے وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ تیسرا کردار جبیرا کتے کا ہے جو اپنے مالک کا وفادار دوست ہے۔

افسانہ کے آغاز میں ہلکو اور منی کے درمیان بحث چلتی ہے۔ دونوں مل کر کئی دن کی محنت کے بعد ایک ایک روپے کر کے تین روپے جمع کئے ہوئے ہیں تا کہ آنے والے پوس کے موسم کی سردی سے حفاظت کے لئے ایک کمبل خریدی جائے۔ اچانک زمیندار شہنا ہلکو سے قرض وصول کرنے آتا ہے۔ منی جمع شدہ تین روپے دینے سے انکار کرتی ہے جس پر ہلکو غصہ میں آتا ہے اور کہتا ہے کہ پوس کے مہینہ کے لئے کوئی دوسری تدبیر سوچونگا پہلے جو مصیبت گردن پر آئی ہے اس کو جانے دو۔ ہلکو کو اپنی عزت کا بہت خیال ہے اگر وہ روپے نہیں دے گا تو شہنا اس کو گالیاں دے گا۔ جس سے اس کی بے عزتی ہوگی۔ ہلکو اپنی اپنے بیوی سے خوشامدانہ لہجہ میں بات کر کے تین روپے لے کر شہنا کو دے دیتا ہے۔ منی غصے میں آ کر کہتی ہے کہ اس کھیتی میں کام کرنے سے بہتر ہے کے کسی کیکھتی میں مزدوری کر کے زندگی گزار یجائے تا کہ پیٹ بھر کھانا ملے اور سکون بھی رہے۔ ہلکو

جس وقت زمیندار شہنا کو روپے دے رہا تھا تب اس کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ اپنا کلیجہ نکال کر دے رہا ہے۔

پوس کی سرد رات آ گئی تھی ہلکو اپنے کھیت کی حفاظت کے لئے ایک پرانی چادر لے کر کھیت پر آ گیا اس وقت سردی حد سے زیادہ ہو رہی تھی۔ آسمان پر ستارے تک کانپ رہے تھے۔ ہلکو رات کی ٹھنڈی میں وقت گزاری کرنے اپنے کتے جبرا سے گفتگو کرتا ہے اور اس کو نہ آنے کو کہتا ہے جب سرد ہوا کی لہریں زیادہ ہونے لگتی ہے تو اپنے ذہن کے سکون اور جسم میں گرمی کے لئے ہلکو چلم پیتا ہے۔ چلم پی کر آرام کرنے کی نیت سے وہ سوتا ہے مگر سردی کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ سخت جاڑا بھوت کی طرح اس پر سوار ہے۔ جب کسی طرح نہ رہا گیا تو وہ جبرا کو اپنی گود میں لے کر سو گیا۔ اس وقت ہلکو کو کتے کی بدبو تک محسوس نہیں ہوئی بلکہ اس کو گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ غربت کی وجہ سے ہلکو کی حالت ایک جانور کی طرح ہو گئی تھی۔ اسی وقت اچانک کھیت میں کسی جانور کی آواز آتی ہے جس پر جبرا ہلکو سے دور ہو کر کھیت پر جا کر شور مچاتا ہے ہلکو اس کو کئی مرتبہ بلاتا ہے مگر وہ نہیں آتا

ہلکو کو کھیت پر ایک گھنٹہ گزر گیا سردی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی اضافہ ہوتا گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم کا سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ وہ آگ لگا کر آلاؤ کے پاس بیٹھنے کی نیت سے اپنے کھیت سے دور ایک باغ سے پتوں کو جمع کیا اور الاؤ لگا کر سردی کو دور کرتے ہوئے گرمی حاصل کرنا شروع کیا۔ کتا بھی اس کے ساتھ تھا۔ الاؤ کے پاس ہلکو کو تھوڑی گرمی میسر ہوئی اور وہ اپنی شال کو بغل میں دبا کر تھوڑی دیر سکون سے رہا اور کتے سے چھوٹے بچوں کی طرح کھیلتے ہوئے کہا کہ جس طرح وہ الاؤ کے اوپر سے کود کر آ رہا ہے وہ بھی آئے کتا الاؤ کے اطراف سے ہو کر اس کے پاس آ گیا۔

کچھ دیر بعد الاؤ کی آگ ختم ہو گئی اسی طرح ہلکو کی گرمی بھی کم ہو گئی پھر دوبارہ سردی ہونے لگی۔ ہلکو الاؤ کے پاس بیٹھ کر گیت گنگناتا ہوا گرم راکھ کو کریدتا رہا۔ اسی وقت کھیت میں چند جانوروں کے چرنے کی آواز آئی۔ جبرا فوراً کھیت کی جانب دوڑا اور جانوروں کو بھونکتا رہا۔ مگر ہلکو سوچتا رہا کہ یہ ایک وہم و گمان ہے کیوں کہ ہلکو کا خیال تھا کہ اگر کوئی جانور کھیت پر آ جائے تو جبرا اس کو نوچ ڈالے گا۔ اس نے جبرا کو آواز دی مگر جبرا اس کے پاس نہیں آیا۔ اب ہلکو کو یقین آ گیا کہ کھیت پر نیل گائے فصل کو چر رہے ہیں مگر اس وقت سردی اور لاپرواہی کی وجہ سے ہلکو کو الاؤ کے پاس سے اٹھنا بہت مشکل ہو رہا تھا اس نے بس و بس سے ہا ہا ہو ہو کی آواز دی اور اٹھ کر جانا بھی چاہا تھا کہ اسی وقت ایک سرد لہر چلی جس پر وہ خاموش ہو گیا اور شال اوڑھ کر سو گیا رات بھر جبرا نیل گائیوں کا مقابلہ کرتا رہا مگر نیل گائے تمام فصل برباد کر کے گئیں۔

صبح ہوئی تو سورج کی کرنیں ہلکو پر پڑنے لگیں اسی وقت منی نے آ کر دیکھتی ہے کہ سارا کھیت برباد ہو گیا وہ غصہ میں آتی ہے اور ہلکو سے کہتی ہے کہ تم کہاں آ کر سو گئے۔ ادھر سارا کھیت برباد ہو گیا۔ رات بھر کیا سو رہے تھے؟ ہلکو اس وقت سخت پیٹ درد کا بہانا بناتا ہے منی غصہ سے کہتی ہے کہ اب مزدوری کر کے مال گزاری اور قرض دینا پڑے گا۔ ہلکو سے کہتی ہے شہنا سے کہہ دو کہ اس سال کھیت کا لگان نہ دیں گے کھیتی جینے کے لئے کیجاتی ہے مرنے کے لیے نہیں۔ ہلکو کہتا ہے کہ کہا تو مجھ کو گالیاں کھلائے گی زمینداروں کو ہمارے کھیت برباد ہونے سے مطلب نہیں ہے بلکہ ہان کو تو بس روپے چاہئے روپئے، کھیت میں آگ لگے یا جانور کھا جائے ان کو اس سے کچھ بھی مطلب نہیں ہے۔ منی کہتی ہے کہ ایسی کھیتی سے مزدوری اچھی ہے دو وقت کی روٹی ملتی ہے۔ مزدوری میں ہلکو کہتا ہے کہ منیس سچھ کہتا ہوں میرے دل میں بھی یہی خیال آتا ہے مگر میں ایک کسان کا بیٹا ہوں کھیتی چھوڑ کر مزدوری نہیں کر سکتا۔ بس اسی خیال سے جی گھبراتا ہے۔ اتنا کہہ ہلکو جبرا کو اٹھاتا ہے جو رات بھر نیل گائیوں کا مقابلہ کر کے سو رہا تھا اور یہ ارادہ کرتے ہوئے گھر کی جانب چلنے لگتا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے اور کیسی ہی مصیبت آ جائے وہ کھیتی ہی کرے گا۔ اس طرح افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

سوال 2. افسانہ پوس کی رات کا مرکزی خیال لکھئے؟

جواب: افسانہ پوس کی رات منشی پریم چند کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں ہندوستان کے اس عہد کے کسان کی غمگین داستان بیان کی گئی ہے۔ جب مہاجن اور زمینداروں کے ظلم کے تلے کسان دبا ہوا تھا۔ ایسا کسان جو غریب اور مفلس ہے وہ ہر طرح کی راحتوں سے محروم ہے۔ اس کی پیداوار بھی اس کی نہیں ہے۔ اس کی پیداوار سے اس کو فائدہ کم اور دوسرے زمینداروں کو فائدہ زیادہ ہے۔ ایسا کسان جو قرض کے تلے ایسا دبا ہے کہ اس کا سر اٹھ ہی نہیں سکتا۔

منشی پریم چند جنہوں نے اردو کہانیوں کو طلسم سے نکال کر حقیقت کا راستہ دیکھایا ہے۔ اس کہانی میں بھی انہوں نے ایک حقیقت کو پیش کیا ہے کہ دیہات کا کسان کس طرح غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔ غربت کی وجہ سے اس کی حالت ایک جانور سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ وہ کتے کے ساتھ رہتا ہے اس کو اپنے گود میں بیٹھا لیتا ہے۔ غربت اور رات کی سردی کی وجہ سے کتا ایک جانور نظر نہیں آتا بلکہ وہ کتے کو ایک دوست سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ رات بھر بات چیت کرتے ہوئے وقت گزارتا ہے۔

کہانی کا آغاز ہلکو اور منی کے بحث و مباحثہ سے ہوتا ہے۔ زمیندار شہنا قرض وصول کرنے آتا ہے ہلکو

اپنی بیوی منی سے تین روپے مانگتا ہے منی کہتی ہے کہ تین روپے اگر قرض کے دیئے جائیں تو ماگھ پوس کی رات کی سردی سے کیسے حفاظت کی جاسکتی ہے؟ ان روپیوں سے ایک کمبل خرید کر ماگھ پوس کی سردی سے بچ سکتے ہیں ہلکو دوسری تدبیر بتا کر روپے زمیندار شہنا کو دے دیتا ہے مگر روپے دیتے وقت اس کو روپیا نہیں بلکہ کلیجہ نکال کر دینے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔

ماگھ پوس کی رات آئی ہلکو شدید سردی میں بھی صرف ایک پرانی شال لے کر کھیت کی حفاظت کے لیے جاتا ہے۔اس کے ساتھ اس کا کتا جبرا بھی کھیت میں ساتھ رہتا ہے۔ہلکو وقت گزاری کے لئے جبرا سے باتیں کرتا ہے جب سردی زیادہ ہو جاتی ہے تو نیند نہیں آتی اور کتے کے گرم سانسوں سے متاثر ہو کر کتے کو اپنے گود میں لے لیتا ہے کچھ دیر گرم رہتا ہے اچانک کھیت میں آہٹ آنے پر کتا چلا جاتا ہے۔ہلکو سخت سردی سے نجات حاصل کرنے کے لئے قریب کے باغ میں جا کر الاؤ لگاتا ہے آگ سے گرمی حاصل کرتا ہے جب الاؤ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ہلکو کو پھر سردی ہونے لگتی ہے اسی وقت کھیت پر نیل گائیوں کا حملہ ہوتا ہے ہلکو اس حملہ کو وہم وگمان خیال کرتا ہے مگر جب کھیت میں گائے فصل چرنے کی آواز آتی ہے اور جبرا بھونکتا رہتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ کھیت برباد ہو رہا ہے وہ اٹھتا ہے تا کہ گائیوں کو ہانکے مگر سردی کی لہروں کی وجہ سے وہ الاؤ پر آ کر شال اوڑھ کر سو جاتا ہے۔فصل تمام برباد ہو جاتی ہے صبح منی تمام حال دیکھ کر ہلکو پر غصہ کرتی ہے تو ہلکو شدید پیٹ کے درد کا بہانا بناتا ہے۔منی غصہ میں کہتی ہے کہ اس سال لگان نہیں دیں گے ہلکو کہتا ہے کہ زمیندار کو اس سے کچھ بھی مطلب نہیں کہ کھیت میں آگ لگی یا جانور کھا گئے ان کو تو بس لگان چاہئے۔منی کہتے ہے کہ ایسی کھیتی سے تو مزدوری کی زندگی اچھی ہے جس پر ہلکو کہتا ہے کہ میرا بھی یہی خیال ہے مگر میں کسان کا بیٹا ہوں ایسا کرنے سے گھبراتا ہوں مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔آخر کار فصل برباد ہونے پر بھی ہلکو دوبارہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ مزدوری نہیں کرے گا بلکہ صرف اور صرف کھیتی ہی کرے گا۔

اس افسانے میں پریم چند نے کتے کو انسان کا دوست اور وفادار بتایا ہے۔کہانی میں کتا ہمیشہ ہلکو کا ساتھ دیتا ہے بلکہ وہ اکیلا ہی نیل گائیوں کا مقابلہ کرتا ہے صبح ہونے تک بھونک بھونک کر وہ بیہوشی کے عالم میں سو جاتا ہے۔

افسانہ میں پریم چند نے بہترین و برجستہ محاورے تشبیہات استعمال کئے ہیں۔جس سے افسانے میں ایک کشش پیدا ہوگئی ہے اس کے علاوہ افسانے میں صوت نقلی الفاظ، جزئیات نگاری، منظر نگاری کا بہترین

استعمال ہوا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ افسانہ ایک غریب دیہاتی کسان کی غمگین داستان ہے۔

II. مختصر جواب دیجئے۔ 4 نشان مقرر ہیں۔

سوال 1. پریم چند کے اسلوب پر روشنی ڈالئے؟

جواب: پریم چند کا اسلوب صاف وشستہ ہے۔ انہوں نے کہانیوں کو اس وقت اپنایا جب اردو میں داستان گوئی کا دور تھا۔ انہوں نے کہانیوں کو طلسمی، عیاری، قدیم داستانوں وقصوں کتھاؤں سے باہر نکال کر نئے انداز اسلوب کو تعین کیا۔ انہوں نے کہانی کا رشتہ ہمارے دیہات اور محنت کش طبقے سے جوڑ دیا یعنی کہانی رومان بھری فضاء سے نکل کر حقیقت سے قریب ہوگئی۔ انہوں نے اپنے طرزِ تحریر میں حقیقت کو شامل کیا جس سے ان کی نثر میں ایک سچائی اور تازگی پیدا ہوگئی۔

پریم چند کا اسلوب کہانی پر منحصر ہوتا ہے۔ کہانی میں جیسا کردار ہے اس کی زبان بھی اسی طرح کی استعمال کرتے ہیں اگر کوئی شخص دیہاتی کسان ہے تو اس کی زبان بھی دیہاتی ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی طالب کی زبان ہے تو وہاں طالب علم کی فکر اور اندازِ بیان کا خیال رکھا جائے گا۔ ان کی نثر آسان ہوتی ہے۔ ان کا ہر جملہ سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی تحریریں دل ودماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

پریم چند نے اپنے اسلوب میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی بہت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ موقع ومحل اور کردار کے مطابق اسلوب میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

سوال 2. پریم چند کے موضوعات کے تعلق سے لکھئے؟

جواب: پریم چند کا سب سے پسندیدہ موضوع دیہات اور وہاں کی زندگی، وہاں کے مسائل وغیرہ ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں راجپوتوں کی عزت و برتری پر بھی کہانیاں لکھی ہیں اس کے باوجود ان کا اصلی جوہر وطاقت دیہاتی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ پریم چند نے زندگی کے بے شمار چھوٹی بڑے سچائیوں کو خوشبوں اور غموں کو اپنی کہانی کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی خوبصورتی اور وہاں کے وام کی سادگی خلوص پریشان حالی، مفلسی اور بے بسی کی سچی اور بڑی واضح تصویریں پیش کی ہیں۔ پریم چند نے اپنے فلم کے ذریعہ ملک میں پھیلی خام خیالی، تنگ نظری، جہالت بیجا رسم ورواج کی پابندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ پریم چند نے جس طرح دیہاتوں کے مسائل وتکالیف کو پیش کیا ہے وہیں ان کی کمزوریوں، لاپرواہیوں اور مجبوریوں کو بھی اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ پریم چند ابتدأ سے کسان اور محنت کش طبقے کو ہی اپنا موضوع بنایا۔

سوال3. ذیل کے عبادتوں کا بحوالہ متن تشریح کیجئے؟

ہلکو اٹھا اور گڑھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا۔ پیئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔

دی گئی عبارت سبق پوس کی رات سے ماخوذ ہے جس کے افسانہ نگار منشی پریم چند ہیں۔

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ ہلکو پوس کی رات میں اپنے کھیت کی حفاظت کے لئے آیا ہے جس کے ساتھ اس کا کتا جبرا بھی ہے۔ ہلکو کے پاس سردی سے حفاظت کے لئے نہ ہی کمبل ہے اور نہ ہی کوئی لحاف بلکہ ایک پرانی چادر ہے جس کو اپنے جسم پر ڈال کر بھی ہلکو کانپ رہا ہے۔ وہ سردی کو کم کرنے کے لئے چلم کو سلگا کر پینا شروع کرتا ہے اور اپنی زبان سے خود کہتا ہے کہ چلم پینے سے سردی کم نہیں ہوگی مگر جسم میں تھوڑی بہت گرمی آجائے گی اور دل کو تھوڑی بہت تسلی مل جائے گی۔ کھیتوں میں زندگی گزارنے والوں کے لئے چائے اور چلم ہی دو ایسے ساتھی ہیں جس کے ذریعہ اپنا دل بہلانے میں اور وقت کو گزارتے رہتے ہیں۔

سوال4. ''پوس کی رات'' سبق میں کس معاشرے پر روشنی ڈالی؟

جواب: سبق پوس کی رات میں منشی پریم چند نے دیہات میں رہنے والے غریب، مجبور اور لگان کے نیچے دئے کسانوں کے معاشرے پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا کسان جس کو اپنے کھیت سے بے حد محبت ہے وہ مزدوری کو پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے کھیت پر کام کرنے ہی میں عزت محسوس کرتا ہے۔ مگر زمینداروں کے ظلم سے وہ مجبور ہے۔ وہ قرض حاصل کرتا ہے۔ مگر قرض کی ادائیگی میں اس کو کوئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کھیت میں فصل کی پیداوار کرتا ہے مگر اس کا فائدہ اس کو کم اور زمیندار کو زیادہ ہوتا ہے۔ فصل کی پیداوار کے درمیان اس کو کئی آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی سخت سردی میں کھیت کی حفاظت کرنا پڑتا ہے تو دوسری جانب رات کے وقت مختلف جانوروں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

منشی پریم چند نے اس افسانہ میں جہاں ایک کسان کی مصیبتوں کی نشاندہی کی ہے وہیں اس کی کاہلی سستی اور لاپرواہی کا بھی ذکر کیا ہے۔ دیہاتی کسان اپنے کھیت اور خاندان والوں سے بے حد محبت کرتا ہے مگر اس کی تکمیل میں اتنی محنت نہیں کرتا جتنی ضرورت ہے۔

دنیا کا اصول ہے کہ آدمی جس چیز کو چاہتا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے اس کو سخت محنت درکار ہوتی ہے اگر وہ لاپرواہی کرے گا تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتا۔ غرض کے پریم چند نے اس افسانہ میں

ہندوستان کے اس عہد و معاشرہ کے کسان کی زندگی کو پیش کیا ہے جو مہاجن اور زمیندار کے قرض کے تلے ہندوستانی کسان کی کھیتی ایک گھاٹے کا سودا بن گئی تھی۔

سوال 5. منی ہلکو پر کس وجہ سے غصہ میں آئی؟

جواب: منی ہلکو کی بیوی ہے وہ ہمیشہ ہلکو کی صحت کا خیال رکھتی ہے ہلکو اور منی دونوں مل کر کئی دن کے بعد تین روپے جمع کئے جس کے ذریعہ وہ ایک کمبل خریدنا چاہتے ہیں تا کہ ماگھ پوس کی رات کی سردی سے بچیں مگر جب مہاجن شہنا قرض کے روپے مانگنے آتا ہے تو ہلکو اپنی بیوی منی سے تین روپے مانگتا ہے جس پر منی ناراض ہوتی ہے اور غصہ سے کہتی ہے کہ ان روپیوں سے کمبل خریدنا ہے شہنا سے کہو کہ فصل کی پیداوار کے بعد آئیں۔ ہلکو اس بات کو نہیں مانتا کیوں کہ مہاجن کے غصہ اور گالیوں سے ہلکو کو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ آخر کار خوشامدانہ لہجہ میں ہلکو منی سے تین روپے لے کر شہنا کا قرض ادا کر دیتا ہے۔

افسانے کے اختتام پر جب تمام فضل کو نیل گائے برباد کر دیتی ہیں اور ہلکو آرام سے سوتا رہتا ہے تو تب صبح سویرے منی کھیت کے پاس آتیہے اور سارا ماجرا دیکھ کر ہلکو پر غصہ میں آتی ہے کہتی ہے کہ تم کہاں آ کر مر گئے۔ ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ تمام کھیت پر باد ہو گیا۔ آگے ہلکو سے غصہ کے انداز میں کہتی ہے کہ اس سال زمیندار کو لگان نہ دونگی کیوں کہ کھیتی کا کام جینے کے لئے کرتے ہیں مرنے کے لئے نہیں۔ اس طرح افسانے میں منی ہلکو پر غصہ کرتی ہے۔

III. دو یا تین سطور میں جواب دیجئے۔ 2 نشانات مقرر ہیں۔

سوال 1. پریم چند کے چند کہانیوں کے مجموعے کا نام لکھئے؟

جواب: سوزِ وطن، پریم دلچسپی، آخری تحفہ، دودھ کی قیمت، کفن، پریم بتیسی

سوال 2. پریم چند نے ملازمت سے کیوں استعفیٰ دے دیا؟

جواب: پریم چند نے گاندھی جی کی عدم لغان تحریک سے متاثر ہو کر سماجی خدمت کے لیے سرکاری ملازمت کو استعفیٰ دے دیا۔ وہ اسکولی مدرس سے ملازمت شروع کر کے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے عہدے تک ترقی کئے۔ گاندھی جی کی سماجی اصلاحی نظریات سے متاثر ہو کر انہوں نے ملازمت ترک کر دی اور اپنے قلم سے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

سوال3. ہلکو کے کھیت میں رات کے وقت نیل گائیوں کا مقابلہ کس نے کیا؟

جواب: ہلکو کے کھیت میں رات کے وقت نیل گائیوں کا مقابلہ ہلکو کے کتے جبرا نے کیا جبکہ ہلکو آگ کے آلاوے کے پاس شدید سردی سے متاثر ہوکر آرام کررہا تھا۔ جبرا اکیلا اپنا گلا پھاڑ کر نیل گائیوں کا مقابلہ کرتا رہا مگر نیل گائیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے وہ مقابلہ نہ کرسکا۔ اور ہلکو کا کھیت برباد ہوگیا۔

سوال4. ہلکو فصل برباد ہونے پر بھی کیوں خوش تھا؟

جواب: ہلکو ایک دیہاتی کسان ہے جس کو اپنے کھیت سے محبت ہے مگر وہ لاپرواہی کا شکار ہے وہ شدید سردی کی رات میں فصل کی حفاظت کے لئے کھیت کو جاتا ہے مگر وہاں کھیت کی حفاظت کرنے کے بجائے آگ لگا کر آلاوے کے پاس آرام کرتا ہے جب فصل برباد ہوجاتی ہے اور صبح منی آکر غصہ میں آتی ہے تو ہلکو خوشی سے کہتا ہے کہ رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہیں پڑے گا۔ ہلکو فصل سے زیادہ آرام کو پسند کرتا ہے۔

سوال5. اس کہانی کا نام ''پوس کی رات'' کیو رکھا گیا ہے؟

جواب: پوس شدید سردی کا مہینہ ہے جو انگریزی مہینے کے حساب سے ڈسمبر اور جنوری کا ہوتا ہے۔ اس کہانی کا جو مرکزی خیال ہے وہ فصل کی بربادی اور ہلکو کی لاپرواہی ہے جس کو پوس کی رات ہی کے منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں ایک کسان اپنے کھیت کی حفاظت کے لیے سردی کے راتوں میں جو مصیبتیں اور مشکلیں اٹھاتا ہے اس کو بہترین انداز سے پیش کیا گیا ہے اسی لئے اس کہانی کا نام پوس کی رات رکھا گیا ہے۔

IV. خالی جگہوں کو موزوں الفاظ سے پر کیجئے۔ ایک نشان مقرر ہے۔

1. منشی پریم چند کی پیدائش.....گاؤں میں ہوئی۔ (لمہی)
2. منشی پریم چند کا اصل نام.....تھا۔ (دھنپت رائے)
3. پریم چند کے والد کا نام.....تھا۔ (منشی عجائب لال)
4. پریم چند.....پیشہ سے منسلک تھے۔ (استاد/ٹیچر)
5. پریم چند کی سب سے پہلی کہانی.....تھی۔ (سنسار کا سب سے انمول رتن)
6. ہلکو کے کتے کا نام.....تھا۔ (جبرا)
7. پریم چند نے اپنے افسانوں کا آغاز.....رسالہ سے کیا۔ (زمانہ)

04 : چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

I. 8 نشانات کے جوابات۔

1. عصمت چغتائی کے حالات زندگی پر مختصر مضمون لکھو؟

جواب: عصمت چغتائی آگرہ میں 1915ء میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد روزگار کے سلسلہ میں جئے پور میں مقیم تھے لہٰذا ان کی ابتدائی تعلیم جئے پور میں ہی ہوئی۔عصمت چغتائی کا بچپن جئے پور میں ہی گذرا بعد ازاں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کیلئے علی گڑھ کا رخ کیا۔علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویشن اور پھر بی ایڈ کی تکمیل کی۔انہوں نے تعلیم کے اختتام پر اسکولس میں ملازمت اختیار کی۔آگرہ اور علی گڑھ میں چند اسکولوں میں ملازمت کے بعد وہ ممبئی چلی گئیں جہاں وہ انسپکٹرس آف اسکولس کی ملازمت کی اور پھر بعد میں وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئیں اور یہ رشتہ ان کے آخر وقت تک قائم رہا۔

عصمت چغتائی ایک بیباک اور نڈر خاتون تھیں انہوں نے کبھی بھی خواتین کے مسائل پر خاص کر جنسی مسائل پر خاموشی اختیار نہیں کی ان کی ادبی نگارشات میں بھی ان کی یہی بیبا کی جھلکتی ہے۔عصمت چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز علی گڑھ سے ہی ہوا اور وہ ترقی پسند تحریک سے کافی دلچسپی رکھتی تھیں اور اس کا اثر ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانواں میں متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں کے مسائل خصوصاً نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جنسی مسائل پر بے لاگ تبصرے کیے جس کے باعث انہیں کافی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔عصمت چغتائی اردو ادب کی شائد پہلی مصنفہ ہیں جن کے افسانے عوامی بحث کا موضوع بنے اور اس کے لیے انہیں مقدمہ بازیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ان کے بے باکی اور عورتوں کے مسائل پر بھلا جھجک تبصروں کے باعث وہ خاص کر قدامت پرست مسلمان گھرانوں میں بری مانی جاتی تھیں۔جنسی مسائل پر ان کے افسانوں نے انہیں بدنامی سے بھی نوازا لیکن وہ اپنی کوششوں سے کبھی باز نہیں آئیں۔ان کا ماننا تھا کہ یہ سماج کے سلگتے ہوئے مسائل ہیں جس سے ہر عورت گزرتی ہے لیکن شرم وحیاء کے باعث وہ اس پر لب کشائی نہیں

کر پاتی۔عصمت چغتائی ان متوسط خواتین کی زبان بننا چاہتی تھیں اور ان کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔آخر کار ان کی ادبی خدمات کو پذیرائی ملی اور وہ صف اول کیا فسانہ نگار تسلیم کر لی گئیں۔ان کی تحریر میں کنایے زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں۔وہ سماج کے فرد اور رشتوں پر کناہے کی زبان میں طنز کیا کرتی تھیں۔

2. عصمت چغتائی کے اسلوب بیان کی خصوصیات بیان کرو؟

جواب:عصمت چغتائی اردو ادب کی صف اول کی افسانہ نگار تھیں۔ان کی تحریروں میں کناہے کی زبان کا بدرجہ اتم استعمال کیا گیا ہے۔وہ سماج کے سلگتے ہوئے مسائل پر بڑے بے لاگ اور بے جھجھک تبصرے کرتیں۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں متوسط طبقہ کے خواتین کے احساسات اور ان کے ادھوری خواہشوں کا اجاگر کیا گیا جس کے ذریعہ وہ خواتین کی تکالیف اور انہیں درپیش مسائل کو پیش کرنا چاہتی تھیں۔

عصمت چغتائی کے اسلوب میں روانی کے ساتھ ساتھ محاوروں اور روزمرہ کا استعمال بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔وہ ترقی پسند تحریک سے کافی رغبت رکھتی تھیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ادبی سرمایہ ترقی پسند تحریک کا آئینہ دار ہے تو شائد غلط نہ ہوگا۔

عصمت چغتائی نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جنسی ونفسیاتی مسائل پر اپنے افسانوں میں سیر حاصل گفتگو کی جس سے ان کی بے باک ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔لیکن وہ اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ وہ تو انسانی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو منظر عام پر لانا چاہتی ہیں تاکہ سماج کے ٹھیکہ داروں کے خوف سے خاموش رہنے والی زبانوں کو گویائی ملے۔

عصمت چغتائی کے افسانے عوام کے درمیان موضوع گفتگو رہے اور شائد ایسا کسی اردو مصنفہ کے افسانوں کے ساتھ پہلی مرتبہ ہوا ہے۔اس بات نے جہاں ان کے لیے چند پریشانیاں پیدا کیں وہیں انہیں صف اول کی افسانہ نگار بنانے میں بھی مدد کی۔

عصمت چغتائی کے کئی ایک مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان کے اسلوب بیان کو کافی سراہا گیا۔ان کی ادبی خدمات پر انہیں غالب اکیڈیمی کی جانب سے انعام بھی دیا گیا۔عصمت چغتائی سماجی شعور کو اجاگر کرنا چاہتی تھیں۔وہ دبے ہوئے کچلے ہوئے جذبات کی زبان بننا چاہتی تھیں اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی رہیں۔ان کا اسلوب بیان قاری پر ایک عصر طاری کر دیتا ہے اور وہ متواتر اس ادبی شہ پارہ کو پڑھتا ہی جاتا ہے جو کہ ایک کامیاب مصنف کی نشانی ہے۔عام فہم زبان،سادگی اور ساتھ میں حسب ضرورت محاوروں کا

استعمال ان کی تحریروں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

کلیاں، چوئیں اور چھوٹی موئی ان کے مجموعے کلام ہیں جبکہ ان کے بعض مشہور ناولوں میں ضدی، تیڑی کھیر، یکسر اور معصومہ شامل ہیں۔

II. 4 نشانات کے جوابات:

1. اماں بھی کے کردار کا جائزہ لیجئے؟

جواب: اماں بی ایک جہاندیدہ، نہایت ہی سمجھدار اور رعب دبدبہ والی خاتون ہیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں ان کا بڑا احترام کرتی ہیں اور ان کے تجربہ سے استفادہ کرتی ہیں۔ ہر تقریب چاہے وہ خوشی کی ہو کہ غم کی اماں بی کے بغیر ادھوری ہے۔ انہیں سلائی بنائی کا بھی کافی تجربہ ہے۔ محلّہ کی عورتیں اپنے کپڑوں کی کٹائی انہیں سے کرواتی ہیں اور اگر کسی کے پاس کپڑا کم ہو تب تو وہ ضرور بہ ضرور اماں بی کے پاس ہی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے تجربہ اور صلاحیت سے اس کم کپڑے میں بھی کرتا بنا ہی ڈالتی تھیں جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ انہیں محلّہ میں ایک سردار کی حیثیت حاصل تھی۔ ہر موقع پر محلّہ کی عورتیں صلاح مشورہ کیلئے ان ہی کے پاس جاتیں اور کبھی کسی کو نامراد لوٹنا نہیں پڑا۔

2. متن کے حوالے سے تشریح کرو ''بہن میری مری کا منہ دیکھ جو اس گھڑی نہ آؤ''

جواب: یہ عبارت عصمت چغتائی کے افسانے ''چوتھی کا جوڑا'' سے لی گئی ہے۔ اس افسانہ میں عصمت چغتائی نے عورتوں کی نفسیات پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور وہ اس میں محارت رکھتی ہیں۔ مذکورہ جملہ افسانہ کی ایک کردار ''سروری'' نے اپنی منہ بولی بہن کو کہلا بھیجا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کا بھانجا پولیس ٹریننگ کیلئے ان کے یہاں رہنے آرہا ہے اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنی بیٹوں کی شادی کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ اپنی بہن پر زور ڈالنے کے لئے کہ اپنے بیٹے کو ان کے ہی گھر بھیجا جائے مذکورہ جملہ کہلوایا۔ دراصل یہ عورتوں کا خاص انداز ہوتا ہے جو اپنی بات منوانے کے لئے وہ استعمال کرتی ہیں۔ اس کے معنی ہے کہ اگر تم نہیں آئیں تو مجھ سے تعلقات ختم کرلینا اور مرنے کے بعد بھی میری صورت دیکھنے مت آنا''۔

3. چوتھی کے جوڑے میں کس موضوع کو اجاگر کیا گیا؟

جواب: افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' میں عصمت چغتائی نے ایک عام معاشرتی پہلو غریب لڑکیوں کی شادی کو موضوع بناتے ہوئے ایک غریب لڑکی کی مسال کے نفسیات کو اجاگر کیا۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ

ایک غریب لڑکی کی ماں کس طرح اپنی بیٹی کی شادی کیلئے فکرمند رہتی ہے اور وہ خوابوں ہی خوابوں میں کتنے فاصلے طے کر لیتی ہے۔ افسانہ میں سروری جو کہ ایک غریب خاتون ہے اور دو لڑکیوں کی ماں بھی کے ذریعہ عصمت چغتائی نے سماج کے اہم ترین پہلو کو اجاگر کیا اور یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی کہ ایک غریب لڑکی کی شادی اس کے والدین کے لئے کتنا بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔

III.2 نشانات کے جوابات:

1. کبریٰ کیلئے رشتہ نہ آنے کی وجہ بیان کرو؟

جواب: کبریٰ کا خاندان غربت زدہ تھا اور یہی غربت اس کے رشتوں کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

2. سروری کو کیا ارمان تھا؟

جواب: سروری کو اپنی بیٹی کی شادی کا ارمان تھا۔

3. عصمت چغتائی کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

جواب: عصمت چغتائی 1915ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں۔

4. سروری، کبریٰ اور حمیدہ راحت کی خاطر داری میں کیوں مصروف تھے؟

جواب: وہ راحت کی خاطر داری کے ذریعہ اسے کبریٰ سے شادی کے لئے راضی کرنا چاہتے تھے۔

IV. جواب ایک لفظ میں دیجئے نشانات 1:

1. ''طول پکڑنا'' کا مطلب کیا ہے؟ (بڑھ جانا)

2. افسانہ چوتھی کا جوڑا میں عورتوں کی زبان کے استعمال کردہ دو خاص الفاظ لکھو؟ (چھٹی چھوچھک، لیا چھپ)

3. چھٹی کسے کہتے ہیں؟ (بچہ کی پیدائش کے چھٹویں دن منائی جانے والی خاص تقریب کو چھٹی کہتے ہیں)

4. غیر مستقل مزاجی کیلئے استعمال ہونے والا محاورہ ہے؟ (تھالی کے بیگن)

5. پیر میں پہننے کا زیور کیا کہلاتا ہے؟ (انگشتانہ)

05 : بھولا

راجندر سنگھ بیدی

8.I نشانات کے جوابات:

1. راجندر سنگھ بیدی کا مختصر تعارف بیان کرو؟

جواب: راجندر سنگھ بیدی اردو ادب کے صف اول کے افسانہ نگار ہیں۔ اردو کیلئے ان کی ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ بیدی سیال کوٹ میں 1915ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیال کوٹ میں ہی پوری کی۔ بعد میں وہ لاہور منتقل ہوگئے۔ لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا بعد ازاں ڈی اے وی کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔

راجندر سنگھ بیدی کو بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے کا شوق تھا اور وہ زمانہ طالب علمی سے ہی انگریزی، اردو اور پنجابی میں کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد 1948 میں راجندر سنگھ بیدری کو جموں ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا جہاں انہوں نے چند دن کام کیا لیکن وہ کام ان کی طبعیت سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ انہیں تو کہانیاں لکھنے کا شوق تھا اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے وہ جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر کی نوکری کو چھوڑ کر ممبئی منتقل ہوگئے جہاں انہوں نے فلمی صنعت سے وابستہ ہوکر فلموں کے لئے کہانیاں لکھنی شروع کیں کیونکہ یہ کام ان کے ذوق کے مطابق تھا لہٰذا وہ طویل عرصہ تک اسی سے جڑے رہے۔ راجندر سنگھ بیدی کو کردار نگاری اور انسانی نفسیات کی مرقع کشی میں کمال حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کے 6 مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈراموں کے مجموعہ بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی تصنیف ''ایک چادر میلی سی'' کو کافی شہرت ملی۔ انہیں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی کو حکومت ہند نے پدم شری کا اعزاز بھی عطاء کیا۔

2. افسانہ بھولا کا خلاص اپنے الفاظ میں لکھو؟

جواب: افسانہ بھولا ایک معصوم بچے کی کہانی ہے جس کے ذریعہ مصنف نے ایک چھوٹے بچے کی نفسیات اور اس کی ذہنی اپج کو اجاگر کیا ہے۔ بھولا اپنی بیوہ ماں مایا کے ساتھ اپنے دادا کے گھر میں رہتا ہے اور اس کے دادا

ہی اس کے لیے باپ ہیں۔ دادا بھی اپنے پوتے اور بیوہ بہو سے بہت پیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی بہو کا سفید لباس ہمیشہ کھلتا ہے وہ اسے بھی دوسری عورتوں کی طرح رنگ برنگے کپڑوں میں خوش دیکھنا چاہتے ہیں لیکن سماج کے ڈر سے مایا اپنے سسر کی خواہش پوری نہیں کر پاتی۔ بھولا، ماں اور دادا کا لاڈلا ہے۔ وہ ہمیشہ کہانیاں سننے کا بڑا شوقین ہے۔ اپنے دادا اور اپنی ماں سے ہمیشہ کہانی سنانے کی ضد کرتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ دوپہر کے وقت اپنے دادا کو کہانی سنانے کے لئے تنگ کرتا ہے جبکہ بوڑھا دادا تھکا ہارا ہوتا ہے اور کہانی سنانے سے بچنے کے لئے وہ بھولا سے کہتا ہے کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھٹک جاتے ہیں لیکن پھر اپنے پوتے کی ضد کے آگے وہ اسے کہانی سنا ہی دیتا ہے۔ لیکن کہانی کے ختم پر یہ کہتا ہے کہ اگر اب کوئی مسافر راستہ بھول جائے تو اس کا ذمہ دار بھولا ہی ہوگا۔

بوڑھے دادا نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن یہ بات معصوم بھولا کے ذہن میں گھر کر جاتی ہے اور وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ اسے یہ خود دامن گیر ہو جاتا ہے کہ کہیں کوئی مسافر اس کی وجہ سے راستہ نہ بھول جائے۔ اسی دن اتفاق سے بھولا کے ماموں کو اس کے گھر آنا ہے کیونکہ وہ اپنی بہن سے راکھی بندھوانے ہر سال آتے ہیں۔ اس دن بھی کیونکہ راکھی کا تہوار تھا اور دو دن سے ہی گھر میں ماموں کے آنے کی تیاریاں جاری تھیں۔ دن گزر جاتا ہے پر ماموں نہیں آئے۔

بھولا کی ماں اور دادا یہ سوچ کر کہ شائد وہ کسی کام میں پھنس گئے ہوں گے اور نہیں آپائے ہیں، خاموش ہو جاتے ہیں لیکن بھولا کو دادا کی وہ بات کھٹکتی ہے کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنے ماموں کے نہ آنے کو راستہ بھٹک جانا سمجھتے ہوئے خود کو اس کے لئے ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اسے نیند نہیں آتی اور آخر کار وہ ایک دیا ہاتھ میں لے کر کسی کو بتائے بغیر ماموں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ کچھ دیر بعد ماں کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ بھولا کو غائب پا کر پریشان ہو جاتی ہے اور دادا کو آواز دیتی ہے۔ ماں اور دادا بھولے کے غائب ہو جانے پر رونے پیٹنے لگتے ہیں۔ اتنے میں بھولا اپنے ماموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کیونکہ دن میں کہانی سنا تھا اس لیے ماموں راستہ بھٹک گئے اور وہ انہیں تلاش کرنے گیا تھا۔ اس کہانی کے ذریعہ بیدی نے ایک معصوم بچے کی نفسیات کو اجاگر کیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ چھوٹے بچوں سے غلط بیانی نہیں کرنی چاہئے۔

4.II نشانات کے سوالات:

1. متن کے حوالے سے تشریح کرو؟ ''شام میں اگر میں راستہ بھول گیا تو ذمہ دار تم ہو گئے''

جواب: یہ عبارت افسانہ ''بھولا'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ بیدی اردو ادب کے مصروف افسانہ نگار ہیں۔ان کا شمار صف اول کے ادباء میں ہوتا ہے۔

افسانہ بھولا میں راجندر سنگھ بیدی نے ایک معصوم بچے کی ذہنی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔ بھولا اپنے دادا جی سے کہانی سنانے کی ضد کرتا ہے اور وہ اسے ٹالنے کے لئے کہتے ہیں کہ دوپہر میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔لیکن بھولا جد کرتا ہے اور آخر کار دادا جی اسے کہانی سناتے ہیں۔کہانی کے اختتام پر دادا جی بھولا سے کہتے ہیں کہ اگر اب میں شام میں راستہ بھول گیا تو اس کیلئے تم ذمہ دار ہو گے کیونکہ تم نے ضد کر کے دن میں کہانی سنی ہے۔

2. آدھی رات کو بھولا کہاں گیا تھا اور کیوں؟

جواب: بھولا آدھی رات کو اپنے ماموں کی تلاش میں گیا تھا۔ کیوں کہ اس نے دن میں ضد کر کے اپنے دادا جی سے کہانی سنی تھی اور دادا جی نے کہانی سنانے کے بعد کہا تھا کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اگر اب کوئی مسافر راستہ بھول جائے تب اس کے لیے تم ذمہ دار ہو گے۔ بھولا کے ماموں اس رات آنے والے تھے لیکن کافی دیر تک بھی نہیں آئے۔ جس پر بھولا یہ سمجھا کہ اس کے کہانی سننے سے اس کے ماموں راستہ بھول گئے ہیں لہٰذا وہ انہیں تلاش کرنے آدھی رات کو چراغ لیکر نکل پڑا۔

3. راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب پر مختصر نوٹ لکھو؟

جواب: کسی بھی کہانی کی کامیابی کا انحصار اس کے اسلوب پر ہوتا ہے اور راجندر سنگھ بیوی کو کہانیوں اور افسانوں میں ملکہ حاصل تھا اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اسلوب نہایت پر اثر اور دلوں کو چھو لینے والا تھا۔ سادہ اور روزمرہ کی زبان کا استعمال راجندر سنگھ بیدی کا خاصہ تھی۔ اس لیے ان کے افسانے اور کہانیاں دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ ان کے اس افسانہ بھولا میں بھی ان کا یہی اسلوب جھلکتا ہے۔ بھولا کے غائب ہو جانے پر ماں اور دادا جی کی جو کیفیت بیان کی گئی وہ حقیقت سے بالکل قریب محسوس ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سادہ زبان کے استعمال نے اسے اور بھی منفرد بنا دیا جس سے پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

4. ضعیف الاعتقادی پر اپنے خیالات قلمبند کرو؟

جواب: ایسی باتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ضعیف الاعتقادی کہلاتی ہیں۔ یہ دراصل ان کے ایمان اور یقین کی کمزوری ہے۔ اکثر لوگ اس کا شکار رہتے ہیں۔آج بھی دیہی علاقوں میں یہ وبا عام ہے۔ لوگ بلی کے راستہ کاٹنے کو برا شگون سمجھتے ہیں۔کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے چھینک آجائے تو بھی برا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سب ضعیف الاعتقادی کی مثالیں ہیں حالانکہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دراصل تعلیم اور شعور کی کمی کے باعث انسان ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوجاتا ہے۔اوراس کے دل میں وہم گھر کرجاتے ہیں۔ایک تعلیم یافتہ فرد کواس سے بچنا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اطراف واکناف کے لوگوں کو بھی ایسے غلط عقائد سے بچانا چاہئے تبھی ایک مہذب اور باشعور معاشرہ کی تعمیر ممکن ہے۔

III.2 نشانات کے جوابات:

1. افسانہ کیلئے کن بنیادیباتوں کا خیال رکھا جائے؟

جواب: افسانہ کیلئے سب سے اہم بنیادی ضروریات پلاٹ ہے جس پر کہ پورے افسانہ کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسری چیز جوافسانہ کیلئے ضروری ہے وہ کردار ہیں۔کرداروں کے انتخاب میں ان کوعمر اوران کی پلاٹ سے مطابقت پر بھی دھیان دینا ضروری ہے۔کامیاب افسانہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زبان سادہ،آسان اور روزمرہ کی ہو۔تسلسل اورتواتر بھی ضروری ہے۔

2. داداجی کے جوتوں سےان کے پیر میں کیوں تکلیف ہورہی تھی؟

جواب: داداجی کے جوتے چھوٹے ہوگئے تھےاور وہ ان کی ایڑی پر دباؤ ڈال رہے تھےجس سے ان کے پیر میں تکلیف ہورہی تھی اوروہ لنگڑا کرچل رہے تھے۔.

3. راجندرسنگھ بیوی کے چند مجموعوں کے نام لکھو؟

جواب: ان کے افسانوں 6 مجموعے شائع ہوچکے ہیں جس میں دانہ ودام،گرہن،کوکھ جلی،اپنے دکھ مجھے دے دو،ہاتھ ہمارے قلم ہوئے اور مملکتی بودھ شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے ڈراموں کے دومجموعے بھی ہیں جوبے جان چیزیں اورسات کھیل ہیں۔

4. ماموں نے گھرآکر کیا کہانی سنائی؟

جواب: ماموں نے گھرآکر بتایا کہ میں کسی کام کی وجہ وقت پر نکل نہیں سکا اوررات زیادہ ہوگئی۔اندھیرے میں راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ مجھے دورایک روشنی نظر آئی قریب جاکر دیکھا تو وہ بھولا تھا جو ہاتھ میں شمع لیے

جھاڑیوں میں الجھا کھڑا تھا میں اسے اٹھالیا اور یہاں چلا آیا۔

IV. جواب ایک لفظ میں دیجئے۔نشانات 1۔

1. بھولا کے گھر سے غائب ہوجانے پر مایا کا کیا حال تھا؟ (گم سم ہوگئی تھی)

2. بال بیکا نہ کرنا کے معنی لکھو؟ (کوئی نقصان نہ ہونا)

3. مثال دینے کے لئے ایک چیز کو کسی دوسری جیسا بتانا کیا کہلاتا ہے؟ (تشبیہ)

4. باباجی نے چراغ گل کرنے کیلئے کیوں کہاں؟ (چوروں کے ڈر سے)

5. کہانی سننے کے بعد بھولا خوش کیوں نہیں ہوا؟ (بھولا کے دل میں ماموں کے راستہ بھول جانے کا خوف تھا)

06 : ڈرامہ ''دروازے کھول دو''

کرشن چندر

I. طویل جوابات لکھئے جو 20 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔

1. ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کا مرکزی خیال بیان کیجئے؟

جواب: کرشن چندر اردو کے مشہور افسانہ نگار گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک ہی ڈراما ''دروازے کھول دو'' لکھا ہے۔ جو بہت مشہور ہوا۔ ڈراما ''دروازے کھول دو'' لکھا ہے۔ جو بہت مشہور ہوا۔ ڈراما دروازے کھول دو کے آخری حصہ کے ذریعہ ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے زہر، مذہبی تعصب پر گہری چوٹ لگائی ہے۔

ہندوستان ایک کئی مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ یہاں پر مختلف رسم و رواج اور رہن سہن ملتے ہیں۔ ہمارے ملک میں کثرت میں وحدت کا تصور ملتا ہے۔ لیکن مذہبی اختلافات کو اگر نفرت کا ذریعہ بنالیا جائے تو ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی ہے۔ تعصب و تنگ نظری ملک کی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ اس لیے ملک میں قومی یکجہتی، بھائی چارگی اور مذہبی رواداری کی سخت ضرورت ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ جب دل کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں تو مذہبی جنون کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ اس کے بجائے جب کوئی آدمی اپنے دل کے دروازے کھلے رکھتا ہے تو کسی کو دکھ نہیں دیتا، کسی کو تکلیف نہیں دیتا، کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ وہ سب کا سکھ سب کی بھلائی چاہتا ہے۔

رام دیال جو مذہبی تعصب کا شکار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے فلیٹ میں کسی مسلمان یا عیسائی کی جگہ دینے سے اس کا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ جبکہ کوئی مذہب بھی انسانوں کے درمیان تفریق کی تعلیم نہیں دیتا۔ آخر میں رام دیال کو اچانک دل کا دورہ پڑ جاتا ہے اور عیسائی ڈاکٹر اس کا فوری علاج کرتا ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ یہ ملک تمام مذاہب کے ماننے والوں کا ہے۔ مذہبی تعصب انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔ اس کا دل یکجہتی، پیار اور اخوت کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔

مصنف نے اس ڈرامہ میں بلڈنگ کو ایک نمونہ بنا کر ہندوستانیوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ جب تک ہمارے ہندوستانیوں میں اتحاد، میل جول، اخوت و محبت اور ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ

نہیں ہوگا اس وقت تک ہم ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔

اگر عوام میں آپس میں ایک دوسرے کے مذہب کے لیے رواداری اور عزت کا جذبہ نہیں ہوگا تو یہ ملک ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اسی لیے ہم کو آپسی رنجشوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے اور ہمیشہ اپنے دل کے دروازے کو کھولے رکھنا چاہئیں تا کہ فرد کی ترقی کے ساتھ ملک کی ترقی بھی ممکن ہو سکے۔

2. ڈرامہ کے آخر میں پنڈت رام دیال نے قومی یکجہتی پر جو تقریر کی لکھئے۔

جواب: کرشن چندر اردو کے مشہور افسانہ نگار گزرے ہیں۔ انہوں نے ڈرامہ دروازے کھول دو کے آخری حصہ میں ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے زہر، مذہبی تعصب اور نفرت پر گہری چوٹ لگائی ہے۔

اس ڈرامہ کا اہم کردار رام دیال ہے جو کئی فلیٹس کا مالک ہے لیکن وہ مذہبی تعصب اور نفرت کا شکار تھا۔ دوسرے مذہب والوں کو جگہ دینے سے اسکا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔

رام دیال کو دل کا دورہ پڑنے کے بعد جب ہوش آتا ہے تب وہ اپنے آپ میں تبدیلی کو محسوس کرتا ہے کہ مذہبی نفرت، انسان اور ملک کی ترقی کے لیے خطرہ ہے بلکہ سارے انسانوں میں اتحاد، پیار، اخوت اور بھائی چارگی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔

رام دیا لنے ہوش میں آنے کے بعد نصیحت آمیز اظہار خیا لکرتا ہے کہ وہ مرا نہیں بلکہ ایک لمبے سفر پر گیا تھا اور راستے میں اسے اس کی اپنی بلڈنگ کی آتما ملی۔ جیسے ہر انسان، ہر قوم اور ہر دیش کی ایک آتما ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر بلڈنگ کی بھی ایک آتما ہوتی ہے اور یہ آتما مجھے راستے میں ملی۔ میں نے اس سے کہا آؤ مل کے چلیں۔ ہمارا تمہارا راستہ ایک ہے۔ وہ بولی مذہبی تعصب و نفرت کے راستے پر چل کر کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ راستہ پرانا ہو گیا ہے اب یہ راستہ ملک اور انسانیت کے لیے خطرہ ہے۔

میں نے فوری پوچھا کہ آگے بڑھنے کی ترکیب کیا ہے؟ وہ بولی آگے وہی لوگ جاتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں جو اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ جس کے دل میں پیار، محبت، اخوت، قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے جذبات بھرے ہوتے ہیں۔

رام دیال نے اپنی بلڈنگ کی چابیاں اپنے بیٹے کمل کانت کے حوالہ کر دیتا اور کہتا ہے کہ ''میرے گھر کے سارے دروازے کھول دو'' اور میں نے جن جن لوگوں کو فلیٹ کرایہ پر دینے سے انکار کیا تھا ان تمام بیٹوں

کو بلالو۔جس کسی نے اس کے صحت میں کھڑے ہوکر انسان اور اس کی امید اور اس کی حسرت، دکھ، مسرت مستقبل سے پیار کیا ہے یہ گھر اسی کا ہے۔

آخر وہ سب کو جمع کرتے ہوئے قومی یکجہتی، بھائی چارگی، اخوت اور پیار و محبت کا پیغام دیتا ہے۔

II. مختصر جوابات تحریر کیجئے۔ جواب 10 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے 4 نشانات مقرر ہیں۔

1. کرشن چندر کے حالات زندگی کے بارے میں لکھئے؟

جواب: کرشن چندر کا شمار اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ 23 نومبر 1914ء کو پنجاب میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلاً کشمیری تھے ان کی ابتدائی تعلیم پونچھ (جموں و کشمیر) میں ہوئی۔ 1930ء کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1934ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ انہوں نے ابتداء میں ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے ملازمت کی۔ 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے کچھ وقت دہلی اور لکھنؤ میں گزارا۔ اس کے بعد ان کا تعلق فلمی دنیا سے ہو گیا اور وہ آخری وقت تک ممبئی میں رہے۔ ممبئی ہی میں ان کا انتقال 18 مارچ 1977ء کو ہوا۔

پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو نئی بلندیوں تک پہنچایا ان میں کرشن چندر کا نام ممتاز ہے۔ ترقی پسند تحریک سے گہرا تعلق ہے۔ جس کا اثر ان کی کہانیوں اور ناولوں میں بہت نمایاں ہے۔ کرشن چندر نے ناول، افسانے، ڈرامے، رپورتاژ اور مضامین لکھے لیکن ان کی بنیادی حیثیت افسانہ نگار ہے۔

2. کرشن چندر کے اسلوب بیان پر روشنی ڈالئے؟

کرشن چندر اردو کے عظیم افسانے نگار گزرے ہیں۔ پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان میں کرشن چندر کا نام ممتاز ہے۔ ان کی مقبولیت کا سبب ان کی رومانیت اور ان کا خوبصورت انداز بیان ہے۔

کرشن چندر کا انداز بیان نہایت دلکش، خوبصورت اور شاعرانہ ہے ان کی تحریروں میں ان کے فکر، مشاہدے اور تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کا مشاہدہ کافی وسیع اور گہرا ہے۔

کرشن چندر معاشرے کی بے رحمیوں اور ناانصافیوں کے خلاف کھل کر اپنے افسانوں میں اظہار کرتے ہیں ان کو مناظر فطرت کی مصوری سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کی نفسیات سے واقف ہیں۔ مہاجن، ساہوکار، اعلیٰ حکام، مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما وغیرہ سب ان کے طنز کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کی

کہانیوں اور ناولوں میں ترقی پسند تحریک کا اثر خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ان کے افسانے زندگی کے موڑ پر بالکنی کا لو بھنگی مہالکشمی اور ان کے ناولوں میں شکست، ہمارا گھر اور پانچ لوفر کافی مشہور ہیں۔

3. رام دیال اپنی ذات برادری کے باہر لوگوں کو فلیٹ دینے سے کیوں منع کرتا تھا؟

جواب: پنڈت رام دیال ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کا اہم کلیدی کردار ہے جو مذہبی تعصب کا شکار ہے۔ وہ پرانے خیالات پر یقین رکھتا تھا۔رام دیال ایک کٹر برہمن ہے۔ جو فلیٹس بنوا کر بیچتا ہے یا کرائے پر دیتا ہے۔ کاروبار میں بھی ذات پات اور مذہبی جنوب پر خاص توجہ دیتا ہے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے فلیٹ میں کسی مسلمان یا عیسائی یا دوسرے مذہب کے لوگوں کو جگہ دینے سے اسکا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔اس کو گناہ ہوگا۔اس کے مذہبی اصولوں کے خلاف بات ہوگی۔اس طرح وہ مذہبی اچھوت سمجھتا تھا۔اسی لیے وہ کئی افراد کو مذہب کی بنیاد پر اپنے فلیٹ کرائے پر دینے سے منع کرتا تھا۔ صرف اپنے ذات برادری کے افراد کو ہی تلاش کیا کرتا تھا جبکہ کوئی مذہب بھی انسانوں کے درمیان تفریق پیدا نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان ایک تمام مذاہب کا گہوارہ ہے۔

4. متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

جسے ہر انسان، ہر قوم اور ہر دیش کی ایک آتما ہوتی ہے اسی طرح ہر
بلڈنگ کی بھی ایک آتما ہوتی ہے۔

جواب: یہ جملہ ڈرامہ دروازے کھول دو سے لیا گیا ہے اس کے مصنف کرشن چندر ہے۔

جب رام دیال کو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا تب عیسائی ڈاکٹر نے فوری علاج کیا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد کہتا ہے کہ ''میں نے مرا نہیں ہوں بلکہ میں نے بلڈنگ کی آتما سے ملاقات کی۔ جیسے ہر انسان، ہر قوم اور پردیش کی ایک (روح) آتما ہوتی ہے اسی طرح میری بلڈنگ کی روح (آتما) مجھ سے ملی۔ میں نے اس سے کہا! آؤ مل کر چلیں۔ ہمارا تمہارا راستہ ایک ہے وہ بولی اس راستے پر چل کر نہ تم کبھی منزل کو پہنچ سکو گے نہ میں کیونکہ یہ راستہ پرانا ہو گیا ہے۔اب یہ راستہ کہیں نہیں جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آگے جانے کی ترکیب کیا ہے۔ وہ بولی آگے وہی لوگ جاتے ہیں جو اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

''میں کرسٹان ہوں۔ میرے ہاتھ لگانے سے اس کا دھرم بھرشٹ
ہو جائے گا۔ مجھے جانے دو''

جواب: یہ جملہ ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' سے لیا گیا ہے اس کے مصنف کرشن چندر ہیں۔

پنڈت رام دیال کی دوران گفتگو اچانک طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ ملازم مرزا جی کہتا ہے کہ ان کو دل کا دورہ پڑ گیا! ڈاکٹر اپنی بیٹی کو لے کر جانے لگتا ہے تب کمل کانت، ڈاکٹر صاحب سے عاجزی کرتا ہے کہ وہ والد کا علاج کریں۔ ڈاکٹر صاحب طنزیہ کہتے کہ ''میں تو ایک کرسٹان ہوں۔ میرے ہاتھ لگانے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا''۔ یہ مریض کو مذہبی جنوب میں مبتلا ہے۔ بالآخر کمل کانت کی عاجزی پر ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے معائنہ کر کے فوری انجکشن دیتا ہے جس سے پنڈت رام دیال کے جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

III: بہت مختصر جوابات تحریر کیجئے جو 4 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے 2 نشانات مقرر ہیں۔

1. پنڈت رام دیال کے آفس نما کرہ کا منظر لکھئے؟

جواب: کمل کنج بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں ایک مستطیل نما بڑا کمرہ آفس کے لیے مقرر ہے۔ کمرے کی دیواروں پر نئی سفیدی ہو چکی ہے۔ بجلی کے تار باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ایک جانب لکڑی کے تختے، رنگ کے ڈبے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیری کام جاری ہے۔ سامنے کی دیوار پر ایک بڑی کیشن جی کی تصویر آویزاں ہے اس کے نیچے رام دیال کی کرسی ہے۔ اس کے سامنے میز پر بلڈنگ کا نقشہ، قلم دان، چند فائلیں اور ٹیلی فون رکھے ہیں اور کمرے میں چند کرسیاں اور اسٹول بے ترتیبی سے پڑے ہیں۔

2. پنڈت رام دیال کے بارے میں لکھئے۔

جواب: کمل کنج بلڈنگ کا مالک پنڈت رام دیال ہیں۔ جو ایک کٹر برہمن ہیں۔ اس کا کاروبار یہ ہے کہ فلیٹس بنوا کر بیچنا کرایہ پر دیتا ہے۔ لیکن یہ پرانے خیالات کا حامل اور مذہبی تعصب کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نو فلیٹس خالی ہیں لیکن وہ دیگر مذاہب کے افراد کو کرائے پر نہیں دیتا ہے۔ صحت کے بگڑنے کے بعد وہ اعلان کرتا ہے کہ نفرت سے ملک و قوم کو نقصان ہے بلکہ یہ گھر سب کا ہے اس لیے وہ اپنے دل اور گھر کے دروازے کھول دیتا ہے۔

3. ڈرامے کے کرداروں کے نام لکھئے؟

جواب: کرشن چندر کے ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کے کرداروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

پنڈت رام دیال	کمل کنج بلڈنگ کا مالک
کمل کانت	پنڈت رام دیال کا بیٹا

مرزاارشادحسین	رام دیال کا منیجر
مس ازابیلا کوئیلو	نوجوان لڑکی
ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو	اس کا باپ
انکل رام بھروسے	ان کا پرانا نوکر

4. ڈرامہ کا پلاٹ بیان کیجئے؟

ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کا پلاٹ یہ ہے کہ جو شخص مذہبی تعصب کا شکار تھا اس کا دل قومی یکجہتی، پیار اور اخوت کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔اس پر سچائی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

5. اس ڈرامے سے ہمیں کیا پیغام ملتا ہے؟

اس ڈرامے سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ ہم تمام مذاہب کی عزت واحترام کریں۔ مذہبی تعصب کو بڑھاوا نہ دیں بلکہ ہم آپسی اختلافات کو بھلا کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔اس سے قومی یکجہتی، مذہبی رواداری کا درس ملتا ہے۔

IV. ایک لفظ یا جملہ میں جواب دو۔ایک نشان مقرر ہے؟

1. معجزہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: وہ عمل جو عادت وفطرت کے خلاف واقع ہوا ہے۔معجزہ کہتے ہیں۔

2. عرفیت سے کیا مراد ہے؟

جواب: وہ نام جو محبت یا حقارت سے پکارتے ہیں۔عرف کہتے ہیں۔مثلاً کلو،للو،منو

3. ہر بلڈنگ کی .....ہوتی ہے۔(آتما)

4. آگے وہی لوگ جاتے ہیں جو اپنے .....کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔(دل)

5. اس ڈرامہ کے ذریعہ کیا پیغام دیا گیا ہے۔(قومی یکجہتی)

6. واحد۔جمع

افق۔آفاق	تصویر۔تصاویر
آفت۔آفاتہ	جرم۔جرائم
امام۔آئمہ	اثر۔آثار

7. اضداد

لیل۔نہار	آغاز۔انجام
نیک۔بد	جنت۔جہنم
رنج۔غم	افراد۔انکار
خیر۔شر	فتح۔شکست
دین۔دنیا	سست۔چست

07 : مس چڑیا کی کہانی

خواجہ حسن نظامی

I. تفصیلی جوابات۔8 نشانات۔

1. خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ ''مس چڑیا کی کہانی'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: خواجہ حسن نظامی اردو کے مشہور انشائیہ نگار گزرے ہیں۔ان کا نام علی حسن تھا وہ 1878 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں حاصل کی تھی اور وہ فقیر منش آدمی تھے۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں سادگی، بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔معمولی سے معمولی لفظ میں طرح طرح کے معنی پیدا کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔انہیں مصور فطرت کہا جاتا ہے۔آپ کا انتقال 1955ء کو دہلی میں ہوا۔

مصنف نے اس انشائیہ ''مس چڑیا کی کہانی'' میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر راست طنز کیا ہے اور انہوں نے اس تمثیلی واقعہ میں انسانوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو چڑیا چڑے کی زبانی کہلوایا ہے۔

ایک چڑیا چڑے نے نئی روشنی یعنی مغربی تہذیب کی ایک عالیشان کوٹھی میں اپنا گھونسلہ بنایا تھا اور اس کوٹھی میں ایک مسلمان بیرسٹر اور اس کی عیسائی بیوی اور بیٹی رہتے تھے۔وہ اپنی بچی کو مس بابا کہتے تھے۔

ایک دن اچانک گھونسلہ سے انڈا پھسل کر گر پڑا اور وہ ٹوٹ گیا۔اب تیک ہی باقی رہا۔جس وقت انڈا گرا چڑیا گھونسلے میں موجود تھی۔اس کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا جبکہ چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا۔وہ گھر آیا تو دیکھا کہ چڑیا خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔وہ سمجھا کہ میرے تاخیر سے آنے پر ناراض ہے۔اس نے چڑیا کی خوشامد کرنے لگا۔پھر بھی وہ نہ مانی۔اس میں چڑے کو بے عزتی محسوس ہوئی اور اس نے بھی اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔

تھوڑی دیر بعد چڑیا نے چڑے سے انڈے کے گر جانے کی خبر سناتی ہے تو چڑے کو بھی افسوس ہوا۔ پھر وہ غصہ میں چڑیا سے باتیں سناتا کہ پھوہڑ، بدسلیقہ، تو کیوں اڑی تھی، تو انڈوں کی نوکر تھی، تو نے میرے بچہ کی جان لی۔

مصنف نے چڑے کے ذریعہ مرد ذات کے غصہ اور رعب کو ظاہر کیا کہ مرد ہمیشہ اپنے آپ کو حاکم اور

عورت کو محکوم سمجھتے ہیں اور اسے ایک نوکر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

چڑیا پہلے تو غم میں چڑے کی طنزیہ باتیں سنتی رہی۔ جب چڑے نے زیادہ ہی بڑبڑایا تو وہ بھی طیش میں آکر جواب دینے لگی کہ زبان کو روکو۔ انڈے بچے پالنے کی ذمہ داری صرف میری نہیں ہے تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے گئے تھے۔ اب گھر آئے۔ خبر نہیں کہ کہاں کس سگی کے ساتھ گل چھڑے اڑاتے پھرتے ہونگے۔ صبح سے اب تک ایک دانہ بھی حلق سے نیچے نہیں اترا۔ تم نے پوچھا بھی نہیں؟

اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ ہو۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحب کو سارا کام نہیں کرنا پڑتا ہے۔ ان کی بچی کو آیا کھلاتی ہے۔ میں تمہارے بچوں کی آیا نہیں ہوں۔ مصنف یہ بتانا چاہتے کہ کوٹھری میں آزاد خیال عورت کو دیکھ کر چڑیا نے بھی اپنے حقوق سے خوب واقف ہوگئی تھی۔ آج کل کے زمانے کی عورتوں نے تعلیم حاصل کر کے اور مغربی تہذیب کی نقل میں اپنے حقوق کے لیے آوازیں اٹھانی شروع کر دی ہیں۔ چڑیا کی تقریر سن کر چڑا خاموش ہو گیا اور آدھی خدمت اپنی ذمہ لے لی۔

ایک انڈا ٹوٹ چکا تھا اور دوسرے انڈے سے ایک چڑیا نکلی اور اس نے عالیشان کوٹھری اور مغربی طرز زندگی کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ بیرسٹر کی بیٹی مس بابا کو دیکھا جو عمدہ کھلونے سے کھیلتی، بار بار دودھ پیتی، ٹب میں بیٹھ کر نہاتی ہے۔ نئے نئے کپڑے پہنتی ہے۔ مصنف نے واضح کیا کہ بچے میں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی نقل کرنے لگتے ہیں۔

ننھی چڑیا (مس چڑیا) نے بھی اپنے باپ چڑے سے فرمائش کرنے لگی کہ وہ بھی ٹب میں نہائے گی۔ کھلونے، عمدہ کپڑے لائیں، چڑے کو تعجب ہوا اس نے چڑیا پر طنز کیا کہ دیکھا مزا کوٹھی میں گھر بنانے کا! میں نے منع کیا تھا ان لوگوں کے اثرات ہم بھی پڑھیں گے۔ مس چڑیا نے ضد میں آکر کہا کہ تم غریب تھی تو کوٹھری میں گھونسلہ کیوں بنایا بلکہ کسی معمولی جھونپڑی میں گھر بنایا ہوتا۔ مجھے میم صاحب کی بچی کے تمام چیزیں منگوا کر دو ورنہ اپنی جان دے دونگی۔

چڑیا چڑا نے گھبرا کر کہا! ایسا غضب نہ کرو، ہم سب کچھ منگا دیں گے۔ مس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا اور کہنے لگے ''ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے''۔ بیرسٹر صاحب اچھے انسان ہے مگر ان کی صحبت نے ہمارا نقصان کر دیا۔ ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل

گئی۔ یہاں پر کوئی چڑیا بھی نہیں ہے جو ہمارے دکھ میں شریک ہو سکے۔

چڑیا چڑے اپنی غلطی پر افسوس کرتے ہوئے روتے ہیں اور مس چڑیا قہقہہ لگائی تھی کہ ''نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے''۔ مصنف نے اس انشائیہ میں یہ نصیحت کی ہر آدمی کو اپنے حالات کے مطابق ہی زندگی گزارنی چاہئے۔ انسان پر صحبت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔

2. ''نیک لوگوں کی صحبت نیک بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے''۔ اظہار خیال کیجئے۔

خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ ''مس چڑیا کی کہانی'' ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اس میں مصنف نے تمثیلی انداز میں انسانوں کے درمیان ہونے والی بات چیت، خصلت اور ماحول کے اثرات کو چڑیا چڑے کی طرز زندگی میں ظاہر کیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ''چڑیا چڑے نے ایک اونچی عالیشان مغربی تہذیب والی کوٹھری میں اپنا گھونسلا بنائیں اور روزانہ اس کوٹھری کے افراد خاندان ایک مسلم بیرسٹر اور ان کی عیسائی بیوی اور لاڈلی بیٹی کی معاشرت کا مشاہدہ کیا۔

ایک دن اچانک گھونسلے سے انڈا گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد چڑیا اور چڑے میں بحث ہوتی ہے۔ مصنف بتانا چاہتے ہیں کہ مرد ہمیشہ اپنے آپ کو حاکم اور بیوی کو محکوم و نوکرانی سمجھتا ہے۔ دوسری طرف چڑیا بھی طیس میں آ کر اپنے حقوق جتاتی ہے۔ مصنف نے واضح کیا کہ عالیشان کوٹھری میں رہ کر اس عیسائی عورت کو دیکھ کر چڑیا بھی اپنے حقوق سے واقف ہوگئی۔ آج کل کی عورتیں تعلیم حاصل کر کے اور کچھ مغربی تہذیب کی نقل کر کے اپنے حقوق کے لیے آوازیں اٹھانا شروع کر دی ہیں۔

عورتوں کا خیال ہے کہ ''اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اکیلی عورت پر سب ذمہ داری ہو۔ اب آزادی اور برابری کا حقوق ہے۔ پڑھی لکھی عورتوں کا محبوب نعرہ ہے۔ وہ گھروں میں بند ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتی بلکہ باہر نکل کر مردوں کی طرح کام کرنا پسند کرتی ہے۔ آدھا کام مرد اور آدھا کام عورت کے ذمہ سمجھتی ہے۔

اسی طرح چھوٹی چڑیا (مس چڑیا) نے اس کوٹھری کی مغربی تہذیب والے ماحول میں آنکھ کھولی۔ اور اس نے بیرسٹر کی لاڈلی بیٹی کے ناز نخرے و چیزوں کو غور سے دیکھا اور اپنے والدین چڑیا چڑے سے فرمائش کرنے لگی کہ وہ ٹب میں نہائی گئی۔ عمدہ کھلونے اور خوبصورت کپڑے منگوائے۔ اس پر بھی امیر ماحول کا اثر ہونے لگا۔ فرمائش میں بضد رہی ورنہ مرنے کی دھمکی دی تب چڑیا اور چڑا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور روتے

ہوئے کہنے لگے۔

''اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے''۔

یعنی اچھے لوگوں کے ساتھ رہنے سے کوشش کیے بغیر خود بخود ہمارے اندر اچھی باتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ بالکل یہی بات برے لوگوں کے ساتھ رہنے سے ہوتی ہے۔ چڑیا چڑے سوچتے ہیں کہ آج اگر ہم نے دوسرے چڑیوں کے ساتھ مل کر گھونسلہ بنایا ہوتا تو ہماری بچی مس بابا کی نقل نہ کرتی بلکہ اپنی ساتھی چڑیوں جیسی بننے کی کوشش کرتی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اچھوں کی صحبت میں رہ کر اچھا بنتا ہے اور بروں کی صحبت میں برا ہو جاتا ہے۔اس لیے اچھا انسان بننے میں ماحول بہت اہمیت رکھتا ہے۔

II. مختصر جوابات۔4 نشانات۔

1. خواجہ حسن نظامی کے حالات زندگی بیان کیجئے؟

جواب: خواجہ حسن نظامی اردو کے عظیم انشائیہ نگار گزرے ہیں۔ان کا پورا نام علی حسن تھا۔وہ دہلی میں 1878ء کو پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد کا تعلق حضرت خواجہ نظام الدین اولیائےؒ کے خاندان سے بہت قریبی تھا۔ ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں حاصل کی تھی۔بارہ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔وہ بے حد ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے انسان تھے۔

وہ دہلی کی گلیوں میں گھوم کر کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔وہ اپنی غریبی میں ہی ترقی کا راستہ تلاش کیا۔فرصت کے اوقات میں مطالعہ کرتے تھے۔بعد میں خود اردو کے مشہور ادیب بن گئے۔ساری زندگی دہلی میں گزری۔فقیر منش انسان تھے۔1955 کو دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔درگاہ نظام الدین اولیائے میں فن کئے گئے۔انہیں مصور فطرت کا لقب دیا گیا تھا۔

2. خواجہ حسن نظامی کے اسلوب بیان پر لکھئے؟

خواجہ حسن نظامی اردو کے مشہور ادیب گزرے ہیں۔ وہ ساری زندگی دہلی کی ادبی ماحول میں گزاری۔انہیں ادبی مطالعہ کا شوق تھا۔فرصت کے اوقات میں کوئی نہ کوئی کتاب کا مطالعہ میں کھو جاتے تھے۔ بعد میں اردو ادب کے بڑے ادیب بن گئے۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں سادگی، بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ان کا انداز بیان

دلکش، آسان اور دلچسپ ہے۔عبارت اتنی آسان ہوتی ہے کہ ہر ایک بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔معمولی باتوں میں طرح طرح کے معنی پیدا کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔فطرت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ایک جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔اسی وجہ سے خواجہ حسن نظامی کو مصور فطرت کہا جاتا ہے۔ان کے مشہور انشائیہ جھنگر، مٹی کا تیل اور الو وغیرہ ہیں۔

3. بچوں کو اچھا انسان بنانے کی ذمہ داری کس کی ہے؟

خواجہ حسن نظامی نے مس چڑیا کی زبانی والدین کو یہ تلقین کی کہ بچے کو بڑا ہو کر کیسا انسان بننا ہے اس کی تمام تر ذمہ داری ماں باپ پر ہے۔والدین کو معلوم ہونا چاہئے کہ بچے کی تربیت میں ماں باپ اور آس پاس کے ماحول کی بڑی اہمیت ہے۔اس لیے وہ بچوں کی جیسی تربیت اور پرورش کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے انہیں پہلے خود نمونہ بن کر دکھانا ہوگا۔ بچے کا ذہن بالکل صاف ہوتا ہے۔بچپن میں جس طرح کی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔جیسا ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔وہی ان کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں جو تاحیات باقی رہتے ہیں۔اس لیے ماں باپ کو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھنا چاہئے۔بچوں کی تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی توجہ دیں۔انہیں خوشگوار ماحول میں اچھی باتیں سمجھائیں اور برائی کے نقصانات سے واقف کروائیں۔ تب ہی بچے اچھے انسان بن سکتے ہیں۔

4. متن کے حوالہ سے تشریح کیجئے؟

تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔

یہ جملہ خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ ''مس چڑیا کی کہانی'' سے لیا گیا ہے۔چڑیا نے جب چڑے کو انڈا پھسل کر ٹوٹنے کی خبر سنائی۔وہ حیرت میں پڑ گیا اور غصہ میں چڑیا کو برا بھلا کہنے لگا کہ ''پھوپڑ، بدسلیقہ، تو نے کس طرح لاپرواہی کی، کیوں گھونسلہ چھوڑ کر باہر گئی، تیری یہ ذمہ داری تھی کہ انڈوں کی حفاظت کرتی۔کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام چھوڑ کر ہوا خوری کرتی ہے تو ایک چڑیا ہے تیرا کوئی حق نہیں ہے۔میرے ایک انڈے کا نقصان کر دیا۔تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔میں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا ایسا نہ ہو ان لوگوں کا اثر ہم بھی پڑ جائے۔

2. اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ ہو۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو۔ آدھا میں کروں۔

یہ جملہ سبق ''مس چڑیا کی کہانی'' سے لیا گیا ہے اس کے مصنف خواجہ حسن نظامی ہیں۔

چڑے نے انڈا ٹوٹنے پر چڑیا کو غصہ کیا۔ برداشت کی حد پار ہوئی تب چڑیا نے پلٹ کر جواب دیا ''زبان کو روکو'' بہت باتیں کرتے ہو۔ انڈے بچے پانے کا مجھ پر ہی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے گئے تھے۔ اتنی دیر سے واپس لوٹے۔ خبر نہیں کہاں رنگ رنگیلیاں مناتے پھرتے رہے۔ ذرا بھی باہر کی ہوا نہ کھاؤں؟ صبح سے اب تک ایک دانہ بھی نہ کھایا؟ کیا تم نے پوچھا۔

اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ ہو اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو۔ آدھی میں کروں۔ دیکھتے نہیں ہم صاحب کو سارا کام نہیں کرنا پڑتا ہے اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے۔ تمہارے انڈوں بچوں کی آیا نہیں ہوں۔

2.III نشانی سوالات۔

1. تمثیل کسے کہتے ہیں؟

تمثیل کے معنی علامتی مثال بنا کر پیش کرنا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس انشائیے میں گھروں میں انسانوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کو چڑیوں کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ انسانی خصلت کو پرندوں میں ظاہر کیا ہے اسے تمثیل کرنا کہتے ہیں۔

2. چھوٹی چڑیا نے مرنے کی دھمکی کیوں دی؟

چھوٹی چڑیا (مس چڑیا) نے نئے زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں اس لیے وہ بیرسٹر کی مس بابا کے نازنخرے اور وہی چیزیں استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اس نے چڑے سے فرمائش کی۔ چڑیا کہتی کہ ''بچی ہے کہنے دو۔ بڑی ہوگی تو سمجھ لے گی''۔ اس پر چھوٹی چڑیا بضد رہی کہ مجھے تمام اشیاء چاہیں۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ اگر نہ لاؤ گے تو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں۔ زندہ نہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہوگا۔ وہ ماں باپ کو ڈرانا چاہتی تھی۔

3. بچوں کی تربیت میں ماحول کی کیا اہمیت ہے؟

بچوں کا ذہن سادہ کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ ان کی جس طرح تربیت کی جائے جیسا ماحول فراہم کیا

جائے ویسے ہی نقوش ان کے دماغ پر قائم ہوجاتے ہیں۔ ماحول کی وجہ سے ہی بچے ایک اچھے انسان بنتے ہیں۔آس پاس کا ماحول بچہ کی شخصیت کی نشو ونما میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

4. کوٹھی میں کون کون رہتے تھے؟

نئی روشنی (مغربی تہذیب) کی اونچی کوٹھی میں ایک مسلمان بیرسٹر اور اس کی عیسائی بیوی اور لاڈلی بیٹی (مس بابا) رہتی تھی۔ یہ تمام مغربی تہذیب اور آزادانہ ماحول کے شوقین تھے۔

IV. ایک نشانی سوالات۔

1. انشائیہ کسے کہتے ہیں؟

انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے۔روزمرہ کے ہلکے پھلکے موضوع پر گہرائی کے ساتھ لکھے گئے مضمون کو انشائیہ Light Eassay کہتے ہیں۔معمولی باتوں میں طرح طرح کے معنی پیدا کیا جاتا ہے۔انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت اور نقطہ نظر جھلکتی ہے۔مضمون لکھنا آسان ہے۔انشائیہ لکھنا مشکل ہے۔

2. مصور فطرت کسے کہا جاتا ہے؟ (خواجہ حسن نظامی)

2. نئی روشنی سے مصنف کی کیا مراد ہے؟ (مغربی تہذیب)

4. خواجہ حسن نظامی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ (1878ء دہلی)

محاورہ:

اڈھیر بن میں ہونا: کسی الجھن میں گرفتار ہونا: چڑیا کی خاموشی پر چڑا اڈھیر بن ہوگیا۔

آپ سے باہر ہوجانا: غصہ پر قابو نہ رکھ پانا: چڑے نے چڑیا کی حرکت پر آپے سے باہر ہوگیا۔

میرے پنجے کی نوک: جوتے کی نوک پر: چڑیا نے طیش میں کہا کہ انڈا گر پڑا، میرے پنجے نوک سے میں کیا کروں۔

اپنا الوسیدھا کرنا: اپنا مطلب نکالنا: تم آئے کسی نہ کسی طرح اپنا الوسیدھا کیا اور چل دیئے۔

آستین چڑھانا: لڑنے کو تیار ہونا: میرے پڑوسی چھوٹی سی بات پر بھی آستین چڑھاتے ہیں۔

اضداد:

حاکم x محکوم	امید x غریب	عروج x زوال	اچھا x برا	صبح x شام
خشک x تر	اقلیت x اکثریت	حیات x موت	خوشحال x بدحال	

08 : برج بانو

کنھیالال کپور

I. تفصیلی جوابات۔

1. برج بانو کی کہانی اپنے الفاظ میں لکھئے؟

جواب: کنھیا لال کپور اردو کے مشہور طنز وظرافت نگار گزرے ہیں۔ وہ 1910 کو پنجاب (پاکستان) کے ایک گاؤں لائل پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہی ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم لاہور سے تکمیل کی۔ مختلف کالجوں میں لکچرر اور پرنسپل رہے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ انسانی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ اکثر ادبی موضوعات کو طنز وظرافت کا نشانہ بناتے تھے۔

کنھیا لال کپور نے خاکہ ''برج بانو'' میں اردو زبان کی دکھ بھری داستان بیان کی ہے۔ تقسیم ہندو پاک (بٹوارہ) کے بعد ہندوستان میں لسانی جھگڑا شروع ہوا۔ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اردو کو بیرونی زبان کا الزام لگایا گیا۔ اس زبان پر جو کچھ بھی بیتی اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مصنف نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان کی اہمیت اور شہرت کی طرف توجہ کروائی ہے۔

مصنف نے برج بانو کو ایک خوبصورت عورت کا نام دیا ہے کیونکہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ اسی لیے اس کا نام برج بانو پڑا۔ برج بانو سے مراد اردو زبان ہے اردو ایک سیکولر اور ہند آریائی زبان ہے یعنی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ برج بانو اردو کا تمثیلی خاکہ ہے اس میں مصنف نے برج بانو (اردو) سے راست تمثیلی انداز میں گفتگو کی ہے۔

یہ وہی برج بانو ہے جو مصنف کے ساتھ پاکستان سے ہندوستان تشریف لائی ہیں اور اسی کے گھر میں رہ رہی ہے۔ لیکن یہاں کے ہندی بولنے والے لوگوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ایک مسلمان پاکستانی عورت اس ملک (ہندوستان) میں رہے۔ برج بانو ان لوگوں کی باتیں سن کر بہت غمزدہ ہو جاتی ہے اور اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

آخر مصنف بھی برج بانو پر یہی زور ڈالتا ہے کہ اس کو واپس پاکستان جانا ہی پڑے گا۔ لیکن وہ سوال

کرتی ہے کہ آخر میں کیوں واپس جاؤں؟ میری ماں تو ہندوستانی تھی لیکن افسوس ہمارے سماج میں نسل ماں سے نہیں باپ سے چلتی ہے اور چونکہ اس کا باپ مسلمان تھا اس لیے اس کو واپس جانا ہی ہوگا۔

وہ مصنف کو یہ بھی سمجھاتی ہے کہ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے اور پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میری پیدائش تو دلی کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی اور لال قلعہ میں میری نوجوانی کی عمر گزری۔ میں اپنا گھر، اپنا وطن چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟

اسی گفتگو کے دوران مصنف نے کچھ ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے لیکن برج بانو ہندی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ کو ہی ترجیح دیتی ہے اور مصنف اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اگر تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اسے ہندی لفظوں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ ورنہ تمہارا راستہ پاکستان ہے۔

اسی دوران ایک قلفی والا آجاتا ہے۔ برج بانو پوچھتی ہے کہ قلفی کیسی ہے؟ وہ کہتا! جی کیا پوچھتی ہیں آپ ''میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار'' اور وہ لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے جس پر آسان اردو میں شعر لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد چنے فروخت کرنے والا بھی اردو زبان ہی کو اپنی طاقت اور اپنا سہارا بنا کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہی قلفی والے، اخبار بیچنے والے اور لاری چلانے والے اردو زبان کی طاقت ہیں۔

برج بانو کی نظر اخبار کی سرخی پر پڑتی ہے کہ ''برج بانو اب ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی'' برج بانو حکومت کے ہر فیصلہ اور ہر قانون کو ٹھکرا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ جب تک میرے ساتھ یہ تمام لوگ موجود ہیں۔ حکومت یا اور کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ مجھے اس ہندوستان سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں یہاں کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ راج کرتی رہوں گی۔

اس سبق سے انداز ہوتا ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ زبان دلوں کو جوڑتی ہے۔ زبان کو سیاسی سرپرستی ملے یا نہ ملے لیکن وہ اپنے بولنے والوں اور چاہنے والوں کی بدولت زندہ رہتی ہے۔ یہی خوبی اردو میں ہے۔ اس لیے وہ آج بھی ساری دنیا میں عوامی مقبول اور زندہ جاوید زبان بن گئی۔ اس لیے آخر میں مصنف برج بانو سے کہتا کہ ''برج بانو تم بہت ضدی ہو'' اور خود الفاظ دہراتا کہ ''بے نظیر، لاجواب اور شاندار''۔

2. کھنیالال کپور کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: کھنیالال کپور اردو کے مشہور طنز نگار گزرے ہیں۔ وہ 1910ء میں پنجاب (پاکستان) کے ایک

گاؤں لائل پور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد گاؤں میں پٹواری تھے۔ابتدائی تعلیم یہی گاؤں میں ہوئی۔موگا سے انٹرمیڈیٹ اور لاہور سے بی اے کے امتحانات پاس کیے۔انہوں نے ایک مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی ابتداء کی اور مختلف کالجوں میں لکچرر اور پرنسپل رہے۔تقسیم ملک کے بعد فیروز پور اور موگا میں ملازمت کی وہیں قیام رہا۔1980ء میں انتقال ہوا۔

کنھیالال کپور نے 1938ء میں مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ پہلا مجموعہ ''سنگ وخشت'' 1942ء میں مکتبہ لاہور سے شائع ہوا۔ان کا مطالعہ وسیع تھا۔انگریزی ادب کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔انسانی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھے۔

کنھیالال کپور خاکہ نگاری میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ان کے خاکے مختصر اور دلچسپ ہوتے ہیں ان کے خاکوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خاکہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی تحریر میں بڑی دلکشی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ان کے طنز میں تیزی بھی ہے اور سلیقہ بھی، زبان پر ان کو پورا عبور ہے۔آپ کے مضامین ہنسنے ہنسانے کے ساتھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔وہ خیالی وکردار کے ذریعہ ظرافت پیدا کرتے ہیں۔

مصنف کا انداز بیان، سادہ، شگفتہ اور دلچسپ ہے۔سادہ مضامین کی تہہ میں وہ طنز ومزاج کی ایسی لہریں پیدا کردیتے ہیں پڑھنے والے کی روح میں بشاشت اور تازگی پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر زمانے اور ہر مقام کے لوگ ان کی تخلیقات سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ان کے اسلوب کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہبات چیت کے انداز میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے ان کی نثر میں تاثیر اور ادبی حسن بھی پیدا ہوجاتا ہے۔سنگ وحشت، شیشہ وتیشہ، چنگ ورباب، نوک نشتر، نرم گرم اردو کا مریڈ شیخ چلی اور ان کے مشہور مجموعے ہیں۔

II. مختصر جوابی سوالات۔

متن کے حوالہ سے تشریح کیجئے۔

1. تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا''۔

جواب: جملہ کنھیالال کپور کے خاکہ ''برج بانو'' سے لیا گیا ہے۔

تشریح: مصنف نے برج بانو (اردو) سے تمثیلی انداز میں راست گفتگو کرتے ہیں۔لسانی جھگڑے کی بنیاد پر وہ

برج بانو کو اصرار کرتے ہیں کہ ''تم پاکستان چلی جاؤ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔ برج بانو کہتی ہے کہ میں کیوں جاؤں؟ میرا قصور کیا ہے؟ مصنف کہتے کہ تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔ ماں تو ہندو تھی لیکن سماج میں نسل کی پہچان باپ ہی سے ہوتی ہے۔ یہ عجیب منطق ہے۔ اس لیے تمہیں پاکستان جانا ہوگا۔ اس پر وہ اور بھی ادا ہوگئی۔ حالانکہ اردو زبان مشترکہ تہذیب ہندو اور مسلمان کی علامت ہے۔

2. یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔

جواب: حوالہ: یہ جملہ کنھیا لال کپور کے خاکہ ''برج بانو'' سے لیا گیا ہے۔

مصنف اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اگر تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو تمہیں ہندی لفظوں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ ورنہ تمہیں پاکستان چلے جانا ہیں۔ یہ سنتے ہی برج بانو کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا کہ ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جاسکتی ہوں؟ تمہارا گھر پاکستان ہے یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپن جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا دیوان عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر بٹھایا گیا۔

3. حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔

حوالہ: یہ جملہ سبق برج بانو سے لیا گیا ہے اس کے مصنف کنھیا لال کپور ہیں۔

تشریح: برج بانو نے مصنف کو اردو زبان کی عوامی مقبولیت کا ثبوت قلفی والا، لاری پر تحریر شعر اور چنے بیچنے والے کے الفاظ پیش کرتی ہے۔ اسی وقت ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ برج بانو ایک اردو اخبار خریدتی ہے لیکن اس کی نظر ایک سرخی پر پڑتی ہے۔ ''حکومت نے فیصلہ لیا ہے کہ برج بانو ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی''۔ اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔

مصنف پھر زور دیتے ہیں کہ ''ضد نہ کرو بانو تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے۔ برج بانو کڑک کر کہتی ہے کہ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک میرے ساتھ یہ تمام لوگ موجود ہیں۔ حکومت یا اور کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ مجھے اس ہندوستان سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ میں یہاں کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ راج کرتی رہوں گی۔

4. برج بانو کے والدین کون تھے اور وہ کس کے ہمراہ ہندوستان آئی؟

جواب: برج بانو اردو کا تمثیلی خاکہ ہے۔ کنھیالال کپور نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان کی اہمیت اور اس کی شہرت کی طرف توجہ کروائی ہے۔

برج بانو سے مراد اردو زبان ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اردو زبان (برج بانو) مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ ہندو اور مسلمان کے اشتراک و سماجی ضرورت نے اردو زبان کو جنم دیا۔ اس لیے برج بانو کا باپ مسلمان اور ماں ہندو تھی۔

ہندوستان کے بٹوارہ (تقسیم ہند و پاک) کے بعد ہندوستان میں لسانی جھگڑا شروع ہوا۔ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ایسے وقت میں مصنف جو خود اردو کے نامور ادیب تھے انہوں نے اپنے ہمراہ برج بانو کو ساتھ لایا۔

5. مصنف نے برج بانو کو پاکستان جانے کے لیے کیوں کہا؟ اور وہ کس لیے جانے سے انکار کی؟

جواب: مصنف کنھیالال کپور نے خاکہ ''برج بانو'' میں لسانی تعصب کو موضوع بنایا اور اردو زبان کی عوامی مقبولیت اور شہرت کو اجاگر کیا۔

کنھیالال کپور خود اردو ادب کے نامور ادیب رہے ہیں۔ اردو زبان سے کاص لگاؤ تھا۔ لیکن تقسیم ہند و پاک کے بعد اردو زبان کو بیرونی و خارجی زبان کا الزام لگایا گیا اور ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ایسے ماحول میں مصنف نے تمثیلی انداز میں برج بانو (اردو) سے گفتگو کرتے ہوئے اصرار کیا کہ برج بانو تم پاکستان چلی جاؤ کیونکہ یہاں پر ہندی کا ماحول بڑھتا جا رہا ہے۔

برج بانو نے دلیل کے ساتھ جواب دیا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں۔ میرا وطن یہی ہے۔ میں یہی کے ماحول میں پیدا ہوئی۔ بچپن گزرا اور جوان ہوئی۔ سب سے اہم میں ایک مقبول و عوامی زبان ہوں۔ لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ راج کرتی رہوں گی۔ مصنف نے اپنے خاکہ میں ثابت کیا کہ اردو اپنے بولنے والوں اور چاہنے والوں کی بدولت زندہ رہتی ہے۔ اس سے وہ ہندوستان چھوڑنے سے انکار کر رہی ہے۔

III. دو سطور میں جواب دیجیے۔ 2 نشانات مقرر ہیں۔

1. برج بانو کن کن لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوئی؟

جواب: برج بانو گلی میں گزرنے والے قلفی والے کو آواز دیتی ہے اور دریافت کرتی کہ قلفی کیسی ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ شاندار لاجواب بے نظیر ہے۔ لاری پر تحریر کردہ عام فہم شعر پڑھ کر خوش ہوتی ہے۔ آخر میں ایک چھاپڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ چنے کی خوبیاں عام زبان میں بیان کرتا ہے۔ ان تینوں کو دیکھ کر برج بانو کا دل خوش ہو جاتا ہے۔

2. اخبار پڑھ کر برج بانو کا رنگ زرد کیوں پڑ گیا؟

برج بانو ایک روز نامہ خریدتی ہے اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہی اس کا رنگ زور پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ بڑے حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ برج بانو (اردو) ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی۔ حکومت نے فیصلہ کر لیا اور قانون بنایا کہ ہندی ہی یہاں کی سرکاری زبان ہے۔

3. ہندوستانی حکومت برج بانو کے متعلق کیا فیصلہ کرتی ہے۔

جواب: ہندوستانی حکومت نے فیصلہ لیا ہے کہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ برج بانو ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی۔ اس کو پاکستان واپس جانا ہوگا۔

4. ہندوستان کے لوگ برج بانو سے عشق کیوں کرتے ہیں؟

جواب: ہندوستان کے لوگ برج بانو سے اس لیے عشق کرتے کہ اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی پیاری کشش ہے جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس پر فدا ہو جاتا ہے۔ اردو ایک میٹھی اور شیریں زبان ہے۔ اس لیے عام و خاص سب پسند کرتے ہیں۔

5. قلفی والا اپنی قلفی کی تعریف کن الفاظ میں کرتا ہے؟

جواب: قلفی والا اپنی قلفی کی تعریف میں یہ الفاظ کہتا ہے کہ میری قلفی! بے نظیر، لاجواب، شاندار

IV. مختصر ترین سوالات۔ ایک نشان مقرر ہے۔

1. برج بانو سے کیا مراد ہے؟

جواب: برج بانو سے مراد اردو زبان ہے۔

2. لاری کے فریم پر کونسا شعر تحریر تھا؟

جواب: در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں: خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

3. کونسے ہندی الفاظ استعمال کئے گئے؟

جواب: اوشیہ، پرنتو

4. اوشیہ کے معنی کیا ہے؟

جواب: اوشیہ کے معنی ضرور کے ہیں۔

5. کن دو زبانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوا؟

جواب: اردو اور ہندی

6. اردو کے لغوی معنی؟

جواب: اردو کے لغوی معنی لشکر کے ہے۔

09 : چچا چھکن نے تیمارداری کی

امتیاز علی تاج

1. امتیاز علی تاج کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھئے؟

جواب: سید امتیاز علی تاج 1900ء میں شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مختار علی عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ امتیاز علی تاج کی تقریباً تمام تعلیم لاہور ہی میں ہوئی۔ انہوں نے 1920ء لاہور گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا۔

امتیاز علی کا نام طنز و مزاح اور ڈرامہ نگاری میں مشہور ہوا۔ ان کا سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور ڈرامہ انارکلی ہے۔ پاکستان حکومت نے ستارہ امتیاز کے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ ان کا تعلق برسوں ریڈیو پاکستان سے رہا۔ ان کا انتقال 1970ء میں ہوا۔ امتیاز علی تاج نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ وہ کافی عرصہ تک رسالہ پھول کے ایڈیٹر رہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ ہنسی ہنسی میں بڑے بڑے کام کی باتیں بتا جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے پر ان کو عبور حاصل تھا بلکہ عورتوں کے لیے بھی اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ ان کو مغلیہ عہد کی درباری زبان، آداب ولہجہ سے پوری طرح واقفیت تھی۔ وہ ڈرامہ نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے مزاحیہ فیچر کا پسندیدہ کردار چچا چھکن ہے۔

سوال 2. امتیاز علی تاج کے اسلوب بیان پر مختصر نوٹ لکھئے؟

جواب: سید امتیاز علی تاج اردو کے مشہور طنز و مزاح اور ڈرامہ نگار گزرے ہیں۔ وہ 1900ء میں شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو زبان میں بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں اور مزاحیہ فیچر لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے کی۔ وہ کئی دنوں تک رسالہ پھول کے ایڈیٹر رہے۔

امتیاز علی تاج کو مزاحیہ فیچر لکھنے پر عبور حاصل ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے آسان اور مزاحیہ انداز میں بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ہنسی ہنسی میں بڑے کام کی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں چبھتے ہوئے طنز اور ہنسنے والے جملے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں ہر

طبقہ کی زبان کے بہترین نمونوں کو پیش کیا ہے۔ وہ عورتوں کے محاورہ، لہجہ اور فطرت کو کردار و مکالمہ کے ذریعہ اجاگر کیا۔ ان کے مزاحیہ فیچر ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' اور ''چچا چھکن نے دھوبن کو کپڑے دیں'' قابل تعریف ہے۔ ان کی شہرت لازوال شاہکار ڈراما ''انارکلی'' سے ہے۔ انہیں مغلیہ عہد کی درباری زبان، آداب ولہجہ سے پوری طرح واقفیت تھی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا خوبصورت کردار چچا چھکن ہے۔ انہوں نے ہنسی کے ذریعہ زندگی کے دکھ کو راحت میں تبدیل کر دیا۔ ان کی ادبی خدمات پر پاکستان کا ستارہ امتیاز ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سوال 3. بیمار کی تیمارداری پر نوٹ لکھئے؟

جواب: صحت اور بیماری اللہ کی نعمت ہے۔ ہر حال میں انسان خدا کا شکر گزار رہتا ہے۔ اس میں بھی مصلحت اور آزمائش پوشیدہ ہوتی ہے۔ بیمار کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ بیمار کی تیمارداری کرنا ہر صحت مند انسان کا فرض ہے۔ ہمیں اپنے اندر جذبہ پیدا کرنا چاہئے۔ گھر اور پڑوس کے بیمار لوگوں کی تیمارداری ثواب اور خدمت کے جذبے سے کرنی چاہئے۔

اسلامی و اخلاقی نقطہ نظر سے بیمار کی تیمارداری ایک بہترین عمل ہے۔ جس سے انسانی ہمدردی و اظہار یگانگت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ انسان کو اجتماعی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ صحتمند رہنے کی عظیم نعمت کی قدر ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ بیمار کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ بیمار کی خدمت کرنے سے آسمانی آفات و بلائیں دور ہو جاتی ہے۔ حقوق العباد کا عظیم فریضہ بیمار کی عیادت ہے۔

تیمارداری عورت مرد، لڑکے اور لڑکیاں سبھی کر سکتے ہیں۔ اس میں جنس کی قید نہیں ہے۔ ہر فرد اپنے رشتہ داروں و عزیز اقارب کی تیمارداری بغیر کسی رکاوٹ کے کر سکتے ہیں۔ مزاج پرسی کرنا، بیماری میں صبر کی تلقین کرنا اور جلد صحت یاب ہونے کی امید باندھنا، مریض کے لیے تسلی و ہمت افزائی ہوتی ہے۔

غرض تیمارداری کرنے میں مذہب، ذات پات، بڑے چھوٹے اور امیر غریب کی تفریق نہیں کرنی چاہئے بلکہ پورے جذبہ اور خلوص کے ساتھ بغیر تفریق کے تیمارداری کرنی چاہئے اور بچوں کو بھی اس عمل کی ہدایت دیں۔

سوال 3. امتیاز علی تاج کے مزاحیہ ڈرامہ ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

جواب: سید امتیاز علی تاج اردو کے مشہور طنز و مزاح اور ڈرامہ نگار گزرے ہیں۔ وہ ادبی و علمی گھرانے سے تعلق

رکھتے ہیں۔انہوں نے مزاحیہ فیچر اور ڈرامہ نگاری میں نام کمایا۔

امتیاز علی تاج نے ''چچا چھکن کی تیمارداری کی'' مزاحیہ ڈرامہ تحریر کیا۔اس میں انہوں نے ایک اخلاقی پہلو تیمارداری کی اہمیت کو مزاحیہ انداز میں واضح کیا۔اس مزاحیہ مضمون کے چھ کردار ہیں۔ان میں سب سے اہم اور مزاحیہ کردار چچا چھکن کا ہے اس ڈرامہ کو تین حصوں میں پیش کیا گیا۔

چچا چھکن کے گھر میں ان کا چھوٹا بیٹا للو ایک ہفتہ سے معیادی بخار میں مبتلا ہے۔دالان میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔بہت ہی کمزور ہو چکا ہے۔چچی اپنے لڑکے کی تیمارداری میں مسلسل مصروف ہیں اور بچہ تکلیف سے ماں کو قریب سے ہٹنے نہیں دیتا۔ساتھ ہی گھر کے دیگر کاموں کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ بیچاری چچی دن رات ذمہ داری نبھاتے ہوئے بچہ کی تیمارداری کرتی ہے۔اس کی غذا اور وقت پر دوا کھلانا کا خیال رکھتی ہے۔

دوسری طرف چچا کا کردار مزاحیہ ہے۔وہ بچہ کی بیماری پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتے۔صرف نوکروں کو جرنیلی حکم دیتے۔پانوں کی ڈبیہ بھرنے کے کہتے۔گھریلو ذمہ داری کا احساس نہیں صرف زندگی ہنسی مذاق ہی میں گزارتے ہیں۔اس لیے چچی اور چچا میں بات بات پر نوک جونک ہوتی ہے۔چچا کو چچی کے طعنے برداشت نہیں ہوتے وہ کہتے کہ ہم بتلائیں گے کہ تیمارداری کیا ہوتی ہے؟ مگر حقیقت میں چچا سے کوئی کام ڈھنگ کا نہ ہو پاتا۔بچہ تکلیف سے ماں کو بار بار یاد کرتا رہتا۔حتی کہ ایک خوراک دوا پلانے میں بھی چچا ناکام ہو جاتے۔ صرف نوکروں کے سامنے اپنی بڑائی اور چچی کا مذاق اڑاتے ہیں۔

آخر میں چچی لڑکے کی طبیعت بگڑنے پر پریشان ہوتی ہے اور نوکر امامی سے دودھ لانے کے لیے کہتی۔چچا پان کھاتے ہوئے دودھ خود لانے کے لیے باورچی خانے کی طرف دوڑتے۔دودھ انڈلتے وقت پھونک مارتے تب دودھ میں پورا پیک مل جاتا۔یہ پریشان ہو کر وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔اس طرح چچا نے ہر کام ہنسی مذاق سے بگاڑ دیا۔

چچا اور چچی کی بحث میں مصنف نے عورتوں کی زبان یا ان کی بول چال کے الفاظ شامل کیے۔جو مردوں کے پاس نہیں ہوتے۔چچی کی زبان سے اس طرح کے کچھ بیگماتی الفاظ، محاورات اور روزمرہ ادا کرائے ہیں۔

II 4 Marks

سوال 1. طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔اس کی ادبی اہمیت بیان کیجئے؟

جواب: انشائیہ کی یہ وہ قسم ہے جس میں بامحاورہ زبان کو بڑے لطیف اور وقار کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ منتخب کردہ موضوع کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ قارئین اس کی شگفتگی، لطافت اور طنز و مزاح سے لطف اندوز ہوں۔طنز و مزاح دراصل غیر افسانوی نثری ادب کا اہم حصہ ہے۔طنز و مزاح کے مضامین میں طنز میں تیزی بھی ہوتی ہے اور سلیقہ بھی برقرار رہتا ہے اور انداز بیان میں طنز کے ساتھ سادگی و روانی کے ساتھ ظرافت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ایسے مضامین میں سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے اور انہیں ہنساتے ہوئے اصلاحی درس دیا جاتا ہے۔

طنز کے ہلکے پھلکے جملوں کے ساتھ ظرافت کا پہلو ایسا نمایاں ہوں کہ پڑھنے اور سننے والے سب ہی تبسم ریز ہوں۔بات دل کی گہرائیوں کو چھولے۔جس میں ادبی حسن اور ظرافت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔اردو ادب میں مشہور طنز و مزاح نگار پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور فکر تونسوی گزرے ہیں۔مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم بھی مشہور مزاح نگار ہیں۔

سوال 2. متن کے حوالہ سے تشریح کیجئے؟

جواب: ڈپٹی صاحب نے مہینوں میرے ابا کی خوشامد کیں۔دوست، یاروں سے کہلوایا۔

حوالہ: یہ جملہ امتیاز علی تاج کے مزاحیہ ڈرامہ ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' سے لیا گیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ چچا اور چچی میں بات بات پر جھگڑا ہوا کرتا تھا۔چچا نے چچی کے طعنہ دینے پر اعتراض کیا اور کہنے لگے کہ میری تمہاری شادی تو اتفاق ہے۔دراصل ڈپٹی صاحب نے تو مہینوں میرے ابا کی خوشامد کیں۔دوست، یاروں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش۔نواب صاحب کی تمنا تھی کہ ان کی لڑکی سے شادی ہوجائے مگر ہماری قسمت کہ ابا مرحوم نے آپ کے والدین کو زبان دے چکے تھے۔ورنہ قیامت تک بھی تم سے شادی نہ ہوتی۔

2. ہر آدمی اس گھر کا اپنے آپ کو بقراط سمجھتا ہے اور گویا ہم تو کچھ نہیں؟

جواب: یہ جملہ امتیاز علی تاج کے مضمون ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' سے لیا گیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ چچا نے بڑی شان سے چیالنج کیا کہ ہم بتلائیں کہ تیمارداری کیا ہوتی ہے۔چچی

بیمار للو کے پاس سے ہٹ گئی اور حکم دے گئی کہ بچہ کو نہ سلاؤ ئیں اور ایک خوراک دوا پلائیں۔ چچا نے دوا پلانے کی بہت کوشش کی پھر بھی پریشان رہے۔ نوکر امامی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ ادھر چچی آواز لگاتی کہ دوا پلا دی! پھر انار کے دانے کھلانے کے لیے امامی کو آواز دی۔ اس پر چچا خفاء ہو کر کہتے ہیں اس گھر کا ہر آدمی اپنے آپ کو بقراط یعنی پڑھا لکھا سمجھتا ہے ہر کام انہیں ہی آتا ہے اور ہم تو بالکل کچھ نہیں ہے۔

سوال 3. ہم کوئی میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہیں۔

جواب: یہ جملہ امتیاز علی تاج کے مضمون ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' سے لیا گیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ چچا چھکن کے لیے مریض بچہ کو ایک خوراک دوا پلانا دشوار ہوں۔ للو بخار کی حالت میں کراہانے لگا۔ چچا نے سامان دلوانے کی لالچ دی اور اٹھا کر بھٹوایا۔ نوکر امامی سے کہا کہ پانی لے آؤ۔ للو دوا پیئے گا پھر پانی پی کر انار کے دانے کھائیے گا۔

مگر چچا جلدی میں دوا کے بجائے پانی کا کٹورا منہ کو لگایا۔ اپنی غلطی پر نوکر پر برس پڑے۔ اور کہنے لگے ہم خوب جانتے ہیں یہ سب تم لوگوں کی سازش ہے۔ ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ سارا گھر ایک طرف ہو جاتا ہے مگر ہم کوئی میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم ثابت کر دیں گے ہم بھی تیمارداری کیسے کرتے ہیں۔

III 2 Marks

1. تلمیح کسے کہتے ہیں؟

نظم یا نثر میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے والے لفظ کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے پیچھے وہ پورا قصہ یا تاریخی پس منظر ہوتا ہے۔ جس سے نظم یا نثر کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آتا ہے۔

یوسف ثانی، ابن مریم، ما کنفاں

2. حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کیا تھا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مردوں کو زندہ اور بیماروں کو شفاء بخشتے تھے۔ اسی لیے حضرت عیسیٰؑ کو مسیحا کہا جاتا ہے۔

3. محاورہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: محاورے کے معنی ہیں ''گفتگو کرنا'' یا ''ہم کلام ہونا'' لیکن اہل زبان کی اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے اس مجموعہ کا محاورہ کہتے ہیں جو کسی نہ کسی مصدر سے مل کر بنا ہو اور اپنے حقیقی معنی کے بجائے کسی دوسرے مجازی معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔ جیسے آسمان سے باتیں کرنا، ہاتھ پیلے کرنا، دانت کھٹے کرنا وغیرہ۔

IV. تذکیر و تانیث لکھئے:

میاں	:	بیوی
خسر	:	خوش دامن
راجہ	:	رانی
قاتل	:	قاتلہ
لنگڑا	:	لنگڑی
پوتا	:	پوتی
گوکی	:	کولن
ناگ	:	ناگن
حاجی	:	حجن
ڈوم	:	ڈومنی
مور	:	مورنی
مغل	:	مغلائی

10 : امید کی خوشی

سرسید احمد خاں

1. سرسید احمد خاں نے مضمون امید کی خوشی میں کس چیز کی اہمیت وافادیت پر زور دیا ہے؟

یا

سرسید احمد خاں کے مضمون امید کی خوشی کا خلاصہ لکھئے۔

سرسید احمد خاں اردو کے مشہور مضمون نگار گزرے ہیں۔ انہوں نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی وہ 1817 کو دہلی کے علمی دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سرسید نے رسالہ تہذیب اخلاق کے ذریعہ اردو میں ایک نئی طرح کی علمی نثر کا رواج شروع کیا۔ وہ انی ہر بات دلیل کے ساتھ سادگی اور صفائی کے انداز میں کہتے۔ انہوں نے مضامین کے ذریعہ سماجی اصلاح کا کام انجام دیا۔ 1857ء غدر کے بعد جدید نثری دور کا آغاز ہوا۔

سبق ''امید کی خوشی'' مضمون نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں امید کی اہمیت وافادیت کو ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا کہ انسان امید کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک امید کے سہارے ہی مشکل حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ترقی کی ساری منزلیں امید کے سہارے ہی طے ہوتی رہی ہیں۔

مصنف نے کائنات کے خوش نما نظاروں کی مثال دے کر ایک حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ جو چیزیں ہماری پہنچ سے دور ہوتی ہیں وہ ہمیں اپنے قریب کی چیزوں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں ہم کو عقل کو سب سے زیادہ خوشی دینے والی سمجھتے ہیں لیکن عقل نہیں وہ تو صرف قدرت کے جلوؤں ہی کو دکھا سکتی ہے بلکہ اس سے اہم اور قیمتی چیز جو ہم سے دور تو ہے غیر مرئی ہے مگر ہماری زندگی کے مشکل سے مشکل حالات میں ہمیں سہارا دیتی ہے۔ اس کا نام امید ہے۔ امید ہی کی بنیاد پر ہم اپنی پوری زندگی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور امید ہی سے قوت اور طاقت لے کر ان منصوبوں کو پورا کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

سرسید نے مختلف مثالوں، تلمیحات اور تاریخی واقعات سے امید کی اہمیت بیان کی ہے۔ انسان ہمیشہ

امید کے سہارے ہی آگے بڑھتا ہے اس کی زندگی میں رونق ہے ورنہ خوشی ، خوشی نہ ہرتی۔شہرت بے معنی ہوجاتی ہے۔ بہادری اور فیاضی کی قدر نہ ہوتی۔اسی طرح جب آدم علیہ السلام سے جنت میں گلطی سرزد ہوگئی تب آدم کوسزاء کے طور پر دنیا میں بھیج دیا گیا تو یہ امید ہی تھی جن کا دامن تھام کر حضرت آدمؑ نے خدا سے معافی طلب کی خدا نے انہیں معاف کر کے بلند مقام پر نبی بنایا۔

حضرت نوحؑ کے زمانے میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔جس میں پوری دنیا غرق ہوگئی تھی پھر بھی نوحؑ نے اسی امید پر کشتی کوآگے بڑھایا اور جودی پہاڑ کے ساحل پر پہنچ گئے اور کبوتر کی چونچ میں زیتون کی ہری ٹہنی کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ ہم جلد ہی خشکی پر پہنچ جائیں گے۔

امید کوآسمانوں کی روشنی اور نا امیدوں کی تسلی بتاتے ہوئے مصنف یہ کہتا ہے کہ امید کہ سہارے ہی ہر ایک کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے۔امید ہی ہر درد کی دوا ہے اور امید ہی ہر غم کو دور کرتی ہے۔

مصنف نے عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکنے والوں سے مراد علمی کام کرنے والوں اور سائنسدانوں سے لی جو اپنی کوششوں میں جب کہیں لڑکھڑاتے ہیں تو امید ہی انہیں سہارا دیتی ہے۔اسی کے ساتھ ایک لوری کے سہارے نادان بچے سے وابستہ ماں باپ کی تمام امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔اور وہ کہتے کہ او ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔انسان تمام عمر امید ہی کے بل بوتے پر زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے کڑی محنت کرتا ہے۔

اس مضمون میں مصنف نے قرآنی واقعات وتلمیحات کا ذکر کیا۔سورہ یوسف میں یوسفؑ کا اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے جدا ہونا۔ باپ کا غم میں رورو کر اپنی بینائی کھو بیٹھے پھر بھی امید کہ حضرت یوسفؑ سے ملاقات ہوگی۔ یوسفؑ کا کنویں میں گرنا اور امید کہ کوئی نہ کوئی باہر نکال لے گا۔اس میں بہادروں کی قوت بازو اور بہادری کی ماں سے مخاطب کیا گیا کہ میدان جنگ میں سپاہی بے خوف اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔یہ امید کی قوت سے ہے کہ موت سے آنکھ ملاتے اور فتح پانے کا پختہ یقین ہے۔سرسید نے اپنا ذکر کیا کہ وہ قوم کی بھلائی کے لیے آگے بڑھتے تب لوگ گمراہ کن باتیں کہتے پھر بھی ایسے نازک حالات میں امید ہی انہیں سہارا دیتی ہے۔وہ تحریک کامیاب رہی۔

مصنف نے مضمون کے آخر میں انسانی زندگی کے آخری دور کے سب سے مشکل وقت کو بھی امید کے سہارے ہی آسان کر دکھایا ہے۔موت کے لمحات میں انسان اپنے خدا سے معافی مانگتا ہے یہی امید اور یقین

اس کے اس کڑے وقت کو آسان کر دیتا ہے۔

سرسید نے سبق کے شروع میں امید کو نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی اور آخر میں امید کو ایمان کی خوب صورت بیٹی کہہ کر امید کی فضیلت بیان کی ہے۔امید انسان کے جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اور اسے زندگی میں مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔

سوال 2. سرسید احمد خاں کے اسلوب پر روشنی ڈالئے؟

جواب: سرسید احمد خاں اردو کے مشہور ادیب گزرے ہیں۔انہوں نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی وہ 1817ء کو دلی کے ایک علم دوست اور معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔سرسید نے دلی کے بڑے بڑے علماء سے علم حاصل کیا۔شعرا کی صحبت میں بیٹھے رہے۔والدہ محترم کی زیرنگرانی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔انہوں نے مغلیہ دور حکومت کا زوال اور انگریز حکومت کا آغاز دونوں کا مشاہدہ کیا۔1857ء غدر کی ناکامیوں کا جائزہ لیا اور علی گڑھ کا آغاز کیا۔جو ایک علمی و اصلاحی تحریک تھی۔جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی مایوسی اور ان کے اندر کی احساس کمتری کو دور کرنا چاہتے تھے۔اس لیے عصری علوم کو سیکھنے کی تلقین کی تاکہ نئے دور سے ہم آہنگ ہو سکے۔سرسید اور ان کے رفقاء نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اردو ادب کو وسیلہ اظہار بنایا۔

سرسید احمد خاں بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔بلند پایہ مصنف، مفکر، عظیم المترتبت، مصلح اور مدیر تھے۔انہوں نے ملک و قوم کی بیداری کا مشکل فریضہ انجام دیا۔مختلف موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ان کی فکر کا دائرہ وسیع تھا۔

سرسید سے قبل اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے اردو زبان بہت مشکل اور پیچیدہ ہوگئی تھی۔سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اردو میں ایک نئی طرح کی علمی نثر کا رواج شروع ہوا۔اردو ادب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔تصنع اور مشکل پسندی کو تحریر و تقریر سے دور رکھا اور اپنی ہر بات مدلل انداز سے سادگی اور صفائی کے ساتھ کہتے رہے۔

سرسید کا ذہن ایک عمل پسند کا ذہن تھا۔جنہیں ادبی حسن سے زیادہ ٹھوس حقائق، زورِ بیان اور سادہ طرز اظہار تھا۔اس لیے ان کی نثر اپنا ایک الگ اسلوب اور وزن رکھتی۔یہ اسلوب بڑھتے ہوئے سائنسی میلان اور عقلی رجحان سے ہم آہنگ تھا۔ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لیے جو پیغام پہنچانا ہے وہ سادہ اور آسان زبان میں بیان کر دیا جائے۔اسی وجہ سے انہیں جدید نثر کا بانی کہا جاتا ہے۔قوم کی بھلائی میں

ان کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ہے۔

4 Marks

سوال 1. سرسید احمد خاں کے حالات زندگی پر نوٹ لکھئے؟

جواب: سرسید احمد خاں عظیم شخصیت کے مالک تھے وہ 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے آباو اجداد مغلیہ سلطنت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ننھیال میں بھی مشہور اور محترم علماء موجود تھے۔ان کی تربیت خالص مشرقی اور مذہبی ماحول میں ہوئی۔قرآن شریف پڑھنے کے بعد انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔دلی کے بڑے بڑے علماء سے بھی سرسید نے کسب فیض کیا۔شعراً کی صحبت میں بیٹھے۔فارسی میں کچھ شعر بھی کہے۔جوانی کا کچھ حصہ رنگینیوں میں بھی گزرا لیکن جب تقریباً 22-21 برس میں ملازمت اختیار کی۔عدالت صدر امینی دہلی کے سررشتہ مقرر ہوئے تو زندگی سنجیدہ اور باکار گزرنے لگی۔بہت جلد مصنف ہو گئے۔سرسید کی والدہ ایک صاحب اوصاف خاتون تھیں۔بیٹے کی تعلیم وتربیت انہیں کی نگرانی میں ہوئی۔

سرسید احمد خاں بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف، ممتاز مفکر، عظیم المرتبت، مصلح اور مدبر تھے۔انہوں نے ملک وقوم کی بیداری کا مشکل فریضہ انجام دیا۔ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا۔ان کی فکر کا دائرہ بہت وسیع تھا۔غدر کے بعد سے سرسید کی حیثیت ایک مفکر اور رہنما کی ہوگئی اور ان کے عمل کا دائرہ سیاسی اور تعلیمی، اصلاحی اور ادبی سمتوں میں پھیلا وہ ایک بہت ہی کامیاب اور باعمل زندگی گزار کر 1898ء کو علی گڑھ ہی میں انتقال کر گئے۔

2. مصنف نے یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوب صورت بیٹی کسے اور کیوں کہا ہے؟ وہ انسان کو کہاں کہاں سہارا دیتی ہے۔

جواب: سرسید احمد خان نے اپنے مضمون میں امید کی اہمیت واضح کی اور اس کو مختلف القاب سے نوازا۔یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوبصورت بیٹی سے مراد امید ہی ہے۔اس لیے کہ اس کے ساتھ خدائی روشنی ہے۔یہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔اس کی وجہ سے دور کی خوشیاں ہم کو بہت ہی قریب نظر آتی ہے۔اسی کے سہارے سے زندگی کی مشکل سے مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔امید ہی سے ہمارے سوئے ہوئے خیال جاگتے ہیں۔اسی کے بدلے ہم کو خوشی، نام آوری، بہادری، فیاضی، محبت اور نیکی کے جذبات ابھرتے ہیں بلکہ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں

اسی کے تابع اور اسی کے فرماں برداری میں ہیں۔

3. سبق امید کی خوشی میں کون کونسی تلمیحات کا ذکر کیا گیا لکھئے۔

جواب: سبق امید کی خوشی میں سرسید احمد خاں نے مدلل انداز میں امید کی اہمیت کو واضح کیا اور ثابت کیا کہ امید کے سہارے ہی ہر ایک کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے امید ہی ہر درد کی دوا ہے اور امید ہی ہر غم کو دور کرتی ہے اس کے لیے انہوں نے تاریخی تلمیحات کا حوالہ دیا۔

پہلا گنہگار انسان کہہ کر مصنف نے آدم علیہ السلام کی تلمیح کو بیان کیا جس میں حضرت آدمؑ جنہیں شیطان نے بہکا کر خدا کی حکم کی خلاف ورزی پر تیار کیا اور جنت سے نکلوایا نیک نبی کی تلمیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا۔ جنہوں نے برس ہا برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی۔ اسی طرح پہلا ناخدا کی تلمیح میں حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ حضرت نوح کے زمانے میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ انہوں نے اپنی کشتی کھینچتے چلے گئے کبھی نہ کبھی ساحل پر ضرور پہنچ جائیں گے اور جودی پہاڑ کو پہنچے۔

مصنف نے قرآنی سورتوں کے حوالہ سے تلمیح کا اشارہ کیا کہ دیکھ وہ بوڑھا آنکھوں سے اندھا سے مراد یعقوبؑ ہے۔ حضرت یوسفؑ کے گم ہو جانے کے غم میں روتے روتے باپ کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔

اسی طرح سورہ یوسفؑ کے سانحہ میں تلمیح دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات بند خانوں میں بند ہے کا اشارہ ہے۔ یہاں بے گناہ قیدی سے مراد حضرت یوسفؑ ہیں جنہیں ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنویں میں ڈھکیل دیا تھا۔

مصنف نے بہادر سپاہی کی جنگی کارناموں کو تلمیح کے حوالہ سے پیش کیا کہ وہ خوف ناک میں بھی فتح کی امید پر دشمنوں سے لڑتے ہیں۔ آخر میں خود اپنے بارے میں قومی بھلائی کا پیالا کہہ کر ذکر کیا۔ غدر کے بعد سرسید نے جو تعلیمی و اصلاحی تحریک علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی تو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی جدوجہد کے اپنی قوم کی اصلاح میں کامیابی ملی۔

4.: متن کے حوالہ سے تشریح کیجئے؟

اونورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتے ہیں۔

جواب: حوالہ یہ جملہ سرسید احمد خاں کے مضمون امید کی روشنی سے لیا گیا ہے۔

تشریح: مصنف نے دلیل کے ساتھ امید کی اہمیت وفضیلت بیان کی ہے۔ وہ راست امید سے مخاطب ہے اور کہتے ہیں کہ او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! تو ہی خدا کی روشنی وکرن ہے۔ جو ہمیں مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ ہمارے آڑے وقت میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی وجہ سے دور کی خوشیاں ہمیں قریب نظر آتی ہے۔ زندگی کی مشکل سے مشکل گھاٹیاں ہم طئے کرتے ہیں۔ امید ہی کے سہارے ہمارے سوئے ہوئے خیال جاگتے ہیں اور ہمارے اندر نیا جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے۔ غرض کہ امید ہی کے سہارے ساری دنیا قائم ہے۔

5. دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈورنی بھی ہلاتی جاتی ہے ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے۔

جواب: حوالہ: یہ جملہ سبق امید کی خوشی سے لیا گیا ہے اس کے مصنف سرسید احمد خاں ہیں۔

تشریح: مصنف نے مصیبت زدہ اور محنت کش ماں کی تصویر کھینچی ہے وہ اپنے کام میں مصروف ہے لیکن اس کا دل اور امیدیں بچہ میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے ایک لوری کے سہارے معصوم نادان بچے سے وابستہ ماں باپ کی تمام امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ ماں نے اپنے بچہ کی خوشحالی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ اور اس کے بڑے ہونے پر اس کی لیاقت، شہرت اور محبت کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجلا ہو گیا۔ بچہ کی غوں غاں کی انکوھی بولی سے لے کر جوانی اور آخری لمحات کی حرکت پر ماں باپ پر امید ہوتے ہیں۔ ان کی امید کی خوشیاں بڑھتی ہیں۔ معصوم بچہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ غرض کہ بچہ کی پیدائش سے موت تک امید ہی تو ساتھ رہتی ہے۔

6. ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے سہارے سے کٹھن گھڑی آسان ہو جاتی ہے۔

حوالہ: یہ جملہ سبق امید کی خوشی سے لیا گیا ہے۔ اس کے مصنف سرسید احمد خاں ہیں۔ مصنف نے اس جملہ میں انسانی زندگی کے آخری دور کے سب سے مشکل وقت یعنی موت کو بھی امید کے سہارے آسان کر دکھایا ہے۔ انسان چار چیزوں یعنی ہوا، پانی، مٹی اور آگ سے مل کر بنا ہے۔ مرنے کے بعد یہ چاروں چیزیں انہیں چیزوں میں مل جاتی ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ جب انسان کے اوپر جان کنی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس کا سب سے

مشکل وقت ہے مگر اس وقت بھی انسان اس یقین اور بھروسے سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ خدا توبہ قبول کرنے والا ہے اور معاف کرنے والا ہے وہ مجھے بخش دے گا اور یہی امید اور یقین اس کے اس مشکل وقت کو آسان کر دیتی ہے۔

2 Marks

1. پہلا ناخدا تلمیح کی تشریح کیجئے؟

جواب: وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بغیر مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پہلا ناخدا سے حضرت نوح مراد ہیں۔ حضرت نوح کے زمانے میں اتنا بڑا سیلاب آیا تھا جس میں پوری دنیا غرق ہوگئی تھی مگر ایسے وقت میں حضرت نوح علیہ السلام صرف اس امید پر اپنی کشتی کھینچتے چلے جاتے تھے کہ کبھی نہ کبھی ساحل پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ اگر ان کے دل میں پکا یقین نہ ہوتا تو ساری دنیا کے ساتھ حضرت نوح بھی اسی سیلاب کی نذر ہو جاتے تھے۔

2. مصنف نے امید کو کن ناموں سے مخاطب کیا لکھئے۔

جواب: مصنف نے امید کی خوشی مضمون میں راست امید سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے الگ الگ تاریخی واقعات کے پس منظر میں الگ الگ ناموں سے امید کو پکارا جس سے اس کی اہمیت و افادیت اجاگر ہوئی۔ او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید، اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامیدوں کی تسلی امید، او ہماری پیاری امید، اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادری کی ماں، ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری امید اور آخر میں ایمان کی بیٹی سے مخاطب کیا گیا۔

3. مصیبت زدہ ماں کی بچہ سے کیا امیدیں وابستہ ہیں؟

جواب: سرسید احمد خاں نے انسان کی فطرت کی عکاسی کی۔ مصنف نے ایک لوری کے سہارے نادان بچے سے وابستہ ماں باپ کی تمام امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مصنف نے ماں باپ کی موجودہ اور مرنے کے بعد کی زندگی اور بچے کی زندگی کے تینوں ادوار کو امید کے رسے سے باندھا ہے۔ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ ہر دور کی حرکت سے ماں کی امیدیں بڑھنے لگی۔ ماں باپ اس معصوم بچہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کیسے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ او ہماری پیاری

امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہماری ساتھ رہتی ہے۔

4. یوسف علیہ السلام کے غائب ہونے کے واقعہ کو بیان کیجئے؟

جواب: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام ملک کنعاں میں پیدا ہوئے۔ ملک کنعاں جسے اب فلسطین کہتے ہیں۔ یہ بارہ بھائی تھی۔ ان میں حضرت یوسفؑ سب سے ذہین اور خوبصورت تھے۔ کلام پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ ان کی دیانت داری اور فرمانبرداری کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں بہت چاہتے تھے۔ اس لیے باقی سوتیلے بھائیوں کو ان سے حسد ہوا۔ ایک روز باپ سے جھوٹ بول کر شکار کھیلنے کے بہانے ان کو جنگل کی طرف لے گئے اور حضرت یوسفؑ کو کنعان کے ایک کنویں میں ڈال دیا۔ مکاری کر کے روتے پیٹتے آئے اور کہنے لگے کہ اے باپ حضرت یوسفؑ کو تو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ دیکھئے ان کا کرتہ ہے جو خون سے تر ہے۔

حضرت یوسفؑ کے غم میں روتے روتے باپ کی بینائی جاتی رہی۔ اس کو گریہ یعقوب بھی کہتے ہیں۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر سے گزرا جب پانی لینے کے لیے کنوئیں پر ایک شخص گیا تو اس نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا اور نکالا۔ چونکہ اس زمانے میں انسان فروخت کئے جاتے تھے اس لیے ان کو مصر کے بازار میں بیچ کر اچھی قیمت حاصل کی۔

1 Marks

سوال: یقین اکلوتی خوبصورت بیٹی کون ہے؟

جواب: یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید ہے۔

سوال: پہلا گنہگار انسان سے مراد کون ہیں؟

جواب: پہلا گنہگار انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہے جنہوں نے شیطان کے بہکاوے میں آخر غلطی کی تھی۔

سوال: اس سبق میں نیک نبی کسے کہا گیا ہے؟

جواب: اس سبق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نیک نبی کہہ کر مخاطب کیا گیا۔

سوال: ہر دور کی دوا کس کے پاس ہے؟

جواب: ہر دور کی دوا امید ہی کے پاس ہے۔ انسان ہر حال میں امید ہی کے سہارے کامیابی و سکون تلاش کرتا ہے۔

سوال: بہادر سپاہی میدان جنگ میں کس کے سہارے لڑتے ہیں۔

جواب: بہادر سپاہی میدان جنگ میں امید کے ہی سہارے لڑتے ہیں اور یہی امید کے ذریعہ فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔

سوال: قومی بھلائی کا پیاسا سے کیا مراد ہے؟

جواب: قومی بھلائی کا پیاسا سے مراد خود مصنف سرسید احمد خاں ہیں جنہوں نے 1857 غدر کے بعد مسلمانوں کی احساس کمتری اور مایوسی دور کرنے کے لئے تعلیمی و اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا۔

سوال: لازوال آنے والی خوشی کی امید کن تینوں چیزوں سے طئے ہوتی ہے؟

جواب: لازوال آنے والی خوشی کی امید ان تینوں چیزوں سے طئے ہوتی ہے۔ ا۔ ایمان کا توشہ (پختہ ایمان) ۲۔ امید کا ماوی (امید کی روشنی) ۳۔ موت کی مواری (موت کا وقت)

سوال: ناخدا کسے کہتے ہیں؟

جواب: ناخدا کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔

سوال: سب سے زیادہ خوش کرنے والی چیز کونسی ہے؟

جواب: انسان کو سب سے زیادہ خوش کرنے والی چیز امید ہے۔

سوال: کیوں ماں باپ اپنی تمام تر خواہشات نادان بچے سے وابستہ کر لیتے ہیں؟

جواب: ماں باپ اپنی تمام تر خواہشات نادان بچے سے اس لئے وابستہ کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی تمام تر امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔

سوال: مہد سے لحد تک کے کیا معنی؟

جواب: مہد سے لحد تک کے معنی پیدائش سے لے کر مرنے تک ہیں۔

سوال: جدید اردو نثر کے بانی کسے کہا جاتا ہے؟

جواب: سرسید احمد خاں کو جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے۔

سوال: سرسید احمد خاں کب اور کہان پیدا ہوئے؟

جواب: سرسید احمد خاں 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔

سوال: سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے نام لکھئے؟

جواب: سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد۔

11 : نظم کا ارتقاء

سوال 1. نظم کی تعریف اور اس کا ارتقاء بیان کیجئے؟

جواب: شاعری کا وہ حصہ جو غزل کے زمرے میں نہیں آتا اور جس میں کوئی قصہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہو نظم کہلاتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں شاعری کی باقاعدہ ابتداء اٹھارویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے۔ ولی کا دیوان جو 1720ء میں دہلی آیا اس نے شاعروں کو بہت متاثر کیا اس دیوان کو دیکھ کر شاعروں کو حیرت ہوئی کہ وہ زبان جس کو ہم گھر میں بولتے اور جس میں خرید وفروخت کی گفتگو کرتے ہیں اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ جذبات کی نزاکتوں کو پیش کر سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت سعداللہ گلشن نے ولی کو یہ نصیحت کی تھی کہ آپ فارسی سے مضامین کو ریختے میں منتقل کریں اس وقت یوں بھی فارسی زبان زوال پذیر تھی اور فارسی کے مشہور شعرأ بھی تفنن کے طور پر اردو میں شعر کہنے لگے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی سیاسی اعتبار سے بہت پرآشوب تھی لیکن اس سیاسی ابتری کے باوجود اردو ترقی کرتی رہی۔ آبرو، حاتم، ناجی مرزا مظہر اور دیگر معاصرین ولی نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔

سوال 2. جدید دور کے شعرأ نے نظم کی کون سی صنف کا خوب استعمال کیا ہے؟

جواب: جدید دور کے شعرأ نے نظم کی جس صنف کو خوب استعمال کیا ہے وہ ہے مثنوی۔ مثنوی بذات خود عربی لفظ ہے۔ مثنیٰ سے ماخذ ہے جس کے معنی اثنین یعنی دو ہیں۔ ابوشکور بلخی کو مثنوی کا موجد مانا گیا ہے۔ آفرین نامہ کے علاوہ بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ اس طرح اردو میں طویل مثنویاں لکھی گئیں جن میں کدم راؤ، پدم راؤ قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں یہ صنف بہمنی سلطنت، قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں بھی خوب پروان چڑھی۔ یہاں تک جدید دور کے شعرأ نے بھی اس صنف کو استعمال کیا ہے جن میں قابل ذکر خواجہ الطاف حسین حالی، اقبال، جوش وغیرہ ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مثنوی: حسب وطن، موضوعات کے اعتبار سے ایک اضافہ ہے۔ حالی کے بعد اقبال کے یہاں مثنوی کا خوبصورت استعمال ملتا ہے ان کی مشہور نظم ساقی نامہ، مثنوی کی ہی صنف ہے۔ بیانیہ شاعری کے لئے مثنوی کی صنف سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اقبال کے بعد آنے والے شاعروں میں جوش نے اس صنف کو نئی عظمت بخشی ہے۔

سوال3. امیر خسرو کی شہرت کے اسباب قلمبند کیجئے؟

جواب: حضرت امیر خسرو اردو کے پہلے قابل ذکر شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر آپ فارسی کے شاعر تھے۔ آپنے اردو شاعری میں متنوع طریقے اختیار کیا جیسا کہ ایک مصرع فارسی لکھا اور ایک اردو۔ دوسرا یہ کہ آدھا مصرع فارسی کا اور آدھا اردو کا لکھا۔ تیسرا طریقہ یہ کہ دونوں مصرع اردو کے لائے۔ اس کے علاوہ آپ نے بہت سے سی پہیلیاں منسوب کی جاتی ہیں۔ جن میں کہہ مکرنیاں، بابل اور پنگھٹ کے گیت جیسا کہ

کاہے کو بیاہی بدیس دے لکھی بابل مورے

بھائیوں کو دینو محل دو محلے ہم کو دیا پردیس.....لکھی بابل مورے

یہی وہ امور ہیں جو امیر خسرو کی شہرت کے اسباب بنے۔

چار نشانی سوالات:

سوال1. نظیر اکبر آبادی کا تعارف بیان کیجئے؟

جواب: نام ولی اور تخلص نظیر تھا۔ 1735ء کو دہلی میں پیدا ہوئے کچھ عرصہ کے بعد آگرہ منتقل ہو گئے جو اس زمانہ میں اکبر آباد کہلاتا تھا۔ وہ بے حد خوش اور خوش دل تھے۔ انسانی زندگی اور معاشرت کے ہر پہلو پر ان کی نگاہ تھی۔ انہوں نے مفلسی، عید، شب برأت، دیوالی، برسات، گرمی وغیرہ موضوع پر نظمیں لکھی۔ جو بہت مقبول ہوئیں۔ انہوں نے کبھی کسی بادشاہ کے تعریف میں شعر نہیں کہے۔ ان کی زبان عوام کے لئے آسانی سے سمجھ میں آنے والی تھی۔ اسی لیے ان کی نصیحت آموز نظمیں فقیر گلی گلی گاتے پھرتے تھے۔

سوال2. آدمی نامہ میں نظیر نے انسان کے کس روپ کو ظاہر کیا ہے؟

جواب: آدمی نامہ میں نظیر نے انسان کے مختلف روپ کو ظاہر کیا ہے اور بتایا کہ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ مفلس، امیر، بادشاہ، فقیر، دولت مند، نعمت کھانے والا اور ٹکڑے مانگنے والا سب آدمی یں۔ فرعون جس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ شداد جس نے جنت بنائی تھی۔ یہ بھی آدمی ہیں۔ مسجد بنانے والا، امام خطبہ دینے والا، قرآن اور نماز پڑھنے والا آدمی ہے اور جو جوتیاں چراتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ اشرف، کمینہ، صاحب عزت اور حقیر سب آدمی ہیں۔ غرض دنیا میں سب سے اچھا بھی آدمی ہے اور سب سے برا بھی آدمی۔

سوال3. مسدس کی تعریف کیجئے اور مثال پیش کیجئے؟

جواب: مسدس وہ کہلاتا ہے کہ جس میں ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ جس کی مثال یہ ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی برلانے والا
مصیبت میں عنبروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
(حالؔی)

سوال4. کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں: خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں
مندرجہ ذیل بالا شعر میں حالی نے ہمیں کن چیزوں کی نصیحت کی ہے؟

جواب: اس شعر میں حالی نے انسانوں کو نصیحت کی ہے کہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نہ کسی کے آگے سر جھکائیں اور نہ ہی کسی کے محتاج بنیں بلکہ کوئی نہ کوئی پیشہ اپنا کر اپنی مدد آپ کریں اور اپنا وسیلہ خود بننے کی کوشش کریں۔

دونشانی سوالات:

سوال1. نظم معرا کی تعریف کرتے ہوئے بتلایئے کہ درج ذیل شعر نظم کی کس صنف میں داخل ہے۔

پھر کوئی آیا دل راز نہیں کوئی نہیں
راہ روہوگا کہیں اور دچلا جائے گا

جواب: نظم معرا ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے تمام مصرع برابر کے ہوں مگر ان میں قافیہ نہ ہو۔ مندرجہ بالا شعر نظم معرا ہے۔

سوال2. نظم معرا اور آزاد نظم کو فروغ دینے والے اہم شعرأ کے نام بتلایئے؟

جواب: نظم معرا اور آزاد نظم کو فروغ دینے والے اہم شعرأ کے نام ے ہیں۔
میراجؔی، ن. م. راشدؔ، فیض احمد فیضؔ اور اختر الایمان وغیرہ۔

سوال3. نظم مدجزرِ اسلام کس نے لکھی اور اسے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے؟

جواب: نظم مدجزر اسلام مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی اور اس نظم کو عام طور پر مسدس حالی کہا جاتا ہے۔

سوال4. کتاب نورس میں شاعر کے کس ذوق کو ظاہر کیا گیا ہے؟

جواب: کتاب نورس میں ذوق شاعری اور ذوق موسیقی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق الگ الگ گیت ترتیب دیئے گئے ہیں۔

سوال5. شہر آشوب کی تعریف کیجئے؟

جواب: شہر آشوب اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی تباہی گردشِ آسمانی اور زمانے کی ناقدردانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک نشانی سوالات خالی جگہوں کو پر کیجئے

سوال1. پنڈت ہرج نرائن کا تخلص.....ہے۔

سوال2. مدوجزا اسلام.....کی نظم ہے۔

سوال3. قطب شتری.....داستان ہے۔

سوال4. ساقی نامہ.....کی مشہور نظم ہے۔

جوابات:1. چکبست 2. حالی 3. عشقیہ 4. اقبال

ایک نشانی سوالات کی ضد لکھئے۔

1. ترقی	2. نظم	3. تہذیب	4. صبح

جوابات:1. تنزل 2. نثر 3. بدتہذیب 4. شام

12 : نظم نئی تہذیب

اکبرالہ آبادی

آٹھ نشانی سوالات:

سوال1. اکبرالہ آبادی کی نظم ''نئی تہذیب'' کا خلاصہ لکھئے؟

جواب: اکبرالہ آبادی ''نئی دہذیب'' نظم کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قدیم مشرقی تہذیب بہت جلد ختم ہوجائے گی اور مغربی تہذیب چھاجائے گی تو خواتین بال کٹوائیں گی۔ پردے کی پابندی باقی نہیں رہے گی اکثریت انگریزی کلچر کی دیوانی بن جائے گی۔شریف لوگ کم ہوجائیں گے۔اردو زبان کی خصوصیات باقی نہیں رہے گی انگریزی سے مل کر اردو اپنی اصلیت کو کھودے گی۔افسوس تو یہ ہے کہ اہل اردو کو اس کا غم بھی نہ ہوگا۔ایسے میں شاعر کہتا ہے کہ غم کرنے سے بھی کیا حاصل دیکھتے ہی دیکھتے ہم اور وہ دنیا سے چلے جائیں گے نہ مغربی تہذیب کے دلدادہ رہیں گے اور نہ اس کا غم کھانے والے۔

سوال2. ذیل میں دیئے گئے شعر کی بحوالہ متن تشریح کیجئے؟

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھا جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

جواب: اکبر اپنی نظم نئی تہذیب کے عنوان کے تحت کہتے ہیں کہ آنے والے دور میں موجودہ دور کے آداب بدل جائیں گے۔ یہاں تک کہ آج جو شرافت ہے کل وہ حماقت نظر آئے گی۔آج جو قدر والے ہیں وہ ناقدر ٹھہریں گے۔جن کی زندگیوں کو قابل تقلید سمجھا جاتا ہے کل ان ہی کی زندگی نا قابل تقلید ہوگی۔آج جو خوب ہے کل وہ ناخوب ٹھہرے گا۔

سوال3. درج ذیل شعر کی بحوالہ متن تشریح کیجئے؟

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

جواب: اس شعر کو نئی تہذیب سے لیا گیا ہے۔اس میں شاعر کہتا ہے کہ ہر زبان اپنی اصطلاحوں اور استعاروں سے باقی رہتی ہے۔اصطلاحیں بدل جائیں یا اجنبی زمانوں سے غلط ملط ہوجائیں تو زبان کی خصوصیات اور چاشنی ختم ہوجاتی ہے۔شاعر کو اندیشہ ہے کہ انگریزی زبان کا رواج ہوجائے گا۔اردو زبان میں انگریزی الفاظ

اور اصطلاحات داخل ہو جائیں گی تو اردو کی اصلیت بھی باقی نہیں رہے گی۔ اردو والے نہ اردو سلیقہ کی بولیں گے اور نہ انگریزی بلکہ ان کی اردو انگریزی کو لبادہ اوڑھے ہوئے ہوگی۔ موجودہ دور میں شاعر کی اس اندازے کو ہم پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں۔

سوال 4. اکبرالہ آبادی نے نظم نئی تہذیب میں کن چیزوں پر طنز کیا ہے؟

جواب: نئی نسل کو انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کرتے ہوئے دیکھ کر اکبر کہتے ہیں کہ بہت جلد ہندوستانی تہذیب ختم ہو جائے گی اور ہندوستان کے لوگ اپنے طور طریقوں اور رہن سہن کو چھوڑ کر انگریزوں کے طور طریقوں کو اپنا لیں گے۔ لوگ بغیر سوچے سمجھے انگریزی تہذیب و تمدن میں اپنے آپ کو ڈھال لیں گے گویا کہ صرف نام کے ہندوستانی رہ جائیں گے اور عادت و اطوار سب کچھ انگریزی تہذیب کے مطابق ہوگا اور جب سب کچھ انگریزی تہذیب کے مطابق ہو جائے گا تو شرم و حیاء جو عورت کا زیور ہے اور لمبی کالی زلفیں جو کہ عورت کی خوبصورتی کی علامت ہے یہ سب ختم ہو جائے گی کیونکہ انگریزی ان دونوں کو دقیانوسی چیزیں قرار دیتے ہیں۔

سوال 5. اکبرالہ آبادی بحیثیت نکتہ چین تعارف کیجئے؟

جواب: اکبر کی شاعری کے نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا فخر سمجھتے تھے۔ یوروپی نام، یورپی لباس، یورپی طعام، یورپی وضع قطع مرغوب خاطر تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پا لیا تھا۔ اس کے انجام کے واقف کاروں میں اکبرالہ آبادی بھی تھے۔ جنہوں نے اپنی نظم کے ذریعہ اس زمانے کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور انہوں نے ان تیز رفتار لوگوں کو جو شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا۔

چار نشانی سوالات:

درج ذیل شعر کی بحوالہ متن تشریح کیجئے۔

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

جواب: اس شعر کو نئی تہذیب نظم سے لیا گیا ہے جس کے شاعر اکبرالہ آبادی ہیں اس شعر کے ذریعے شاعر جس تہذیب و تمدن کی آمد کا تذکرہ کر رہا ہے۔ منجملہ خصوصیات میں اس کی ایک خصوصیت یہ بھی بتا رہا ہے کہ اس

تہذیب کی وجہ سے عورتیں بے حجاب ہو جائیں گی اور پردہ کی قید و بند سے بے پردہ اور آزاد ہو جائیں گی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جب شرم و حیا ختم ہو جائے تو جو دل میں آئے وہ کرو اور جب معاملہ ایسا ہو تو عاشق مزاج لوگوں کی عید ہو جائے گی کیونکہ وہ اپنے محبوب کا بے روک ٹوک دیدار کر سکیں گے۔

سوال 2.

بہت ہوں گے مغنی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوٹ ہوں گے اس لیے بے تاب وسم ہوں گے

جواب: بے تال وسم: موسیقی کی ایک اصطلاح ہے اس کے معنی سر اور تال کے ہیں اس شر کے ذریعہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ آج کی نوجوان نسل مغربی تہذیب کی ایسی اندھی تقلید کر رہی ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلایت ختم ہو گئی ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ کانوں کو اڑنے والی موسیقی اور بے سر گانے ہر طرف سنائی دینے لگے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کو بول کر بے سر اور تال والی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگی ہے۔

III. دو نشانی سوالات۔

سوال 1. اکبر الہ آبادی کس طرح کے شاعر تھے مثال کے ذریعے واضح کیجئے۔

جواب: اکبر الہ آبادی طنزیہ اور مزاحیہ شاعر تھے۔ مثلاً

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

سوال 2. مترادف کی تعریف کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ واضح کیجئے۔

جواب: ہم معنی الفاظ کو مترادف کہتے ہیں۔ مثلاً زلف، گیسو، مغنی، گلوکار، شور، غل وغیرہ۔

سوال 3. اکبر الہ آبادی نے اپنی نظم نئی تہذیب میں زبان اردو کیلئے کونسا لفظ استعمال کیا ہے؟

جواب: اکبر الہ آبادی نے اپنی نظم تہذیب میں اردو کے لئے بھاکا لفظ استعمال کیا ہے۔

سوال 4. اکبر الہ آبادی کی نظم نئی تہذیب کا مقطع پیش کیجئے۔

جواب: اکبر الہ آبادی کی نظم نئی تہذیب کا مقطع یہ ہے۔

تمہیں اس انقلاب دہر کا کہا غم ہے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

13 : پرچھائیاں

ساحرلدھیانوی

آٹھ نشانی سوالات:

سوال 1. ساحرلدھیانوی کی نظم پرچھائیاں کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: ساحر نے پرچھائیاں طویل نظم کو جنگ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھا ہے۔ اپنی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ اگر انگریز ہم ہندوستانیوں کو زبردستی جنگ میں جھونکنے کی کوشش کرے گا تو ہم اور ہمارے ساتھ ملک کی ہوائیں اور پیڑ پودے تک انگریزوں کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ ہمارا ملک امن وشانتی کا ملک ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں۔ لڑنا بھڑنا ہمارا کام نہیں۔ پہلی جنگ عظیم کا نقصان ہمارے سامنے ہے۔ مزید نقصان ہم نہیں چاہتے۔ ایٹم بم جو تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے جس کو بنا کر سائنسداں خوش ہیں خدانخواستہ اگر اس کا استعمال ہو جائے تو بے حد وحساب جان و مال کے نقصان کے علاوہ سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور یہ انسانی زندگی کا عظیم نقصان ہوگا۔

سوال 2. شاعر نظم پرچھائیاں کے ذریع سے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب: شاعر اس نظم سے برطانوی حکومت کو قاتل قرار دیا ہے کیونکہ اس نے ہندوستانیوں کو زبردستی جنگ میں بھیجا تھا اگر آئندہ اس نے ایسی جرأت کی تو ہم اس کا دنداں شکن جواب دیں گے کیونکہ ہندوستان امن وشانتی کا ملک ہے اور جو اس ملک کو تباہی و بربادی کے گہرے غار میں ڈھکیلے گا ہم اس کو نہیں بخشیں گے۔ اتنی تباہی و بربادی کے بعد بھی ہم زبان نہیں کھولے اور ظلم وستم سہتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ہم سب کو ایسا وقت آنے سے پہلے ہی ہوشیار ہو جانا چاہئے اور سب کو مل کر جنگ کی مخالفت کرنا چاہئے۔

شوال 3. شاعر کے طرز بیان پر روشنی ڈالئے؟

جواب: شاعر نے اس انداز سے برطانوی حکومت کو لتاڑا ہے کہ یہ جو تم نے ہم ہندوستانیوں کو جنگ کرنے کے لیے زبردستی کی ہے اگر آئندہ ایسا کیا تو صرف یہ کہ نہ ہم تمہاری بات مانیں گے بلکہ اس کا جواب بھی دیں گے گویا کہ شاعر نے برطانوی حکومت کو دھمکایا ہے کیونکہ ہم گوتم اور گرونانک کی سرزمین میں رہتے ہیں اور انہوں

نے امن وشانتی کا سبق دیا۔لہٰذا ہم محبت ہی سے رہیں گے جنگ وجدال اورقتل وقتال کا بازار گرم نہیں کریں گے۔شاعر نے انسانی جذبات وخیالات کوخوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہےان کے کلام میں تکلف وتصنع نہیں پایاجاتا۔

II. چارنشانی سوالات:

.1

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دہکتے خاک داں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمین کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

مندرجہ بالا اشعار کے ذریعہ شاعر کیا پیغام دینا چاہتا ہے۔

جواب: ان اشعار کے ذریعہ یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اگر آج ہم ظلم وستم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرلیں اورزبان نہیں کھولیں تو ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ دنیا ہی ختم ہوجائے گی اور سائنس داں جوخوش نظر آرہے ہیں کہ ہم ایٹم بم بنالئے ہیں اس پرخوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تو پاگل نہیں ہے۔ایسی خطرناک چیز کی ایجاد کی ہے کہ اگران کواستعمال کیا گیا تو یہ خوبصورت اور چمک دار دنیا راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوجائے گی۔

سوال2. درج ذیل شعر کی بحوالہ تشریح کیجئے۔

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی

جواب: انگریز ہمارے ملک پر ناجائز قابض تھےاور ہم ہندوستانیوں کوزبردستی جنگوں میں بھیجا کرتے تھے۔ جس میں ہزاروں جانیں ضائع ہوتی تھیں۔جس کی وجہ ہمارا سکون غارت ہوجاتا تھا۔شاعر انگریزوں کے اس عمل کوقتل سے تعبیر کرتے ہوئے برطانوی حکمرانوں کوقاتل ٹھہرارہا ہےاور کہہ رہا ہے کہ آئندہ یہ ظالم حکمراں ہمارا اس طرح استحصال کریں گےتو ہم ان کا ناطقہ تنگ اور جینا دوبھر کردیں گے خیر اسی میں ہے کہ وہ یہاں سے خاموشی کے ساتھ چلے جائیں۔

سوال3. درج ذیل اشعار کی بحوالہ متن تشریح کیجئے۔

گزشتہ جنگ میں گھر چلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیں بھی جل جائیں

جواب: یہ نظم کا آخری بند ہے جس میں شاعر پچھلی جنگ کی ہولنا کی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پچھلی جنگ میں کثیر جان و مال اور گھر و بار کا زیاں ہوا تھا مگر اس جنگ میں قوی اندیشہ ہے کہ ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے یا پھر ایسے معذور و مجبور بنا دیئے جائیں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔ ہمتیں پست ہو جائیں۔ زندگی پر مایوسی چھا جائے۔ لہٰذا ہم ہندوستانیوں کو متحد و متفق ہو کر انگریزوں کی مخالفت کرنا چاہئے تا کہ آزاد فضاء میں ہم پرسکون زندگی گزار سکیں۔

دو نشانی سوالات:

سوال 1. ہمارا خون کس کی امانت ہے؟

جواب: ہمارا خون نسل نو کی امانت ہے۔

سوال 2. گوتم بدھ اور نانک کی سرزمین کہنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: گوتم بدھ نانک کی سرزمین کہنے سے مراد ہندوستان ہے جہاں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جس نے ساری دنیا کو امن و شانتی اور بھائی چارگی کا پیغام سنایا۔ یہی وہ بھائی چارگی ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔

سوال 3. اس شعر کو پورا کیجئے؟

ہمارا خون امانت ہے نسل نو کیلئے

جواب: ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی۔

سوال 4. ذیل میں دیئے گئے مصرعہ میں محاورہ کو ظاہر کرتے ہوئے اس کا مطلب سمجھایئے۔

تو ہر قدم پر زمیں تنگ ہوتی جائے گی

جواب: اس مصرعہ میں زمین تنگ ہونا محاورہ ہے جس کا مطلب جینا دشوار ہے۔

سوال5. تلمیح کی تعریف کرتے ہوئے شعر کے ذریعہ مثال پیش کیجئے۔

جواب: کلام میں کسی معروف قصے واقعہ یا کردار کے ذریعہ کسی خاص بات کی طرف اشارہ کیا جائے تو اس کو تلمیح کہتے ہیں۔

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارض پاک پر وحشی نہ چل سکیں کبھی

اس شعر میں شاعر گوتم اور نانک کے ذریعہ امن وشانتی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک نشانی سوالات:

سوال: درج ذیل الفاظ کی ضد لکھئے۔

1. خموشی 2. آسمان 3. نفرت 4. امانت

جوابات: 1. سکوت 2. زمین 3. محبت 4. خیانت

14 : چاند اور تاروں کا بن

مخدوم محی الدین

آٹھ نشانی سوالات:

سوال 1. نظم چاند تاروں کا بن کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جواب: شاعر کہتا ہے کہ ہمارے ملک کو آزادی آسانی سے حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑی ہیں اور طرح طرح کے مصیبتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جب آزادی مل گئی تو ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ تقسیم کے دوان قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں اور آزادی ملنے کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ شاعر کہتا ہے کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا مگر جو کچھ بچا ہے اس کو ٹھیک کرلو اور اپنے ملک کو ترقی کی طرف گامزن کرنے کے لئے خوب محنت کرو۔

سوال 2. کیا نظم چاند تاروں کا بن آزاد نظم ہے۔ دلیل کے ساتھ واضح کیجئے۔

جواب: نظم چاند تاروں کا بن ایک آزاد نظم ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نظم میں قافیے کی پابندی نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے تمام مصرعے برابر ہیں اور آزاد نظم کہتے ہی ہیں اسکو جس میں قافے کی رعایت نہ کی گئی ہو یعنی نظم میں بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی نہ کی گئی ہو اور یہی سب کچھ اس نظم میں موجود ہے۔

سوال 3. درج ذیل بند کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھئے کہ علامتی نظم کس نظم کو کہتے ہیں۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن

جواب: مندرجہ بالا بند کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے ملک کو جو آزادی ملی ہے وہ آسانی سے نہیں ملی ہے بلکہ اس آزادی کے لئے بڑی بڑی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ تمام ہندوستانیوں نے مسائل و مشکلات کو خندہ پیشانی سے نہ صرف برداشت کیا بلکہ وہ اپنی ان قربانیوں پر خوش تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ آزادی کے لیے راتوں کی نیند حرام کی۔ جاگتے جاگتے آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ وہ آزادی کی روشنی کے لیے موم کی طرح جلتے رہے۔ تب کہیں آزادی حاصل ہوئی۔ علامتی نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جو استعارے میں لکھی گئی ہو نظم چاند تاروں کا بن استعارے میں لکھی گئی ہے اس لیے یہ نظم علامتی نظم کہلائے گی۔

چار نشانی سوالات:

سوال 1. مندرجہ ذیل اشعار کی بحوالہ متن تشریح کیجئے

ستیاں ختم مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوار غم بن گئے
خارزار الم بن گئے
رات کی شہ گوں کا چھلتا ہو
جوئے خوں بن گیا
رات کی تل چھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے

جواب: یہ اشعار مخدوم کی نظم چاند تاروں کے بن لئے گئے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ بڑی قربانیوں کے بعد ملک کو آزادی ملی مگر افسوس کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فساد کا بازار گرم ہوگیا۔ ہزاروں جانیں فساد کی نذر ہوگئیں۔ ساری مسرتیں غم میں بدل گئیں۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ کیا ہم نے اسی دن کے لیے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ آزادی سے کیا کیا امیدیں آرزوئیں وابستہ تھیں مگر وہ سب کیا ہوئیں کیا یہ خواب تھا جو شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا؟

سوال 2. مندرجہ ذیل اشعار کی بحوال متن تشریح کیجئے۔

ہم دمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دل دار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

جواب: یہ اشعار چاند تاروں کا بن سے لئے گئے ہیں۔فرقہ وارانہ فساد کو دیکھ شاعر کا دل مغموم ہے مگر وہ اپنے آپ کو سبھالتے ہوئے کہا ہے اے میرے ہم وطن بھائیو مایوس نہ ہو جاؤ حوصلوں کو پست ہونے نہ دو۔ کمر ہمت باندھو، پچھتانے سے کچھ ہونے والا نہیں جو کچھ ہے اس کو سنوارنے میں لگ جاؤ۔ ہمارے ملک کے مسائل بہت ہیں۔ یہ یوں ہی حل ہونے والے نہیں اس کے لیے سخت محنت اور جدو جہد کرنی ہے بلکہ جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے بھی ہمیشہ ہمیں تیار رہنا چاہئے۔

دو نشانی سوالات:

سوال 1. دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو سے مراد یہ ہے کہ ملک کی ترقی کے لئے ہر تکلیف اور غم اٹھانے کے لیے تیار رہیں۔

سوال 2. سوئے منزل چلو سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: سوئے منزل چلو سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ ملک کی بہتری اور ترقی کے بارے میں ہمہ وقت غور وفکر کریں۔

سوال 3. صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے کا مطلب کیا ہے؟

جواب: صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے کا مطلب یہ ہے کہ آزادی کی صبح تقسیم ملک کی وجہ سے لوگ رنجیدہ ہو گئے ہیں۔

سوال4. استعارہ کی تعریف کرتے ہوئے نظم چاند تاروں کے بن سے مثال دیجئے؟

جواب: استعارہ کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اپنے لغوی معنی ترک کر کے سیاق سباق کے اعتبار سے معنی لئے جائیں۔

مثلا1) مستیاں، مدہوشیاں، بانکپن، خوشی کے استعارے ہیں۔2) صبح دم، آزادی کی صبح کا استعارہ ہے۔3) دیوارِ غم اور خارزارِ الم، غم کے استعارے ہیں۔

سوال5. درج ذیل شعر کو مکمل کیجئے۔

موم کی طرح جلتے رہے شہیدوں کے تن

جواب: موم کی طرح جلتے رہے شہیدوں کے تن: رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن

15 : خاک وطن

جاں نثار اختر

آٹھ نشانی سوالات:

سوال 1. نظم ''خاک وطن'' کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جواب: اس نظم کے ہر شعر سے وطن کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ وطن کی محبت ایک فطری امر ہے۔ شاعر اس نظم کے پہلے اور دوسرے بند کے ذریعہ اپنے وطن کے دنوں رات، شہر اور گاؤں، عمارتوں، روایتوں کی تعریف کر رہا ہے۔ ہمالہ پہاڑ کی چوٹیوں پر فخر کرتے ہوئے اس کی سلامتی کی دعا کر رہا ہے۔ گنگوتری ندی کے ٹیڑھے میڑھے بہنے کو محبوبہ کی گھنگریالے زلفوں سے تشبیہ دے رہا ہے۔ نیز گنگا جمنا میں نہا کر پوتر بن جانا اور چاند کی چاندنی میں ماحول کا ٹھنڈا ہو جانا اور یہاں کے رسم و رواج اس کو بہت پسند ہیں۔

تیسرے بند میں شاعر صبح بنارس، شام اودھ، نینی تال کے کنول، اور محبت کی عظیم نشانی تاج محل، ور اجنتا کے بتوں کو یاد کر کے ہندوستانی روایات کی بقاء کا آرزومند ہو رہا ہے۔ چوتھے بند میں لہلہاتی کھیتیاں، باغات بالخصوص آموں سے لدے درخت، پودوں کو لگاتی ہوئی اور فصلوں کو کاٹتی ہوئی عورتوں کا گنگنانا، بچیوں کا باغوں میں جھولے ڈال کر جھولنا ہر کسی کے دل کو بھاتا ہے۔ ان مناظر کو اس انداز میں شاعر نے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی گاؤں میں یہ سب دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

پانچویں بند میں دیوالی کی جگمگ، بسنت میلے کی دھوم، خوبصورت راکھیاں، مشرقی عورتوں کی حیاء، بڑوں کا ادب، بچوں سے پیار، یہ ہمارے ملک کی پہچان ہے جس کے برقرار رہنے کی شاعر تمنا کر رہا ہے۔

چھٹے بند میں شاعر حیا بھری آنکھیں گھونگھٹوں کی تعریف کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ ہماری خواتین کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح ہیر رانجھا کا سچا عشق ایک مثالی عشق ہے۔ جس طرح لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی محبت ایک مثالی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں جن کی سلامتی کا شاعر خواہشمند ہے۔

ساتویں بند میں شاعر کی تمنا یہ ہے کہ یہاں محبت کے چشمے ابلتے ہیں۔ ٹیگور، اقبال کا فلسفہ، پریم چند کا

ادب، غالب کی غزل اس ملک میں ہمیشہ پڑھی جاتی رہے۔ ہندوستان کی عظمت اور اس کی شان وشوکت قائم و دائم رہے۔

سوال 2. کسی جذبہ کے تحت شاعر نے خاک وطن نظم لکھی۔

جواب: شاعر نے حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہوکر یہ نظم لکھی ہے اور اپنے ملک کی قابل فخر چیزوں کا ذکر کیا ہے اس کے ایک ایک شعر سے محبت کی کرن پھوٹتی ہے اور یہ محبت کی ہی علامت ہے کہ شاعر ملک سے منسوب ہر چیز کی تعریف کرتا ہے اس کے رسم و رواج عمارات، تیوہار وغیرہ ہر چیز کو پسندیدہ قرار دیا ہے کیونکہ جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس سے منسوب ہر چیز اس سے محبت کرنے لگت ہے یہی سچے عاشق کی پہچان ہے۔

سوال 3. درج ذیل اشعار سے شاعر کی کیا مراد ہے۔

سلامت رہے اپنے دشمت ودمن
رہے گنگنا تا ہمارا گگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہے
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلف گنگ وجمن
رہے جگمگا تا یہ سنگم کا روپ
چمکتی خنک چاندنی نرم دھوپ

جواب: شاعرانہ اشعار کے ذریعہ اللہ سے دعا کرر ہا ہے کہ اس ملک کے جنگل و بیابان کو ہمیشہ سلامت رکھ ہمالیہ کی بلندی پر فخر کرتے ہوئے ہمیشہ اس کو بلند رہنے کی دعا مانگ رہا ہے اور مبالغہ آرائی کرتے ہوئے چاند تاروں کو چھونے کی بات کرتا ہے اور اپنے ملک کے رسم کو شاعر اتنا پسند کرر ہا ہے کہ اس کی سلامتی اور پائیداری کے لیے دعا کرر ہا ہوں۔

چار نشانی سوالات:

سوال 1. درج ذیل اشعار کی بحوالہ متن تشریح کیجئے۔

محبت کے چشمے ابلتے رہیں
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں
رہے دھوم ٹیگور و اقبال کی
رہے شا پنجاب و بنگال کی
رہے نام اپنے ادب کا بلند
دلوں میں سمایا رہے پریم چند
سدازندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالب کا دیوان رہے

جواب: نظم کے اس آخری حصے میں ہندوستان کی اہم شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کی تمنا ہے کہ یہاں محبت کے چشمے ابلتے رہیں، ٹیگور، اقبال کا فلسفہ پریم چند کا ادب غالب کی غزل ہمیشہ پڑھی جاتی رہے۔ ہندوستان کی عظمت اور اس کی شان وشوکت قائم دائم رہے۔

سوال 2. درج ذیل اشعار کے بند کو مکمل کیجئے۔

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار

جواب:

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنے صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار

سوال 3. درج ذیل اشعار کی بحوالہ متن تشریح کیجئے۔

لٹاتی رہیں اپنے نینوں کے مدھ
یہ صبح بنارس یہ شام اودھ
رہیں سرخرو سیکری کے محل

یہ نینی کے جھیلوں میں کھلتے کنول
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج
اجنتا کے بت رقص کرتے رہیں
حسین غار تاروں سے بھرتے رہیں

جواب: یہ اشعار نظم خاک وطن سے لئے گئے ہیں۔ان اشعار کے ذریعہ شاعر کچھ مشہور مقامات کا عمارتوں اور فن تعمیر کی شاہکاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سلامتی کے لئے دعا گو ہے۔شاعر اس بند میں صبح بنارس، شام اودھ، نینی تال کے کنول اور محبت کی عظیم نشانی، تاج محل اور اجنتا کے بتوں کو یاد کر کے ہندوستانی روایت کی بقاء کا آرزومند ہے۔

دونشانی سوالات:

سوال 1. درج ذیل مرکبات ہم معنی ہیں یا متضاد واضح کیجئے۔

1) روز وشب

2) سرت وخوشی

3) شوروغل

جوابات: 1) متضاد 2) ہم معنی 3) ہم معنی

سوال 2. صنعت تضاد کی تعریف کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ وضاحت کیجئے۔

جواب: کسی شعر کے ایک مصرعہ یا دونوں میں ایسے لفظ کا ذکر کرنا جو آپس میں متضاد ہوں صنعت تضاد کہلاتا ہے۔

مہکتا رہے سبز میدان میں دھان
زمینوں میں بجھتے رہیں آسماں

مذکورہ شعر میں آسمان اور زمین ایک ہی مصرعہ میں استعمال کئے گئے ہیں جو کہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔لہٰذا یہ صنعت تضاد کہلائے گا۔

ایک نشانی سوالات:

ایک نشانی سوالات الفاظ معنی

	جوابات
گگن	آسمان
دشت	جنگل
نین	آنکھ
سرخرو	کامیاب
ہلال	پہلی تاریخ کا چاند
تقدس	پاکیزگی

16 : اردو غزل کا ارتقاء

سوال 1. غزل کی تعریف کیجئے اور اس کے آغاز کے بارے میں لکھئے۔

جواب: اردو شاعری کی مقبول صنف غزل ہے۔ غزل یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی عشق و رومان کی باتیں کرنا ہے۔ لیکن غزل صرف لفظی معنوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ غزل گو شعرا نے غزل کے دامن میں مختلف موضوعات اور مضامین سے ہمکنار کیا۔ غزل میں ہر دور میں زندگی کے ہر گوشہ کو موضوع بنانے کی صلاحیت ہمیشہ رہی ہے۔ اسی لئے یہ انسانی زندگی سے بہت قریب ہے۔ یہ ایسی صنف سخن ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس کے اشعار کا تعلق براہ راست دل سے ہوتا ہے۔ دراصل غزل دلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے۔

غزل کی ابتداء قصیدے سے ہوئی۔ قصیدے کے ابتدائی حصے نشیب میں شاعر عام طور پر حسن و شباب اور بہار کا ذکر کرتا ہے۔ عربی قصیدہ ایران پہنچا تو فارسی میں اسی طرز پر قصیدے کہے جانے لگے۔ بعد میں یہ قصیدے کا ابتدائی حصہ الگ سے شاعری کی ایک مقبول عام صنف یعنی غزل کہلانے لگا۔ اسی مناسبت سے عشق و محبت کی باتیں اس کے لیے ضروری سمجھی جانے لگی۔ اس کے لیے باقاعدہ الفاظ کا الگ نظام بنایا گیا۔ اس کی علامتیں اور ترکیبیں الگ ہوگئیں۔ فارسی سے غزل اردو میں آئی تو یہ تمام چیزیں روایتی طور پر جو فارسی میں اس کی خصوصیت تھیں اردو میں بھی اس کا ورثہ بن گئیں لیکن اردو شاعروں نے بہت جلد اس زندہ صنف سخن کو اپنے ماحول میں ایسا ڈھالا کہ یہ پوری طرح ہندوستانی رنگ میں رنگ گئی اور یہی کی تہذیب کی پہچان بن گئی۔ غزل کی اس خوبی کی وجہ سے ہی رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔

اردو غزل نے ہندوستانی ماحول میں مختلف تحریکوں، رجحانات، سیاسی و سماجی اثرات کے نشیب و فراز سے گزری۔ ہر عہد کے اردو شعرا نے غزل کو اپنے جذبات، کیفیات اور حالات کا ترجمان بنایا۔ اس کو خوبصورت اور دلکش لہجہ دیا۔ اس لئے غزل نے زندگی کے ہر موڑ پر ہمارا ساتھ دیا ہے اور جذبہ عشق غزل کا محور ہے۔

سوال 2. اردو غزل کی خصوصیات بیان کیجئے ؟

جواب: غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہر دور میں غزل ایک مقبول صنف سخن رہی ہے۔ کیونکہ غزل کے اشعار کا تعلق براہ رات دل سے ہوتا ہے۔ دراصل غزل دلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ شاعر کے دل کی آواز قاری کے دل کی ڈھرکن بن جاتی ہے۔ شعر کی یہ خوبی آفافیت کہلاتی ہے۔

غزل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر مضمون کے لحاظ سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ اس کے ایک شعر سے دوسرے شعر کا تعلق نہیں ہوتا ہے۔ الگ الگ کیفیات، جذبات، وادوات قلبی کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم کی طرح مسلسل نہیں ہوتی۔ تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہا جاتا ہے۔ مطلع سے مراد طلوع ہونے کے ہیں یعنی غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر دوسرے شعر میں بھی ایسا ہی ہم قافیہ ہی ہوتو اسے حسن مطلع کہا جاتا ہے۔ آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں جو عموماً غزل کے اختتام کی علامت ہے اور غزل کے سب سے اچھے شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہا جاتا ہے۔ پانچ، سات اور گیارہ اشعار کی غزل اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اگر چہ پرانے شاعروں کے یہاں طویل غزلیں، دوغزلے اور سرغزلے کہنے کا بھی رواج تھا مگر یہ اب یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اختصار اور تہہ داری غزل کی خوبی ہے۔

غزل شاعر کے جذبات قلبی، واردات کیفیات اور حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ نرمی، تازگی، سادگی، شیرینی، بے ساختگی، لطافت اور نغمگی غزل کی خصوصیات ہیں۔ جذبہ عشق غزل کا محور ہے اور اخلیت غزل کا ایک اور وصف ہے۔ اس میں احساس کی شدت دیگر اصناف سخن کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار سننے کے بعد زبان سے آہ، یا واہ کا نکلنا فطری بات ہے۔

غزل کا ایک اور اہم وصف اشارتی انداز ہے اس صنف میں تشریح و توضیح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ غزل کی ہیئت یا اجزائے ترکیبی مطلع، مقطع، ردیف اور قافیہ ہیں۔ غزل کی علامتیں، اشارے، تلمیحات، موز و گداز، جذب و سرمستی، زبان کی گھلاوٹ اور نغمگی کا نام تغزل ہے۔ غزل و تغزل ایک دوسرے کے لیے ضروری ہے۔ مخصوص بحروں سے غزل کی نغمگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دراصل شاعر اپنے جذبات و تاثرات کو بحر و وزن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

غزل میں استعمال ہونے والی علامات اور تراکیب مثلاً شراب، ساغر، میخانہ، ساقی، قفس، صیاد، گل چیں

اور دارورسن وغیرہ کو وقت اور ماحول کے مطابق برت کر غزل میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔اس کی تہہ داری اور لطافت کو اس حد تک بڑھایا کہ مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی کے قول کے مطابق غزل اس مقام پر پہنچ گئی۔

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

3. دکن میں اردو غزل کے فروغ کا جائزہ لیجئے؟

جواب: اردو زبان پائے تخت دہلی سے نکل کر دکن کو پہنچی۔دکن کے پرسکون اور ہندوستانی ماحول میں اردو زبان کو ادب کا درجہ ملا۔ادبی تخلیقات منظر عام پر آئی۔مقامی بولیوں کے تال میل سے پھولنے کا موقع میسر آیا۔جنوبی ہند(دکن) کے علاقہ کی ادبی تخلیقات کو دکنی ادب یا قدیم اردو ادب (1400ء تا1700) کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتداء بارہویں صدی عیسوی میں ہوچکی تھی مگر اس پر فارسی زبان کے اثرات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔اردو غزل کی ترقی جس دور میں ہوئی وہ دکن (جنوبی ہند) میں 17,16 صدی کے زمانے میں ہوئی۔اس عہد میں عادل شاہی (بیجاپور سلطنت) اور قطب شاہی (گولکنڈہ سلطنت) خاندانوں نے غزل کی بہت سرپرستی کی۔

قطب شاہی عہد اردو کے فروغ کا سنہرا دور رہا۔اس سلطنت کے جملہ نو بادشاہ گزرے اور تمام کے تمام علم دوست اور محسن اردو ثابت ہوئے۔انہوں نے اردو ادب کو درباری سرپرستی کی۔بیرونی علماء اور شعرأ کو دکن آنے کی دعوت دی۔قطب شاہی خاندان کے تین بادشاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اردو کے خود اچھے غزل گو شاعر تھے۔

محمد قلی قطب شاہ! اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ تھا۔وہ بادشاہ وقت ہونے کے علاوہ ایک عوامی شاعر بھی تھا۔وہ فارسی، اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔یہ اردو میں قطب اور معانی تخلص کرتا تھا۔اس کے کلیات سب سے پہلے شائع ہوا۔اور اس میں پچاس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ان میں غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی روایات و رسوم اور مقامی تشبیہوں اور استعاروں کو فارسی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی

ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ان کی فن کاری ہے کہ انہوں نے فارسی اور ہندی دونوں رنگوں کو بڑی خوبصورتی سے غزل میں سمو کر اردو غزل کو دلکشی بخشی۔

دکن میں محمد قلی قطب شاہ اور دیگر غزل گو شعرا عبداللہ قطب شاہ، فلک نصرتی، بحری، ملا وجہی، حسن شوقی، ملک خوشنود، غوامی اور لطفی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل کو ہندوستانی رنگ دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کے لیے بڑی اچھی کوششیں کی ہیں۔

ولی دکنی: ولی دکنی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ولی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل نے انہیں شہرت عطاء کی۔ ولی کی غزل میں زبان کا زیادہ نکھرا ہوا روپ ملتا ہے۔ ان کے کلام میں رنگینی اور دل کشی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا تعلق براہ راست ان کی جذبات و احساسات اور تجربات سے ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تکلف یا بناوٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی حسن و عشق کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کے جذبات کی عکاسی کے لیے صداقت اور حقیقت سے کام لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی بڑے والہانہ انداز میں کی ہے۔

ولی کی غزلوں میں تازگی اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ عشق و محبت کی کیفیات، تصوف کے رموز اور زندگی کے مختلف تجربوں کو ولی نے بڑی فن کاری سے غزل میں سمویا۔ ان کے کلام میں فارسی، اور ہندی روایات کے دونوں دھاروں نے آپس میں مل کر جو رنگ اختیار کیا وہ ہندوستانی ہے۔

ولی دکنی دراصل دکن اور شمالی ہند کے ملاپ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شمالی ہند میں اردو غزل کی راہ ولی کے ذریعہ ہموار ہوئی یعنی ولی کے دلی آنے کے بعد یہاں کے شاعروں نے اردو غزل گوئی کی طرف توجہ دی۔

دکن میں اردو غزل کا تاریخی سفر نے آنے والے شاعروں کو مشعل راہ کا کام انجام دیا۔

4 Marks

1. 1857 کے بعد اردو غزل کا جائزہ لیجئے؟

جواب: 1857 غدر ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابی واقعہ ہے۔ جس کا اثر ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر پڑا۔ اور اسی طرح ادب بھی متاثر ہوا۔ 1857 میں اردو نئے دور میں داخل ہوئی۔

انیسویں صدی کے اس دور میں سیاسی، سماجی، ادبی ہر اعتبار سے بہت تبدیلیاں آئیں۔ مغربی علوم کی

آمداور جدید تہذیبی رویوں نے زندگی کی بہت سے اقدار کو بدل ڈالا تو شعروادب پر بھی اس کا خاصا اثر پڑا۔

اس دور میں شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایوانی اور جگر وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فن کاری سے اردو غزل کو زمانے اور زندگی کا ترجمان بنیا۔ پرانی روایات اور نئے تجربات کو ملا کر انہوں نے غزل کو احساس کی نئی قوت، جذبے کا خلوص، سچائی اور خیال کی پاکیزگی دی۔ پرانے مضامین کی جگہ نئے مسائل اور موضوعات کو غزل میں داخل کیا۔ حسرت نے سچے عاشقانہ جذبات کو پیش کر کے غزل کو سیاسی شعور دیا۔ ملکی اور قومی مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ جگر نے اردو غزل کو تغزل کی شیرینی اور ترنم سے مالا مال کیا۔ اصغر گونڈی نے تصوف کے مضامین سے وسعت پیدا کی ان کے یہاں فکر کی بلندی ہے۔ فانی بدایوانی نے اپنے غم و آلام کی آمیزش سے اردو غزل کو نیا احساس دیا۔ انہوں نے حیات اور غم کے فلسفے کو غزل میں سمویا۔

2. کن شاعروں نے اردو غزل کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا؟

جواب: اردو غزل ایک زندہ جاوید صنف ہے۔ جو ہر دور کے حالات و کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ کئی شاعروں نے غزل کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ زندگی کے نت نئے تجربوں کو اس میں شامل کر کے غزل کے لہجہ میں طاقت اور توانائی پیدا کی اور اس کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری، اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی اور علامہ اقبال خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فراق نے ریومالائی عناصر اور اساطیری روایات کو غزل کا حصہ بنایا اور غزل میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی۔ انہوں نے برج بھاشا کھڑی بولی اور اودھی کی تراکیب اور محاوروں کو غزل کی زبان میں استعمال کر کے اردو غزل کی زبان کو وسعت دی۔ اقبال نے اردو غزل کی نئی معنویت اور گہرائی دی۔ انہوں نے نئی فکر اور نیا لہجہ غزل میں اپنا کر اس کو فن کی بلندی پر پہنچایا۔ ان کی غزل کا تعلق صرف دلی جذبات سے نہیں، دماغ سے بھی ہے۔ انہوں نے خیال کی نئی راہیں دکھائیں۔

3. ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو غزل کے فروغ پر نوٹ لکھئے۔

جواب: اردو غزل کئی تحریکات، رجحانات اور حالات کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ ترقی پسند تحریک یہ ایک عالمی تحریک تھی جو دنیا کے دیگر زبانوں میں بھی شروع ہوئی۔ جس کا مقصد ادب کو زندگی سے قریب کرنا تھا۔ یہ تحریک ادب میں برائے زندگی کے نظریہ کو فروغ دیتی ہے۔ اس کا راست تعلق کمیونسٹ تحریک سے تھا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ کچھ شاعروں نے نئی تکنیک اور نئے تجربوں کو اپنایا تو کچھ نے قدیم روایات کی پابندی پر زور دیا۔ اشتراکی نظریات ادب میں جگہ پا گئے۔ ترقی پسند شاعروں کے ایک بڑے گروہ نے ادب کو پروپگنڈے کا ذریعہ بنایا۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد ملک میں ایک ایسے معاشی نظام کا قیام تھا جس میں دولت کی تقسیم برابر ہو اور انسانیت کا استحصال نہ ہو۔ غزل گو شعرأ نے بڑی حد تک ان مقاصد کی تکمیل کا کام غزل سے لیا۔

اس دور کے اہم شعرأ فراق، مجنوں، مجاز، مخدوم، سلام، اختر ایمان، مجروح سلطان پوری، تابان، جعفری، اختر، ساغر نظامی اور فیض احمد فیض وغیرہ اہم ہیں۔ ان سب نے غزل کی روایت کو نئے تجربات سے آشنا کیا۔ مگر ان میں فیض اور فراق کی آواز میں زیادہ توانائی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے غزل کو نیا مزاج اور نیا آہنگ دیا۔ فیض نے نرم لہجہ میں روایت اور بغاوت کو یکجا کیا۔ ان کی غزل میں فن کارانہ حسن اور شادابی ہے۔

4. ''ہماری پوری تہذیب غزل میں ہے اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے'' تبصرہ کیجئے؟

جواب: غزل ابتداء سے آج تک مختلف مرحلوں اور مختلف تجربوں سے گزرتی رہی ہے اور وہ کبھی بھی صرف اپنے لغوی معنی میں محدود نہیں رہی۔ اس میں لچک پائی جاتی ہے اس لیے اردو غزل تمام اصناف سخن میں زندہ جاوید صنف ہے۔

اردو غزل میں عشق و رومان کے قصے بیان کیے گئے تو کبھی پند و نصائح کا کام اس سے لیا گیا۔ کبھی وطن کی عظمت اور محبت کو غزل کا موضوع بنایا گیا۔ کبھی سرمایہ داری کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ کبھی معاشرے کی بے چینی اور کرب کو غزل نے آئینہ کر دیا۔ ہماری زندگی کی کامل ترجمانی کی ہے۔

اس لمبے تاریخی سفر میں غزل ہمیشہ اپنی روایات سے بھی جڑی۔ غم محبوب اور عشق کی کسک آج بھی غزل کا موضوع ہے۔ خیال کی وسعت کے ساتھ بیان کی رنگین لہجہ کا رس، جذبے کا رچاؤ، محبت کی گرلی اور حسن کی نرمی آج بھی غزل کی اہم خصوصیات میں شامل ہیں۔

غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری پوری تہذیب غزل میں ہے اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔

2 Marks

1. ایہام گوئی کسے کہتے ہیں۔

جواب: شعر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے دو معنی یا دو معنویت نکلتے ہیں۔ ایک قریب کے ایک دور کے۔ پڑھنے اور سننے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس معنی کو اخذ کرتا ہے۔ ایہام گوئی دراصل دہلی اسکول کے ابتداء کے دور کے شعرأ نے استعمال کی تا کہ شعری حسن میں اضافہ ہو جائے۔ دوسری وجہ اس وقت دہلی میں درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ دربار میں فارسی شعرأ ہی کو بلند مقام حاصل تھا۔ ریختہ (اردو) کے شعرأ کی ثانوی حیثیت تھی۔ اس لیے انہوں نے اشعار کو موثر بنانے کے لیے ایہام گوئی کا کثرت سے استعمال کیا۔ بعد میں مظہر جان جاناں نے اصلاح زبان تحریک کے زیر اثر ایہام گوئی کو ترک کروایا۔

2. ریختہ کی تعریف کیجئے؟

جواب: اردو زبان کو ابتداء سے آج تک مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ ریختہ، ہندوستانی، دکنی، کھڑی بولی وغیرہ۔ 1700ء سے قبل دہلی اور اس کے اطراف بولی جانے والی زبان کو ریختہ کہا جاتا تھا۔ ریختہ سے مراد یہ ہے کہ غزل میں فارسی الفاظ و افعال کے ساتھ ہندی الفاظ و افعال ملے جلے طور پر استعمال کئے گئے یعنی فارسی اور ہندی ایک دوسرے سے گھل مل کر غزل میں پیش ہوئی۔

3. ریختی سے کیا مراد ہے؟

جواب: ریختی شاعری کی قسم ہے۔ لکھنؤ اسکول کے شعرأ نے ایجاد کیا۔ ریختی شاعری کی وہ قسم ہے جو غزل میں عورتوں کے خیالات و جذبات کو عورتوں کے لہجے اور ان کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس ریختی کو انشاء اور رنگین نے رواج دیا۔

4. ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے دو شعرأ کے نام لکھئے؟

جواب: ترقی پسند تحریک کو سجاد ظہیر نے 1936ء میں شروع کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں اشتراکی نظریات کی راہ ہموار ہوئی۔ اس دور کے نامور شعرأ مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر اور مجاز ہیں۔

5. دلی اسکول کے چار غزل گو شعرأ کے نام لکھئے؟

جواب: دلی اسکول کے نامور شعرأ خواجہ میر درد، میر تقی میر، میر سوز، سودا، انشاء وغیرہ ہیں۔

6. غالب کی غزل گوئی پر نوٹ لکھئے؟

جواب: مرزا غالب اردو کے مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ غالب نے غزل کو نیا رنگ دیا۔ انہوں نے اردو غزل کو وسعت، پرکاری، سلاست اور سدانی، اختصار اور جامعیت فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی عطاء کی۔

1 Marks

1. غزل لفظ کس زبان کا ہے؟

جواب: لفظ غزل عربی زبان کا ہے۔

2. بیت الغزل کسے کہتے ہیں؟

جواب: غزل کے سب سے اچھے شعر کو بیت الغزل کہتے ہیں۔

3. غزل کے اجزائے ترکیبی لکھئے؟

جواب: غزل کے اجزائے ترکیبی 1. مطلع 2. مقطع 3. ردیف 4. قافیہ

4. اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟

جواب: اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔

5. اردو شاعری کا باوا آدم کسے کہا جاتا ہے؟

جواب: اردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی کو کہا جاتا ہے۔

6. خدائے سخن کون ہے؟

جواب: خدائے سخن میر تقی میر کو کہا جاتا ہے۔

7. غزل اردو شاعری کی آبرو ہے کس کا قول ہے؟

جواب: رشید احمد صدیقی۔

8. جنوبی ہند (دکن) کے کوئی دو شاعروں کا نام لکھئے؟

جواب: محمد قلی قطب شاہ وجہی اور نصرتی۔

9. دہلی میں تحریک اصلاح زبان کے بانی کون تھے؟

جواب: مرزا مظہر جان جاناں، حاتم۔

10. مغل بہادر شاہ ظفر کے استاد کون رہے؟

جواب: ذوق، غالب۔

11. شاعر مشرق کسے کہا جاتا ہے؟

جواب: علامہ اقبال۔

12. ترقی پسند تحریک کب شروع ہوئی؟

جواب: ترقی پسند تحریک 1936 کو شروع ہوئی۔

13. مرزا غالب کے ہم عصر شعرأ کے نام لکھئے؟

جواب: مرزا غالب کے ہم عصر شعرأ ذوق، مومن، شاہ ظفر اور شفیفتہ ہیں۔

14. 1857ء کو بعد اہم غزل گو شعرأ کے نام بتائیں؟

جواب: 1857ء کے بعد اہم غزل گو شعرأ حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایوانی اور جگر مرادآبادی ہیں۔

17 : میر تقی میر

(الٹی ہو گئیں سب تدبیریں)

8 Marks

1. میر تقی میر کو خدائے سخن کیوں کہا جاتا ہے؟ یا میر کی شاعرانہ خصوصیات لکھئے؟

جواب: میر تقی میر اردو کے مشہور اور عظیم شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت سی اصناف شعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت انہیں غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملی ہے۔

میر کا نام محمد تقی اور میر تخلص تھا وہ 1722 میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ میر کی زندگی شروع سے تنگی اور پریشانی میں گزری۔ وہ بہت ہی حساس انسان تھے۔ میر دلی میں ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے ہاں قیام کیا۔

اردو شاعری میں میر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں دردمندی، محرومی اور مٹتی ہوئی تہذیب کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں جس نے ان کے کلام میں گہرائی اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ قدرت نے انہیں ایک دردمند اور حساس دل عطاء کیا تھا۔ ان کے اشعار، ان کے دردمند دل کی آواز ہیں۔

میر کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ بول چال کی سادہ زبان میں شعر کہتے ہیں جو بظاہر ہر سادہ اور معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے اپنے اندر گہرائی رکھتی ہیں۔

میر کی پر درد زندگی نے میر کے کلام میں اثر انگیزی پیدا کر دی۔ ان کے کلام میں درد، کسک، تڑپ کا جو انداز ہے وہ کسی کے یہاں شاہد ہی ملے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ میر کا کلام ''آہ'' ہے جو دل سے نکلتا ہے اور دل میں اتر جاتا ہے۔ انہوں نے اردو غزل میں معنی کی ندرت، بیان کی وسعت اور فکر و خیال کی بلندی کو جگہ دی اور خاص طور سے روحانیت اور تصوف کے مضامین کو غزل میں سمویا ان کے کلام میں خلوص اور انسانی ہمدردی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اسی وجہ سے میر تقی میر کو خدائے سخن اور شہنشاہ غزل کہا جاتا ہے۔ ان کا انتقال 1810 کو ہوا۔ مثال

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

2. میر تقی میر کے بارے میں آپ جانتے ہیں؟

جواب: میر کا نام محمد تقی اور میر تخلص تھا وہ 1722 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام علی متقی تھا۔ جو ایک صوفی منش انسان تھے۔ میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ میر کے بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی بہن کی نگہداشت کی ذمہ داری اٹھائی۔ سوتیلے بھائیوں سے کچھ مدد نہیں ملی۔ اپنے سوتیلے ماموں نواب سراج الدین خاں آرزو کے پاس دلی چلے آئے۔ ان سے بھی رنجش ہو گئی۔

میر تقی میر حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ہمیشہ معاشی پریشانیوں میں گرفتار رہے۔ دلی کے امرأ کی مصاحبت بھی اختیار کی۔ لیکن معاشی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ کچھ دن ہوش و حواس سے بھی بیگانہ ہو گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جملے کے بعد دلی تباہ و برباد ہو گی۔ میر نے مجبوراً لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں ان کی خوب عزت افزائی ہوئی اور لکھنؤ ہی میں 1810ء کو انتقال ہوا۔

میر کی غزلوں کے چھ دیوان ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مثنویاں، قطعات، رباعیات، قصائد اور واسوخت بھی لکھے ہیں ان کا یہ سارا کلام کلیات میر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف میں ذکر میر جو ان کی آپ بیتی ہے بہت اہمیت رکھتی ہے اور ایک شعرأ کا تذکرہ نکات الشعرأ کے نام سے لکھا۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ فیض میر بھی انہوں نے لکھی۔

4 Marks

1. اشعار کی تشریح بحوالہ متن کیجئے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا، اس بیماری دل نے آخر کام تام کیا

حوالہ: یہ شعر میر تقی میر کی غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: میر تقی میر نے اس شعر میں جذبہ عشق کے انجام کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیماری دل مرض عشق ہے جو لا علاج ہے۔ بیماری کے علاج کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوا اور ساری کوششیں بے کار گئیں اور اسی مرض عشق نے آخری عاشق کی جان لے لی۔ مرض عشق میں گرفتار ہونے کے بعد اس سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکتا۔

شاعر نے عاشق کو آگاہ کیا تھا پھر بھی وہ ان کی بات نہ سنی۔ اس لیے شاعر نے لفظ دیکھا پر زور دیا کہ

تمہیں سمجھانے پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ نتیجہ تم خود دیکھ چکے ہو۔

2. عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حوالہ: یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں عاشق کی زندگی کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ عہد جوانی انسان کی زندگی کا سب سے اہم دور ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتا ہے۔ ایک نئی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے مگر عاشق کی داستان کچھ اور ہے۔ وہ جوانی کا زمانہ روز و کر گزارا اور بڑھاپے میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے رات تو جاگ جاگ گزاری اور صبح ہوئی تو نیند آ گئی۔

وہ کہتے ہیں عاشق کے جوانی کا زمانہ سخت مشکل سے گزرا۔ محبوب کا انتظار، بے چینی، درد اور تڑپ ہی اسکا مقدر ہے۔

عہد جوانی کو رات سے تعبیر کیا ہے جو جاگتے گزرتی ہے۔ بڑھاپے میں موت واقع ہوتی ہے۔ گویا رات بھر جاگنے کے بعد صبح ہوتی ہے تو وہ سو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی بھر کا تھکا ماندہ انسان آخری وقت میں اپنے آپ کو وقت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس شعر میں صفت تضاد کا استعمال کیا گیا ہے۔۔ جوانی پیری (بڑھاپا) رات۔ دن

3. ناحق ہم مجبوریوں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

حوالہ: یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے راست خدا سے مخاطب ہو کر ایک شوخ بات کہہ رہا ہے اور ساتھ ہی انسان کی بی بسیا اور مجبوری کی طرف اشارہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں نہ تو خود مختار ہے نہ ہی با اختیار۔ اس کا ہر عمل تقدیر کا پابند ہے۔ اس کے باوجود اس کا محاسبہ کیا جاتا ہے۔ سزا و جزا کا متوجب ٹھہرایا جاتا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور وہی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے تو ایسے میں انسان کو خود مختار کہنا کہاں تک درست ہے۔ اسی لیے اللہ نے انسان کو اپنی فرمابرداری یا بندگی کے لیے کہا ہے۔

شاعر خدا سے مخاطب ہے کہ اس نے انسان پر اختیار کی تہمت (الزام) لگا کر اسے بدنام کیا جبکہ وہ خدا

کی مرضی کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

4. یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

حوالہ: یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں انسان کی بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان دنیا کے معاملات میں مجبور ہے۔ اس کا کچھ بھی دخل نیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ رات کو رو رو کر صبح کرتا ہے اور جوں توں دن گزار کر شام کرتا ہے۔ غرض انسان کی زندگی بڑی مشکلوں اور مصیبتوں میں گزرتی ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اگر کچھ اختیار ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہر حال میں مشکلوں اور پریشانیوں سے زندگی گزارے۔ اس میں سپید و سیہ سے مراد اچھائیاں اور برائیاں یا نظام کائنات ہے۔

5. میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

حوالہ: یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ تم میر کے دین و مذہب کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ اور خود جواب دیتے ہیں کہ میر نے مذہبی دکھاوے کو ترک کر دیا۔ مذہب انسانیت کا سبق دیتا ہے۔ مذہب کے نام ظاہری حسن اور شکل دراصل یہ سب دکھاوا ہے۔ اصل چیز انسانیت ہے۔

اس شعر میں مذہبی رواداری کی بات کی گئی ہے۔ واعظ، مولوی اور پنڈتوں پر طنز کیا گیا ہے۔ دین کے معنی مذہب کے بتائے جاتے ہیں جب کہ دین کا مطلب اصول اور قانون ہے۔ اس لیے ان کی یہ خواہش ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات ختم ہوں اور وہ ایک دوسرے سے قریب آسکیں۔ عبادت گاہوں کا تقدس برقرار رہے۔

2 Marks

1. انسان کی مجبوریوں اور اس کے اختیار پر پانچ جملے لکھئے؟

جواب: انسان کی پوری زندگی خدا کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ بذات خود کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ اس لیے انسان صرف محنت کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ صرف اللہ کے ذریعہ ہی طئے پاتا ہے۔ ہر انسان خوشحال زندگی بسر کرنے کا

خواہشمند ہوتا ہے مگر اس کے مقدر میں جو طئے پایا گیا وہی اس کو حاصل ہوتا ہے۔ انسان کا اختیار صرف یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کو بروکار لاتا ہے۔

2. میر کی شاعری میں درد وغم اور مایوسی کی وجہ کیا ہے لکھئے؟

جواب: میر تقی میر اردو کے مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ میر کی زندگی شروع سے تنگی اور پریشانی میں گزری۔ خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے میر کو گھر چھوڑنا پڑا۔ میر حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی خودار طبیعت اور تنک مزاجی کی وجہ سے میر کو کہیں بھی سکون نہیں ملا۔ بچپن سے بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی حالات سے پریشان رہے یہی کیفیت میر کی شاعری کا حصہ بن گئی۔ میر کی پر درد زندگی نے میرے کلام میں اثر انگیزی پیدا کردی۔ اس لیے ان کا پورا کلام آہ ہے۔ جس درد وغم اور مایوسی کا عنصر ملتا ہے۔

3. صنعت تضاد کسے کہتے ہیں؟

جواب: شعر کے ایک یا دونوں مصرعوں میں ایسے الفاظ کا لانا جو آپس میں متضاد ہوں اسے صنعت تضاد کہتے ہیں

مثال

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نے اچھا ہوا برا نہ ہو

(غالب)

4. صنعت تکرار کے کیا معنی ہیں؟

جواب: شعر کے ایک یا دونوں مصرعوں میں ایسے الفاظ کا لانا جو کسی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے ٹکراتے یا دہرائے جاتے ہیں۔ مثال: عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند (رو۔رو)

5. مصرعہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: شعر کے آدھے حصہ یا نصف شعر کو مصرعہ کہتے ہیں۔ مثال

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے

6. شعر کسے کہتے ہیں؟

جواب: شعر کے لغوی معنی جاننے کے ہیں۔ دو مصرعوں کو ملا کر شعر کہتے ہیں۔ مثال

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

7. مطلع کی تعریف کیجئے؟

جواب: مطلع کے لغوی معنی طلوع ہونا یا نکلنا ہے۔غزل کے پہلے شعر کو مطل کہا جاتا ہے۔جس کے دونوں مصرعہ ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔مثال

دل نادان تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

8. مقطع کی تعریف معہ مثال دیجئے؟

جواب: مقطع کے لغوی معنی اختتام یا ختمہ ہیں۔غزل کے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص بھی استعمال کرتا ہے۔مثال

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

9. میر تقی میر کی تصانیف کے نام لکھئے؟

جواب: میر کی تصانیف میں چھ غزل کے دیوان، آپ بیتی سوانح ذکر میر، اور ایک تذکرہ نکات الشعرأ میں اس کے علاوہ فیض میر اور کلیات میر بھی شامل ہیں۔

1 Marks

1. میر تقی میر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میر تقی میر 1722ء (اکبر آباد) آگرہ میں پیدا ہوئے۔

2. میر تقی میر کو کیا کہا جاتا ہے؟

جواب: میر تقی میر کو خدائے سخن اور شہنشاہ غزل کہا جاتا ہے۔

3. میر کا انتقال کب ہوا؟

جواب: میر کا انتقال 1810 لکھنؤ میں ہوا۔

4. میر دہلی آکر کس کے پاس قیام کیا؟

جواب: میر دہلی آکر ماموں سراج الدین علی آرزو کے پاس قیام کیا؟

5. لکھنؤ کے کس نواب نے میر کی عزت افزائیکی؟

جواب: لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ نے ان کی عزت افزائی کی۔

6. میر تقی میر کا کوئی ایک پسندیدہ شعر لکھئے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو دعا کر چلے

7. قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا سے شاعر کی مراد ترک اسلام ہے۔

18 : غالبؔ

(یہ نہ تھی ہماری قسمت.....)

8 Marks

1. غالب کے حالات زندگی کے بارے میں لکھئے۔

جواب: مرزا غالب اردو کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں نام تھا۔ پہلے اسد بعد میں غالب تخلص کرتے تھے۔ مرزا نوشہ عرفیت نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ جیسے خطابات سے نوازے گئے۔

مرزا غالب 1797ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہی ہوئی۔ مرزا غالب کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔ ان کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ ابھی پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش چچا نے کی۔ وہ جاگیردار تھے اور فوج میں رسالدار تھے۔ نو برس کی عمر میں چچا کا بھی انتقال ہو گیا تو انگریزی حکومت نے جاگیر کے بدلے کچھ پنشن مقرر کر دی اور غالب اپنے ننہال میں رہنے لگے۔

مرزا کی تیرہ سال کی عمر میں دہلی کے نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے شادی ہو گئی۔ اس کے بعد غالب دہلی میں رہنے لگے۔ غالب کی تعلیم اگرچہ باقاعدہ طور پر بہت کم ہوئی لیکن انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذوق کی بناء پر فارسی زبان اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا۔

غالب بڑے خوددار انسان تھے۔ انہیں اپنی عزت نفس کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ فطرتاً ذہین اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں مالی اعتبار سے کبھی آسودہ نہیں رہے۔ ان کے اخراجات ہمیشہ آمدنی سے زیادہ تھے۔ 1857ء غدر کے بعد وظیفہ بند کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مقدمے کی پیروی کے لیے دہلی سے کلکتہ کا سفر کیا۔

غالب کی گفتگو اور ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ بڑے ظریف طبع تھے ان کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ جن میں ہر مذہب وملت کے لوگ شامل تھے۔ غالب کی زندگی میں رندی اور سرمستی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنا

استاد مقرر کیا تھا۔ غرض مرزا غالب عظیم شاعر ہی نہیں وہ عظیم انسان بھی تھے۔ ان کا انتقال 15 فروری 1869 کو ہوا۔ اور درگا حضرت نظام الدینؒ کے احاطے میں دفن کئے گئے۔

3. غالب کے شاعرانہ خصوصیات بیان کیجئے؟

جواب: مرزا غالب اردو کے عظیم غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ وہ 1797ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ پھر چچا نے پرورش کی۔ چچا کے انتقال کے بعد ننھال میں رہنے لگے۔ تعلیم کا سلسلہ آگرہ ہی سے شروع ہوا۔ گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد وہ دہلی میں منتقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کا انتقال 1869ء کو دہلی میں ہوا۔

مرزا غالب کا نام اردو غزل کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ انہوں نے غزل کو فکر و فن کی گہرائی عطاء کی۔ شعر و شاعری کا شوق غالب کو بچپن سے تھا۔ شروع میں اس تخلص کرتے تھے بعد میں غالب تخلص کرتے تھے جس زمانے میں آگرے سے دہلی آئے اس وقت دہلی میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو کے مقابلے میں ان کا فارسی کلام بہت زیادہ ہے۔ مگر انہیں شہرت اپنے اردو کلام ہی کی وجہ سے ملی۔ غالب کو عام راستے سے الگ ہٹ کر نئی راہ پر چلنے کا شوق تھا۔ اسی وجہ سے ابتداء کے کلام مشکل الفاظ و زبان استعمال کیے۔ لیکن رفتہ رفتہ مشکل پسندی کو ترک کردیا۔

غالب ایک ذہین اور صاحب فکر انسان تھے۔ ان کے کلام میں عشق و محبت کے مشاہدات و احساسات کے علاوہ زندگی کی حقیقت کے تعلق سے گہری بصیرت ملتی ہے۔ ان کے اشعار میں جذبے کی حرارت کے ساتھ ساتھ کرب کی گہرائی، مشاہدات کی تازگی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ فارسی تراکیب کی مدد سے غالب نے نہایت لطیف، جذبات و احساسات کی بڑی کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ اس کے علاوہ حکیمانہ افکار اور منصوفانہ خیالات کے ذریعہ بھی غالب نے اپنے کلام میں وسعت پیدا کیا۔

وہ عظیم شاعر ہی نہیں وہ عظیم انسان بھی تھے۔ غالب نے انسانی فطرت کا بہت غور و خوص کے ساتھ مطالعہ کیا۔ غالب نے اپنے کلام میں فلسفیانہ مضامین بیان کئے ہیں۔ اس لیے اکثر انہیں فلسفی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ فکر کی بلندی اور الفاظ کے معنی خیز استعمال کی بدولت ان کی ایک امتیازی شان ہے۔ غالب نے اردو غزل کو خیالات کی تازگی اور موضوعات کی رنگارنگی سے وہ وقار بخشا جس کے سبب اردو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

4 Marks

1. اشعار کی تشریح بحوالہ متن کیجئے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

حوالہ: یہ شعر مرزا غالب کی غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں اپنے دوست سے شکوہ کیا ہے اور ظریفانہ انداز سے کہتے ہیں کہ دوست سے ملنا ہماری تقدیر ہی میں نہیں تھا اور بہتر ہوا کہ ہم مر گئے۔ ورنہ زندہ رہتے ہوئے دوست سے ملاقات محال تھا۔ زندگی کے تمام ایام محبوب کے انتظار ہی میں گزر جاتے۔ پھر بھی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا۔ شاعر نے اس شعر میں شرطیہ لفظ اگر کے ساتھ کنایہ کا استعمال کیا ہے۔

2. ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حوالہ: یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اپنے دوست کی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محبوب نے شاعر سے ملاقات کا پکا وعدہ تو کر لیا لیکن شاعر اپنے دوست کی فطرت سے بخوبی واقف ہے کہ وہ اپنے وعدے کو کبھی پورا نہیں کر سکا۔ دونوں کے مزاج میں تضاد ہیں۔

شاعر اپنے محبوب سے راست مخاطب ہیں کہ اگر آج تم مجھے زندہ دیکھ رہے ہو تو تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ میں نے تمہارے وعدے کو سچ نہیں سمجھا تھا کیونکہ اگر مجھے تمہارے وعدے کی سچائی کا یقین ہو جاتا تو میں اس خوشی کی وجہ سے ہی مر گیا ہوتا۔ تمہارے وعدے کو خلاف امید نہیں سمجھا اس لیے زندہ ہوں۔

2. کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

تشریح: شاعر نے اپنے محبوب کے ناز و نخرے کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ تیری نگاہوں کا تیر جو میرے دل میں چبھ کر رہ گیا ہے اس سے میرے دل میں ٹیس اٹھ رہی ہیں اور اس میں مجھے ایک عجیب لذت کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کی لذت کا حال کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اگر تیرا تیر میرے دل کے آر پار ہو جاتا تو یہ لطف اور یہ لذت کہاں سے حاصل ہوتی۔

شاعر نے اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کیا اور ثابت کیا کہ وہ ایک سچا عاشق ہے۔

4. کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

حوالہ: یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر مین شاعر نے غم بھری زندگی کی عکاسی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں کیا بتاؤں کہ شب غم یعنی دکھ بھری رات کیا ہے۔ غموں والی رات ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ ایک آفت ہے اس میں انسان بار بار موت کی تکلیف اٹھاتا ہے۔ ہر لمحہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مر مر کر جینا پڑتا ہے اور پھر بھی اسے موت نہیں آتی جبکہ ایکبار فطری طور پر مر کر انسان کو دنیا کے رنج و غم سے مکمل نجات مل جاتی ہے۔ دکھ اور غم سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

شب غم میں تو ہر وقت موت کی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ زندہ رہنے میں مزہ نہیں رہتا۔ موت بھی نہیں آتی صرف گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کرنا پڑتا ہے۔

5. یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حوالہ: یہ شعر مرزا غالب کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر مرزا غالب نے اپنی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ شاعر اس مقطع میں اپنے آپ سے مخاطب ہیں کہ اے غالب! تو نے اپنے کلام میں تصوف کے مشکل مسائل کو بھی بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ تصوف پر گہرائی والے اشعار لکھے۔ اس لیے اگر تجھے شراب پینے کی بری عادت نہ ہوتی تو میں تجھے ولی یعنی خدا کا مقرب بندہ یا پہنچا ہوا بزرگ مان لیتا۔

شاعر نے اپنی شخصیت کی کمزوری مئے نوشی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی تسلی بیان کی۔ وہ اپنے انداز بیان سے مشکل سے مشکل مسائل کو بھی عام فہم انداز سمجھا دیتے مگر ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ وہ اپنی ایک حامی شراب پینے پر افسوس کیا۔

2 Marks

1. صنعت کنایہ کی تعریف لکھئے؟

جواب: کنایہ کے معنی ہیں بات کو پوشیدہ ڈھنگ سے کہنا۔

کسی بات کو براہ راست نہ کہہ کر اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا کنایہ کہلاتا ہے۔ مثال: ہم کسی سے

کہیں، مجھے تم سے اس بات کی امید نہیں۔اس جملے میں ہم نے اپنے دوست کی کسی خامی کو براہ راست نہ بتا کر اشارہ، اسے اس کمی کا احساس دلایا۔

2. استعارہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: استعارہ لفظ مستعار سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں۔ادھار لینا؟

جواب: استعارہ کے معنی وہ لفظ جو اس کے اصلی معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ استعارہ کہتے ہیں۔شرط یہ ہے کہ دونوں معنوں میں تشبیہ تعلق ہوں۔

مثال: بہادر کے لیے شیر۔معشوق کے لیے گل۔خوش کلام کے لیے بلبل۔

3. تعلیٰ کیا ہے؟

جواب: کسی کلام یا شعر میں اپنی تعریف خود بیان کرنے کو تعلیٰ کہا جاتا ہے۔مثال:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

4. ردیف سے کیا مراد ہے؟

جواب: شعر کے آخر میں بار بار دہرایا جانے والا لفظ کو ردیف کہتے ہیں۔مثال:

دل نادان تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ردیف: کیا ہے

5. قافیہ کے کیا معنی ہے؟

جواب: ردیف سے پہلے آنے والے الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے۔مثال:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
قافیہ ردیف

قافیہ: ماجرا

6. خود کلامی کی تعریف کیجئے؟

جواب: شاعر اپنی شاعری میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کوئی بات کہتا ہے تو اسے خود کلامی کہتے ہیں۔

7. غالب کو فلسفی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: مرزا غالب نے اپنے کلام میں سادہ، عام فہم اور گہرائی والے اشعار لکھے ہیں ان کے پاس فلسفیانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ ان کے اشعار میں فکر کی بلندی اور الفاظ کی معنویت کا حسن پایا جاتا ہے۔ اس لیے انہیں فلسفی شاعر بھی کہتے ہیں۔

1 Marks

1. شادی مرگ کسے کہتے ہیں؟

جواب: انسان کی بہت زیادہ خوشی کی وجہ سے موت واقع ہو جانے کو شادی مرگ بھی کہتے ہیں۔ یہ اکثر ہماری امید سے ہٹ کر بڑی خوشی مل جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

2. غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: غالب 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے؟

3. غالب کا لقب کیا تھا؟

جواب: غالب کے القاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ ہیں۔

5. دنیا سے بے نیاز ہو کر اللہ سے تعلق جوڑنے والے کو صوفی کہتے ہیں۔

6. صوفیانہ خیالات کو تصوف کہتے ہیں۔

7. وصل کے معنی ملاقات ملنا۔

8. مرزا غالب کی شادی کس عمر میں ہوئی؟

جواب: مرزا غالب کی شادی 13 برس میں ہوئی۔

9. مرزا غالب نے ابتداء کی شاعری میں کونسا تخلص استعمال کیا؟

جواب: مرزا غالب نے ابتداء میں اسد تخلص استعمال کیا۔

10. مرزا غالب کا کوئی شعر لکھئے؟

جواب: ہزار خواہش ایسی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

19 : مومن

(وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا.....)

Section A

ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔

1. مومن خاں مومن کے حالات زندگی کے بارے میں لکھئے؟

جواب: مومن خان مومن عہد متوسط کے ایک مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ مومن خان نام تھا مومن تخلص کرتے تھے۔ 1800 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیری شرفاء تھے۔ جن کا خاندانی پیشہ طباعت تھا۔ خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں اس زمانے کے بہترین علماء سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ طب تو ان کا خاندانی پیشہ ہی تھا۔ اس کے علاوہ ریاضی، نجوم، موسیقی اور شطرنج میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

مومن ایک کھاتے پیتے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زندگی میں عیش و مسرت کی کمی نہ تھی اس لیے شاعری کو پیٹ پالنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ دربار میں عزت تھی لیکن اس کے محتاج نہ تھے۔ بادشاہ یا امرأ کی تعریف میں قصیدے نہیں لکھے۔

مومن زندہ دل، یار باش، آزاد مشرب اور رنگین طبع انسان تھے۔ ان کی رنگین طبیعت نے کوچہ عشق میں بھی پہنچا دیا۔ اپنی داستان عشق انہوں نے ایک مثنوی میں بیان کی ہے۔ زندگی بھر دہلی میں رہے۔ وہ ایک خوددار اور قناعت پسند انسان تھے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عشق و محبت کی بڑی دلچسپ عکاسی کی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہیں دہلی کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا۔ 1852ء میں مکان کی چھت سے گرنے سے انتقال ہوا۔ دلی ہی میں مدفون ہوئے۔

2. مومن کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجئے؟

جواب: حکیم مومن خان مومن دہلی کے مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ وہ 1800 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پیشہ طب تھا۔ مومن نے شاہ عبدالقادر سے عربی، والد سے طب اور شاعری میں نصیر کے شاگرد

ہوئے۔ وہ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے کئی امیر کی ملازمت یا مصاحبت نہیں کی۔ 1852ء میں مکان کی چھت سے گرنے سے انتقال ہوا۔

اردو شاعری میں غالب کے بعد سب سے اہم نام مومن خاں مومن کا ہی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مختلف اصناف سخن کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن جس صنف سخن کے لیے وہ مشہور ہوئے وہ غزل ہے۔ انہوں نے ٹھیٹ غزل کے مضامین میں بھی ندرت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انہیں زبان و بیان اور ضائع پر عبور حاصل تھا۔ اپنی غزلوں میں انہوں نے رعایت لفظی اور ابہام سے بھی حسن پیدا کیا ہے۔

مومن نے اپنی غزلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی بڑی دلچسپ عکاسی کی ہے اور اپنی غزلوں کو صرف مادی یا جسمانی محبت سے متعلق مشاہدات و کیفیات کے بیان کرنے تک محدود رکھا۔ ان کے ہاں حکیمانہ اور اخلاقی مسائل اور منصوفانہ خیالات نہیں ملتے۔ ان کا عہد اردو غزل گوئی کا سنہرا دور تھا۔

مومن کا زیادہ تر کلام حسن و عشق کے گرد ہی گھومتا ہے۔ اور معاملہ بندی مومن کا خاص میدان رہا ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کا دائرہ محدود کرلیا۔ لیکن ان کا کمال یہی رہا کہ اس محدود دائرے میں جدتیں پیدا کی ہیں اور اپنے کلام میں معاملہ بندی کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

مومن کے اکثر اشعار بہت مشکل ہوتے ہیں کیونکہ وہ اشاروں اور ادھوری باتوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کی تشبیہات اور استعارات ان کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہیں۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کلام مومن کی اہم خصوصیات ہیں۔

مومن نے تقلید سے دامن بچاتے ہوئے اپنی ایک نئی راہ نکالی اور نازک خیالی اور پیچیدہ بیانی سے ملتا جلتا رنگ پیدا کیا۔ لفظی تناسب اور دوسری صنعتوں کا استعمال کیا۔ وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ مومن نے جذبہ الفت کے لطیف و نازک احساسات کو بڑے موثر اور دل نشین پیرایے میں ظاہر کرتے ہوئے اپنی جدت اور انفرادیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

Section B

ہر سوال کے چار نشانات مقرر ہیں۔

1. وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ بناہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حوالہ: یہ شعر مومن خاں مومن کی غزل کا مطلع ہے۔ یہ غزل بڑی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ردیف طویل ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' ہیں۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنی محبت کے گزرے ہوئے دنوں یعنی ماضی کو یاد کر رہا ہے اور اپنے محبوب سے راست مخاطب ہے کہ اے دوست! ہم اور تم ایک دوسرے کے دام محبت میں گرفتار ہوئے تھے۔ اور ہم نے محبت میں کچھ وعدے بھی کیے تھے۔ ایک دوسرے کے تئیں وفادار رہیں گے۔ ایک دوسرے کا ساتھ زندگی بھر رہے گا۔ میں ماضی کے تمام وعدوں کو یاد کرتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ تمہیں یہ وعدے یاد ہے یا نہیں۔

شاعر نے ماضی کی باتوں کو دہرا کر سچا عاشق ہونے کا ثبوت دیا اور دوست کی خاموشی پر اس کو وعدہ بھولنے کا احساس دلا رہا ہے۔

2. وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حوالہ: یہ شعر مومن خاں مومن کی غزل سے لیا گیا ہے؟

شاعر نے اس شعر میں محبوبہ کی مہربانیاں اور کرم فرمانیاں کا ذکر کیا ہے۔ شاعر نے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا محبوب ہمیشہ اپنے عاشق کا ہر وقت خیال کرتا تھا۔ محبوب کی مہربانیاں اور کرم فرمانیاں اکثر شاعر کے حصے میں آتی تھی۔

اسی لیے ان تمام خوبصورت یادوں کو دہراتے ہوئے محبوب سے مخاطب ہے کہ پہلے تم مجھ پر بہت مہربان تھے اور میرے حال پر بہت کرم کرتے تھے۔ مجھے آج بھی تمہاری ایک ایک مہربانی، حسین یادیں اچھی طرح یاد ہے۔ افسوس کہ تمہیں اپنے لطف و کرم یاد نہیں ہیں۔ لیکن مجھے تو ساری چیزیں یاد ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اپنا رویہ بدل لیا۔ اب تم مجھ پر مہربان نہیں رہے۔

3. وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حوالہ: یہ شعر مومن کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں محبوب کے روٹھنے اور منانے کی یادوں کی عکاسی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق میں روٹھنا اور منانا کا ایک عام رواج ہے۔ محبوب اپنے حسن کے نزاکتوں سے روٹھتا بھی ہے اور شاعر سچا عاشق بن کر اس کو منا بھی لیتا ہے۔

شاعر نے اپنے ماضی کے ان لمحات کی طرف اشارہ کیا اور محبوب سے کہتا ہے کہ تم چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہو جاتے تھے۔ شکوہ شکایت کرتے تھے اور پھر میں فوری تمہیں منا لیتا تھا۔ تمہاری ناراضگی مجھے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میرے لیے وہ بھی حسین یادیں ہیں۔ مگر تم تو اب وہ گلے شکوے اور روٹھنے منانے کا پر لطف سلسلہ بھی شاید بھول چکے ہو۔ کیوں تم بلدل گئے ہو۔

4. کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حوالہ: یہ شعر مومن کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے محبوب کی فطرت کو بیان کیا ہے۔ شاعر نے راست اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اے دوست! ماضی میں اگر کوئی ایسی بات ہو جاتی جو واقعی تمہیں بری لگے تو تم اپنی محبت کے صدقے اس بات کو زبان پر لائے بغیر بھلا دیا کرتے تھے۔ یار وز کی چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ اس کا شکوہ بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن آج تمہیں کیا ہو گیا کہ مجھ سے خفا ہیں۔ اور میری انجان غلطی کو بھلا نہیں پا رہے ہیں۔ محبوب کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنا اور عاشق کا اسے منانا محبت کا دستور ہے۔ اس سے محبت بڑتی ہے۔

5. جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حوالہ: یہ شعر مومن خان مومن کی غزل کا مقطع ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنا تعارف کرتے ہوئے محبوب سے سوال کر رہا ہے کہ تم مجھے پہچان کیوں نہیں پا رہی ہو۔

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ جسے تم اپنے جان پہچان والی، بہی خواہوں، دوستوں میں گنتے تھے اور اپنا وفادار و خیر خواہ سمجھتے تھے۔ میں آج بھی وہی سچا عاشق ہوں۔ تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تم بھی دل و

جان سے مجھ کو پسند کرتی تھی۔لیکن اچانک تمہیں کیا ہو گیا کہ آج تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہوں۔

شاعر نے مقطع میں خود کو سچا عاشق ثابت کر کے محبوبہ کے دل میں محبت جگانے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کی یادوں کا حوالہ دیا ہے۔

Section C

ہر سوال کے 2 نشانات مقرر ہے۔

1. معاملہ بندی کی تعریف مہ مثال دیجئے؟

جواب: عاشق اور معشوق کے درمیان جو باتیں اور واقعات ہوتے ہیں ان کے عاشقانہ بیان کو معاملہبندی کہتے ہیں۔ معاملہ بندی مومن کا خاص میدان ہے۔ معاملہ بندی کی بہترین مثال مومن نے اس غزل میں شاعر اور محبوب کے یادوں کے خوبصورت سلسلے کو دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔

2. دوسرے شعر میں ذرا ذرا کے ذریعے ابہام پیدا ہو گیا ہے اس کے دونوں معنی بتایئے؟

جواب: دوسرے مصرعے میں ذرا ذرا ابہام پیدا کرتا ہے جس کے دو انداز والے معنی ہوں گے۔ ایک معنی تو ہیں کہ مجھے تمہاری سب مہربانیاں اور کرم فرمانیاں اب بھی تھوڑی تھوڑی سی یاد ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ مجھے تمہاری سب مہربانیاں اور کرم فرمانیوں کا معمولی حصہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ یعنی چھوٹی سے چھوٹی مہربانی بھی مجھے خوب یاد ہے۔

3. غزل مسلسل کی تعریف لکھئے؟

جواب: عام طور پر غزل کے ہر شعر میں الگ الگ مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور اشعار میں باہمی ربط نہیں ہوتا۔ لیکن غزل میں مربوط مضامین بیان کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ وہ غزل جس میں مربوط مضمون کو بیان کیا جائے یا پوری غزل میں ایک ہی بات کو پھیلا کر کہا جائے غزل مسلسل کہلاتی ہے۔ مومن کی یہ غزل دو غزل مسلسل کی عمدہ مثال ہے۔

4. شتر گربہ کسے کہتے ہیں۔ مثال دے کر سمجھایئے؟

جواب: شعر میں ایک ہی شخص کے لیے تعظیم و تحقیر کے الفاظ استعمال کرنے کے انداز کو شتر گربہ کہتے ہیں جسے اس غزل کے مقطع میں محبوب کو پہلے آپ اور پھر تم سے مخاطب کیا گیا ہے۔ شتر اور گربہ فارسی زبان میں اونٹ اور بلی کو کہتے ہیں۔ اونٹ ایک بڑا جانور ہے جب کہ بلی اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی

شخص کو بڑوں کی طرح باادب مخاطب کیا جائے اور پھر اپنا رویہ بدل کر اس سے چھوٹوں کی طرح گفتگو شروع کر دی جائے تو یہ طریقہ شتر گربہ کہلاتا ہے۔

5. حسن مقطع کسے کہتے ہیں۔

جواب: مقطع میں تخلص کو اس طرح نبھانا کہ دوسرے الفاظ اس سے مطابقت رکھتے ہوئے حسن مقطع کہلاتا ہے۔ مومن نے اپنے تخلص کو اکثر اوقات مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس غزل کے مقطع میں مومن مبتلا سے مراد سچا عاشق بھی ہے اور عاشق مومن بھی ہے۔

6. مومن کے انداز بیان پر تبصرہ کیجئے؟

جواب: مومن اردو کے مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے غزل میں شہرت پائی۔ ان کا اسلوب منفرد ہے۔ مومن کا انداز بیان دل نشین ہے۔ وہ انداز بیان کو دل کش بنانے کے لیے بحر کا انتخاب بھی موضوع کی مناسبت سے کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے۔ اس لیے ان کے ہم عصر شعرا غالب، ذوق، ظفر میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

7. مومن کی غزل کی ردیف کیا ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے؟

مومن کی غزل کی ردیف ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' ہے۔ اس غزل کی ردیف کبھی جذباتی کیفیت ظاہر کرتی ہے تو کبھی طنزیہ لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی شکایت بن جاتی ہے تو کبھی سوال کرنے لگتی ہے۔ غرض اس ردیف کے متعدد کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ردیف اتنی لمبی ہے کہ مومن کے علاوہ بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔

8. صنعت تضاد کی تعریف کیجئے اور دو مثالیں دیجئے؟

جواب: ایسے الفاظ جو باہم متضاد ہوں یعنی معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ ان کے استعمال کو شاعری میں صنعت تجاد کہتے ہیں۔ مثال: بھولنا، یاد ہونا۔

Section : D

ہر سوال کے ایک نشان مقرر ہے۔

1. مومن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: مومن 1800 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

2. مومن کا آبائی پیشہ کیا تھا؟

جواب: مومن کا آبائی پیشہ طب تھا۔

3. مومن نے شاعری میں کس سے اصلاح لی؟

جواب: مومن نے شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔

4. مومن کے ہم عصر شعرأ کے نام بتائیں؟

جواب: مومن کے ہم عصر شعرأ ذوق، غالب، ظفر وغیرہ۔

5. مومن کی شاعری کا اہم عنصر کیا ہے؟

جواب: مومن کی شاعری کا اہم عنصر معاملہ بندی ہے؟

6. مومن کی غزل کی ردیف کیا ہے؟

جواب: مومن کی غزل کی ردیف تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ہے۔

7. مومن کی غزل میں استعمال شدہ مترادف الفاظ لکھئے؟

جواب: لطف اور کرم۔ گلہ وشکایت

8. مومن کی غزل میں کونسا لفظ ابہام ظاہر کرتا ہے؟

جواب: مومن کی غزل میں لفاظ ابہام ذرہ ذرہ ہے۔

9. محبوب کے روٹھنے پر عاشق کیا کرتا تھا؟

جواب: محبوب کے روٹھنے پر عاشق منا تا تھا۔

10. شتر اور گربہ کے کیا معنی ہیں؟

جواب: اونٹ اور بلی۔

11. مقطع میں تخلص کو اس طرح نبھا تا ہے کہ دوسرے الفاظ اسی سے مطابقت رکھتے ہیں کیا کہلاتا ہے۔

جواب: حسن مقطع۔

20 : خواجہ حیدر علی آتش

(یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے.....)

I. جواب 20 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔

1. خواجہ حیدر علی آتش کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھئے؟

جواب: آتش دبستان لکھنو کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ان کا نام خواجہ حیدر علی اور تخلص آتش تھا۔آتش کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے دور میں دہلی سے فیض آباد چلے آئے۔ وہیں آتش کی پیدائش ہوئی۔ وہ 1777ء کو پیدا ہوئے۔کم عمری میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے اور تعلیم و تربیت کی تکمیل نہ ہو سکی۔کوئی صحیح رہبری کرنے والا نہیں تھا۔انہیں اپنے آپ کو پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ بانکوں اور سپاہی پیشہ افراد کی صحبت میں رہنے لگے۔ایک بے پرواہ اور آزاد زندگی بسر کرنے کا موقع تو ملا لیکن آتش کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں اور ان کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود کر تلوار چلانا اور نئی زندگی بسر کرنے کا گر سیکھ گئے۔ان کے مزاج میں ایک طرح کی آزادی اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔

آتش کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی۔ان کی ضرورتیں بہت کم اور خواہشیں نہ ہونے کے برابر نہیں ان کا خاندان دلی کا ایک صوفی خاندان تھا۔اس لیے ان میں ایک طرح کی قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی تھی۔اس کی جھلک ان کی شاعری میں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہے۔فیض آباد میں ایک نواب کے یہاں تلوار چلانے والوں میں نوکر ہو گئے تھے اور انہیں کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔اس وقت کا لکھنؤ شاعری کا مرکز تھا۔لکھنؤ آخر مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔جلد ہی ان کی شاعری نے شہرت حاصل کر لی۔ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔

آتش بڑے لوگوں سے کبھی ملتے نہ تھے۔مفلس و محتاج لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش ہوتے تھے۔ایک لمبا گیر و لباس پہنتے، ہاتھ میں موٹا ڈنڈا ہوتا اور کمر میں تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ بھنگ اور حصے کا شوق تھا۔آتش اپنے آخری زمانہ حیات میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔کہا جاتا ہے اودھ کے شاہی دربار سے ان کو 80 روپے ماہوار ملتا تھا وہ اسے غریبوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔1847ء میں ان کا انتقال ہوا۔

2. آتش کے کلام کی خصوصیات لکھئے؟

جواب: آتش دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ آتش 1777ء میں پیدا ہوئے ہیں۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے تعلیم و تربیت کی تکمیل نہ ہوسکی۔ آتش فقیر منش اور قلندر صفت انسان تھے۔

آتش کو کم عمری سے ہی شعر و شاعری کی طرف رجحان تھا۔ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوگئے۔ جلد ہی ان کی شاعری نے شہرت حاصل کرلی۔ لکھنؤ اسکول میں عام طور پر تصنع اور بناوٹ کا رواج رہا ہے لیکن آتش نے لکھنؤ کی عام روش سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی۔ انہوں نے سادہ اور عام زبان میں منتخب موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا فن کارانہ استعمال ہے وہ الفاظ و تراکیب کے استعمال سے شعروں میں حسن پیدا کردیتے ہیں۔

آتش کی زندگی میں جو آزادہ روی، بے باکی اور سادگی تھی وہی ان کی شاعری میں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ آتش کے دو دیوان شائع ہوئے ہیں۔ آتش کے کلام میں روزمرہ اور عام بول چال کا اندازہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس سے کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہوگیا ہے۔ رنگینی و شوخی اور مضمون کا اختصار ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور مستی بھی سرشاری بھی۔ ان سب کے باوجود لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کلام میں تصنع بھی ہے اور بے جا رعایت لفظی بھی۔

آتش کا خیال تھا کہ شاعری ایک فن ہے جس میں لفظوں کا اچھے سے اچھا استعمال ہونا چاہئے۔ ان کا احساس بھی جمالیاتی ہے۔ آتش اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اور بحیثیت شاعر انہیں ایک دبستان کے بانی کی سی حیثیت حاصل تھی۔ وہ لکھنؤ کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے درویشی، اور تصوف سے متعلق مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ آتش کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کی ناسخ سے حریفانہ چشمک رہا کرتی تھی۔

Section : B

II. جواب 10 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے 4 نشانات مقرر ہیں۔

1. متن کے حوالہ سے تشریح کیجئے؟

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنے محبوب کی خوبصورتی کو سراہا ہے اور موازکیا ہے۔ اپنا اور بلبل کا محبوب اور گل کا۔

ہر عاشق اپنے محبوب کو دنیا کا حسین ترین سمجھتا ہے۔ شاعر بھی اپنے محبوب کی خوبصورتی کا دیوانہ ہے۔ اس لیے شاعر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میرا محبوب پھول سے بھی زیادہ حسین اور پرکشش ہے۔

اس لیے شاعر چاہتا ہے کہ وہ اپنے خوبصورت محبوب اور خوشنما پھول کو آمنے سامنے بٹھائے۔ پھر پھول کے عاشق بلبل سے بات چیت کرے اور پوچھے کہ کس کا محبوب خوبصورت ہے۔

شاعر نے اس میں پھول سے اپنے محبوب کا تقابل کر کے ناز کر رہا کہ میرا محبوب بہت سے حسین اور پیارا۔

2. پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرم آرزو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے عشق کی کیفیات میں درمیانی فرد کی عدم موجودگی کو بہتر قرار دیا ہے اور پیام بر نہ ملنے پر خوشی کا اظہار کیا کہ وہ اپنی بات راست خود محبوب سے کہہ سکتا ہے۔

عام طور پر عاشق اپنے دل کی بات مختلف ذرائع سے محبوب تک پہنچاتا ہے۔ پیغام یا اطلاع پہنچانے والے کو پیام بر کہا جاتا ہے۔ لیکن شاعر کے عشق میں کوئی درمیانی فرد نہیں ہے جس سے وہ اپنا مدعا کہلا بھیجتا۔ تاہم پیام بر نہ ملنے کو شاعر نے اچھا بتاتا ہے۔ کیوں کہ کسی دوسرے کی زبان سے شاعر کے جذبات، خیالات اور حالات کا اظہار نہیں ہوسکتا ہے۔

شاعر نے راست اپنے محبوب سے دل کی بات کہنے میں ہی خوشی کا اظہار کیا۔ وہ ثالثی کردار کا قائل نہیں۔ اسی سے خدشہ ہے کہ وہ تیسرا فریق کئی محبوب کا رقیب نہ بن جائے اور ہماری محبت کا راز افشاء ہو جائیگا۔

3. مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ وہ محبوب کی تلاش میں در بہ در بھٹک رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ محبوب سے ملاقات ہو جائے۔ اس شعر میں حسن تعلیل کا استعمال کیا گیا ہے۔

شاعر نے اپنا تقابل چاند اور سورج سے کیا اور کہتا ہے کہ چاند اور سورج قدرت کے تحت مسلسل سفر

میں ہیں اور دن رات چلتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا معمول ہے۔لیکن شاعر کی سوچ یہ کہتی ہے کہ جس طرح میں اپنے محبوب کی تلاش میں مارا مارا بھٹک رہا ہوں اسی طرح چاند اور سورج بھی اپنے محبوب کی تلاش میں چکر لگا رہے ہیں۔اس لیے وہ چاند اور سورج کی گردش کو بھی آوارگی کی علامت قرار دیا ہے۔

4. ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے

سفید رنگ ہیں آخر سیاموکرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں زندگی کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔انسان کی جبلت میں شامل ہے کہ وہ تبدیلی یا انقلاب کو پسند کرتا ہے۔بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرم ہوتا ہے۔ایک حقیقت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ تبدیلی زندگی کا ایک اہم جز ہے۔وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔انسان بھی ارتقائی منزلیں بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپے تک پہنچ جاتا ہے اور بالآخر اس کے جوانی کے سیاہ بال بھی بڑھاپے کی عمر میں سفید ہو جاتے ہیں۔

شاعر نے اس شعر سے یہ پیغام دیا ہے کہ انسان بھی بدلتے ہوئے حالات، تقاضے اور چیالنجس کے مطابق اپنے آپ کو بدل ڈالے تب ہی وہ کامیاب انسان ہوگا۔

5. ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا

تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنے عشق کی شدت کو اجاگر کیا ہے۔اس لیے کہ وہ اپنے محبوب سے سچی محبت کرتا ہے۔اس سے ملاقات کا خواہشمند ہیں لیکن جب عشق میں شدت آجاتی ہے اور محبوب سے ملاقات کی امید نظر نہیں آتی تو عاشق جنونی ہو جاتا ہے۔جنوں کی حالت میں عاشق اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔

شاعر اپنے محبوب کے دیدار کے لیے جنونی کیفیت میں مبتلا ہے۔ یہ کیفیت ہمیشہ جاری رہی۔اس لیے وہ دیوانگی میں کپڑے پھاڑتے رہا اور رفوگران کے کپڑوں کو رفو کرتے رہے۔یعنی شاعر کو ہمیشہ عشق سے باز آنے کے لیے تلقین کی گئی۔وہ اپنی بے چینی پر برقرار رہا۔

6. جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم

اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں محبوب کی خوبصورتی اور محبت کے جذبہ کی عکاسی کی۔ شاعر خود اپنے محبوب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ یعنی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ راست اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اے دوست! تو بہت حسین ہے۔ جو کوئی تیرے زلفوں کا نظارہ کریں۔ وہ تیری محبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ جنہوں نے ابھی تک محبت نہیں کی وہ آزاد ہیں لیکن تیری خوبورتی کے جادو کے سامنے وہ بھی محبت میں گرفتار ہونے کی خواہش ظاہر کریں گے۔ شاعر نے اپنے محبوب کی خوبصورتی پر فخر کیا اور جو کوئی ان کی خوبصورت زلفوں کو دیکھ لیں تو وہ اس سے محبت کرنے کی تمنا کرے گا۔

7. نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

حوالہ: یہ شعر آتش کی غزل کا مقطع ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے اور اپنے قسمت کے مخالف فیصلوں پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اے آتش! تم اپنی قسمت کے مخالف فیصلوں کی کہانی و داستان مت پوچھو۔ اس لیے کہ میری قسمت بالکل باغی ہو چکی ہے۔ میری ہر آرزو کے برخلاف نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں۔

شاعر کو خدشہ ہے کہ اگر بارش کی آرزو کرے گا تو آسمان سے پانی کے بجائے آگ برسنے لگے گی۔

یہ فطری بات ہے کہ جب قسمت انسان کا ساتھ نہیں دیتی تو اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ انسان مجبور ہو جاتا ہے۔

III. جواب 4 سطروں سے زائد نہ ہوں۔ ہر سوال کے دو نشانات مقرر ہیں۔

1. حسن تعلیل کسے کہتے ہیں؟ مثال دے کر سمجھائیے؟

جواب: تعلیل کے لغوی معنی ہیں دلیل دینا وجہ بیان کرنا۔ صناع معنوی کی یہ ایک قسم ہے۔ جس میں شاعر کسی چیز یا کام کوئی ایسی وجہ بتانا جو دراصل اس کی اصل وجہ نہ ہو۔ حسن تعلیل کہلاتا ہے۔

مثال: چاند اور سورج نظام قدرت کے تحت چلتے رہتے ہیں لیکن شاعر نے ان کے مسلسل سفر کی وجہ محبوب کی تلاش بتائی ہے۔

2. مبالغہ کی تعریف لکھئے اور مثال بھی دیجئے ؟

جواب: کلام میں کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بھی ایک صنعت ہے۔ جسے مبالغہ کہتے ہیں۔شعر میں زور بیان کو بڑھانے کے لیے مبالغ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مثال: شاعر نے کپڑے پھاڑنے والی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔

3. صنعت مراعات النظیر اور صنعت تضاد میں کیا فرق ہے۔مثالوں کے ساتھ سمجھایئے؟

جواب: صنعت مراعات النظیر یہ لفظ مرکب ہے۔مراعات + نظیر اس کے معنی ہیں۔رعایت کرنا یا جمع کرنا۔ اس طرح کی چیزوں کے نام کو جن میں باہمی مناسبت ہو۔کلام میں ایسی چیزوں یا الفاظ کا استعمال کرنا جن میں آپسی تعلق ہو لیکن یہ تعلق تضاد نہ ہو۔مراعات النظیر کہلاتا ہے۔مثال: زنجیر اور اسیر ایسے الفاظ ہیں۔

صنعت تضاد: شعر کے ایک ہی یا دونوں مصرعوں میں ایسے الفاظ کا لانا جو آپس میں متضاد ہوں۔صنعت تضاد کہتے ہیں۔

مثال: آزاد اور اسیر متضاد الفاظ ہیں جن سے صنعت تضاد بنتی ہے۔

مہ اور مہر: سفید و سیاہ آگ و باراں

4. آتش کے انداز بیان پر اظہار خیال کیجئے ؟

جواب: دبستان لکھنو میں آتش کا لب ولہجہ، انداز و بیان بالکل منفرد ہے۔ان کے یہاں بیان میں صفائی اور طرز ادا میں سلاست روانی پائی جاتی ہے۔اپنے اظہار خیال کے لیے آتش نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں بڑی مناسبت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔الفاظ کے انتخاب، موزونیت اور ترکیب میں انہیں کمال حاصل ہے۔آتش نے صرف فارسی تراکیب و الفاظ کو نہیں برتا بلکہ محاورے اور روزمرہ کو بھی بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

آتش کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔وہ شعری صنعتوں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔انہوں نے عام لکھنوی مزاج کے برخلاف اردو شاعری کو وقار اور سنجیدگی عطاء کی۔ان کے یہاں عشقیہ مضامین اور تصوف کے ساتھ کہیں کہیں زندگی کا فلسفہ بھی بیان ہوا ہے۔

IV. ہر سوال کے ایک نشان مقرر ہے۔

1. آتش کا پورا نام کیا ہے؟

جواب: آتش کا پورا نام خواجہ حیدر علی آتش ہے۔

2. آتش لکھنو میں کس کے شاگرد ہوئے؟

جواب: آتش لکھنو میں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔

3. آتش کی شاعری میں لکھنو کے کس شاعر سے معرکہ آرائی رہی؟

جواب: آتش کی شاعری میں لکھنو کے شاعر ناسخ سے معرکہ آرائی رہی۔

4. شاعر نے پیام بر نہ ملنے پر کیوں خوش ہے؟

جواب: شاعر پیام بر نہ ملنے پر بہت خوش ہے اس لیے وہ اپنے محبوب سے راست بات کر سکتا ہے۔

5. محبوب کو گل کے روبرو کرنے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: محبوب کو گل کے روبرو کرنے کا مقصد حسن کا موازنہ کرنا ہے۔

6. زلف کا اسیر ہونا، سے کیا مراد ہے؟

جواب: زلف کا اسیر ہونا کا مطالب محبت میں گرفتار ہونا ہے۔

7. آتش کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟

جواب: آتش شاعر دبستان لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں۔

8. آتش کا انتقال کب ہوا؟

جواب: آتش کا انتقال 1847ء کو ہوا۔

21 : حسرتؔ موہانی

(روشن جمال یار سے انجمن ہے تمام)

سوال 1. حسرتؔ کی شاعرانہ خوبیوں اور ان کے اسلوب پر روشنی ڈالئے؟

جواب: حسرتؔ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ حسرتؔ دونوں میں یکساں طور پر سرگرم عمل رہے۔ ایک طرف شاعر کی حیثیت سے نہایت اہتمام سے شعر کہتے ہیں۔ ''نکات سخن'' لکھ کر اردو ادب کی خدمت کی اور دوسری طرف ادبی رسالے اور ''اردوئے معلیٰ'' نکالتے رہے۔ اسی طرح ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے ہر لحہ فکر مند رہے۔ انگریز سرکار نے انہیں کئی بار گرفتار کیا اور جیل میں ڈالا مگر وہ اپنی بے باکی صاف گوئی سے باز نہیں آئے۔ حسرتؔ نے یوں تو نظمیں بھی کہی ہیں مگر انہیں غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی شہرت دوام حاصل ہوئی۔ جب انہوں نے شاعری شروع کی تو اردو غزل کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو چکی تھیں مثلاً غزل میں بدلتے حالات کے اظہار کی طاقت نہیں ہے۔

غزل زمیندارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ غزل میں ریزہ خیالی اور انتشار ہے۔ اس لیے غزل کو ترک کر دینا ضروری ہے۔ ان حالات میں حسرتؔ نے غزل کا مکمل دفع کیا اس کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے برابر غزلیں کہتے رہے۔ غزل کو نئے رنگ و آہنگ عطاء کئے۔ حسرت کے کوششوں سے غزل کا احیاء ہوا اور اس کا کھویا ہوا وقار حاصل ہو گیا۔

مومنؔ کی غزل کی طرح کلام حسرتؔ میں بھی عشق کی ساری کیفیت اور حسن کے سارے روپ نظر آتے ہیں۔ حسرت نے زیادہ دیوانوں پر مشتمل اپنا کلیات 1943ء میں شائع کیا۔ ''مشاہدات زنداں'' میں جیل کی زندگی کے تجربات کا اظہار کیا ہے۔

حسرتؔ نے اپنی غزل میں ایک ایسے محبوب کا تصور پیش کیا جو خیالی تھا۔ حسرتؔ کا خیالی محبوب ہماری دنیا کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ ایک ایسی لڑکی کا کردار جو شوخ ہے۔ حسرتؔ اپنے محبوب کے جسم، لباس، رنگ اور خوشبو کا ذکر غزلوں میں بڑے فطری اور مہذب انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا عشق پاکیزہ اور ان کا محبوب چنچل مگر پاکباز ہے۔

سوال 2. حسرت کی غزل کی خصوصیات بیان کیجئے؟

جواب: حسرتؔ نے اردو غزل کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔ اس کا احیاء کیا اس میں نئی روح پھونکی اور اس وقت غزل کو معیار و وقار عطا کیا۔

جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم کے عروج کے آگے غزل کے زوال کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حسرتؔ نے اردو غزل کو محبوب کا نیا تصور دیا۔ ان کی شاعری میں ہمارے معاشرے کی ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جس کا وجود خیالی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔

ان کی شاعری کا بڑا حصہ محبوب سے لگاوٹ اور اس کے حسن و جمال کے ذکر سے لبریز ہے۔ انہوں نے غزل کے پرانے انداز کو ترک کر کے غزل میں سادگی کو رواج دیا۔ انہوں نے فلسفے اور تصوف کی پیچیدگیوں کو موضوع نہیں بنایا۔ حسرتؔ کے نزدیک اچھی شاعری کی تین اوصاف ہیں (1) جذبات نگاری (2) جذبات عالی اور (3) واقعہ نگاری اور یہی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے۔ حسرتؔ نے اردو غزل میں وحدت تاثر کو داخل کیا اور واقعہ نگاری اور بیانیہ عناصر کو پہلی بار مضبوطی سے غزل کی روایت اور اسلوب کا حصہ بنایا۔ حسرتؔ کا اسلوب عام طور پر روایتی غزل سے لیا گیا مگر مضامین کی ندرت نے پرانے اسلوب میں نئی روح پھونک دی ہے۔

جمال یار کی جیتی جاگتی تصویر، محبوب کے خوبصورت بدن کی جمالیاتی تصویر، لباس اور زیورات کا غیر روایتی بیان حسرتؔ کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

حسرت کے یہاں سیاسی شاعری بھی جگہ پاتی ہے مگر ان کی پہنچان ان کی عشقیہ غزلوں سے ہے۔

سوال 3. اس غزل میں حسرتؔ نے محبوب کے حسن کے کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے؟

جواب: اردو کی غزلیہ شاعری میں محبوب کے حسن اور ادا کی تعریف کرنے کی روایت موجود رہی ہے۔ حسرتؔ نے اس روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے رنگ میں محبوب کی تعریف کی ہے اور محبوب کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے ؎

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا آتش گل سے چمن تمام

اس شعر میں حسرتؔ نے اپنی مخصوص عشقیہ نگاہوں سے محبوب کا مشاہدہ کیا ہے۔ جن کی رو سے محفل میں اس کے محبوب کی موجودگی سے ہی روشنی یعنی چمک دمک یا زندگی ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں

محبوب کی خوبصورتی کو ظاہر کرنے کے لئے ''آتش گل'' کی ترکیب کو تشبیہ کے طور پر استعمال کیا ہے یعنی حسرتؔ نے محبوب کے حسن و جمال کے اظہار کے لئے ''آتش گل'' کی نئی ترکیب نکالی۔اس کے علاوہ حسرتؔ نے محبوب کے حسین جسم کی تعریف کی ہے۔اردو شاعری میں شاعروں نے محبوب کی آنکھ، ناک، رخسار، لب پیشانی وغیرہ کا ذکر اکثر ہے اور اکثر اس کا بھونڈا اظہار بھی ہوا ہے مگر حسرتؔ نے اپنی غزل میں محبوب کے جسم کی تعریف تو کی ہے مگر اخلاق کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔اس کے علاوہ حسرتؔ نے محبوب کی ٹھڈی میں گڑھا ہوتا ہے۔شاعری نے اس کو آپ نور کہا ہے یعنی محبوبہ کے چہرے پر طرح طرح کے حسین مناظر بکھرے پڑے ہیں۔جس سے محبوب کا چہرہ حسن و جمال کا ایک آئینہ بن گیا ہے۔

سوال 4. مبالغہ کی تعریف کیجئے اور مثالیں دے کر سمجھایئے؟

جواب: مبالغہ کی تعریف: مبالغہ بھی ایک صنعت ہے اس میں کسی کی تعریف یا مذمت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔مثلاً

چمکے جو تیغ قہر کسی روز جنگ میں
ٹھہرے نہ سایہ خوف کے مارے بدن کے پاس

22 : محمد علوی

دروازے پر پنجرے میں

سوال 1. محمد علوی کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیجئے ؟

جواب: 1960ء کے بعد اردو کے جدید شاعروں میں اپنی پہچان قائم کرنے والوں میں محمد علوی کو اپنے مخصوص انداز بیاں اور لب ولہجہ کی وجہ سے ایک خاص اور منفرد مقام حاصل ہے۔ محمد علوی نے غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ہیں اور انہیں دونوں صنفوں پر برابر عبور حاصل ہے۔ علوی کی شعری کائنات میں ذاتی حالات و کیفیات کے ساتھ ساتھ فطرت، گاؤں کے مناظر، کھیت کھلیان، گھر خاندان، بیوی بچے، گلی، محلّہ یعنی درمیانہ مسلم سماج کی تہذیبی، ثقافتی، مذہبی صورت حال اور ماضی کی یادوں کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اسی علوی کی شاعری میں پیڑ، پودے، چرند، پرند اور دیہی وقصباتی زندگی سے متعلق الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ محمد علوی اپنی غزلوں میں نہایت آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ سادہ سلیس اور روزمرہ زندگی کے متعلق ہوتے ہیں اور ان کے اکثر اشعار عام فہم اور سلیس ہیں۔ جس کی وجہ اشعار میں سہل ممتنع کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ سہل ممتنع محمد علوی کی شاعری کی عمومی خصوصیت ہے۔ یہ کیفیت ان کی بیشتر غزلوں میں پائی جاتی ہے جب کسی شعر میں ایسے بیانات پیش کئے جائیں جو بہت آسان اور عام فہم اور رواں ہو اور قاری یا سامع کو یہ گمان گزرے کہ ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں مگر جب کوشش کرے تو اس کے لیے ایسا کرنا آسان نہ ہو۔ شعر کی اس خصوصیت کو ''سہل ممتنع'' کہتے ہیں اور مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہیں۔

ماضی کے حوالوں سے حال کی منظر نگاری محمد علوی کی شاعری کی عمومی خصوصیت ہے۔ محمد علوی محسوسات کے شاعر ہیں مگر وہ اپنے محسوسات براہ راست بیان نہیں کرتے بلکہ کسی نہ کسی حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

سوال 2. زیر مطالعہ غزل کے مطلع اور مقطع کے اشعار کی تشریح اپنے لفظوں میں کیجئے ؟

جواب: غزل کا مطلع

دروازے پر پنجرے میں طوطا ہوگا
جھوٹے برتن گھر میں کوئی دھوتا ہوگا

تشریح: شاعر نے اس شعر میں جن خیالات کا اور احساسات کا بیان کیا ہے ان کا تعلق خود شاعر کی ذات اور اس

کے گرد وپیش کے سماجی حالات سے ہے۔ دراصل شاعر ایک ترقی یافتہ عہد اور سوسائٹی میں اس قصباتی زندگی اور سماج کو یاد کر رہا ہے۔ جس میں اس نے اپنے بچپن کا زمانہ گزارا ہے۔ اس وقت کا منظر شاعر کی آنکھوں میں بسا ہوا ہے جب عام طور پر گھر کے دروازے پر پنجرے میں طوطا ہوا کرتا تھا اور گھر کے چھوٹے برتن گھر کی بڑی بزرگ شخصیت یعنی ماں دھویا کرتی تھیں۔ گویا آج جب کہ شاعر گاؤں چھوڑ کر شہر کی ترقی یافتہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایسے میں اپنے بچپن کے قصیاتی زمانے کو یاد کر کے ایک قسم کی لذت اور طمانیت محسوس کر رہا ہے اور تصور کر رہا ہے کہ وہاں زندگی آج بھی اسی انداز پر ہوگی۔ محمد علوی نے اس شعر میں اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے ماضی کی اور متوسط طبقے کی قصیاتی زندگی کو بیان کیا ہے جس سے اس وقت کے معیار زندگی اور سماجی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

غزل کا مقطع:

کوئی نہیں کہتا ہے اب علوی جاگو بھی
دن چڑھ آیا ہے اتنا کوئی سوتا ہوگا

تشریح: مقطع میں شاعر نے خالص ذاتی حوالے سے کام لیتے ہیں پوری غزل میں پیش کی گئی فضاء کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا ہے اور بچپن سے وابستہ انہیں یادوں سے مربوط کر دیا ہے۔ جن سے غزل شروع ہوئی تھی۔ شاعر اپنے بچپن کے ان دنوں کو یاد کر رہا ہے جب وہ دیر تک سوتا تھا اور اس کی ماں اس کو بار بار جگاتی تھی۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اب وہ بڑا ہو چکا ہے۔ اب دیر تک سونے پر کوئی جگانے والی شخصیت موجود نہیں ہے۔

سوال: آپ کے نصاب میں شامل محمد علوی کی غزل کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کیجئے؟

جواب: محمد علوی کا شمار اردو کے جدید شعرأ میں ایک اہم اور نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کا کلام نظموں اور غزلوں دونوں پر مشتمل ہے اور انہیں دونوں پر دسترس حاصل ہے۔ زیر مطالعہ غزل محمد علوی کی غزلیہ شاعری کا نمائندہ ہے اور اپنے انداز، زبان و بیان لفظیات اور پیرایہ اظہار کے لحاظ سے ان کی شاعری کی تمام خصوصیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ محمد علوی کی غزلوں میں عام فہم الفاظ رواں سلسیس بیانات اور پیش کردہ فضاء اور ماحول سے مناسبت رکھنے والے الفاظ غزل کو ابلاغ اور ترسیل کے جملہ لوازمات سے ہمکنار کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ غزل میں پنجرہ، دروازہ، چھوٹا برتن، ٹونکی، کھٹ پتلی، پیڑ بونا، ہل جوتنا وغیرہ الفاظ میں غزل کو پیش کردہ تہذیبی اور سماجی پس منظر سے بھرپور وابستگی کی بناء پر قابل توجہ بنا دیا ہے۔

23 : نظم کی دیگر اصناف

سوال: مرثیہ کی تعریف کیجئے اور مرثیہ کے اجزائے ترکیبی لکھئے؟

جواب: مرثیہ لفظ ''رثا'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا۔ اصطلاح میں مرثیہ سے مراد وہ نظم ہے جو کسی شخص کے مرنے پر لکھی جائے اور جس میں مرنے والوں کی خوبیاں بیان کی جائے اور اپنے غم کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اردو میں مرثیہ کا ایک خاص مفہوم متعین ہو گیا یعنی مرثیہ سے مراد وہ نظم ہے جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً حالؔی نے غالبؔ کے مرنے پر مرثیہ لکھا اور اقبال نے داغؔ کے انتقال پر لکھا۔

اردو میں مرثیہ کی تبداء دکن میں ہوئی۔ دہلی میں میرؔ و سوداؔ نے مرثیہ لکھنے میں نام پیدا کیا۔ لکھنؤ میں میر خلیق پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مرثیہ خوانی میں کمال پیدا کیا۔

اسی زمانے میں مظفر حسین ضمیر بھی مشہور مرثیہ گو شاعر تھے۔ انہوں نے مرثیہ سے رزمیے اور دوسرے سراپے لکھنے شروع کیے اور مرثیوں کو تحت اللفظ پڑھنے کی ابتداء کی۔

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی:۔

(1) چہرہ: مرثیہ کی تمہید کو کہتے ہیں۔ اس میں شاعر اپنے مضامین نظم کرتا ہے جن کا اصل موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا جیسے صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت، دنیا کی بے ثباتی اور اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت وغیرہ۔

(2) سراپا: اس میں مرثیہ کے ہیرو کے قد و قامت، خدوخال اور دیگر اوصاف کا بیان ہوتا ہے۔

(3) رخصت: اس حصے میں ہیرو کو میدان جنگ میں جانے کے لیے حضرت امام حسینؓ سے اجازت لیتے ہوئے اور تمام عزیزوں سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

(4) آمد: اس حصے میں ہیرو کے گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ میدان جنگ میں آتے کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ اس میں گھوڑے کی مبالغہ آمیز تعریف بھی نظم کی جاتی ہے۔

(5) رجز: ہیرو اپنی زبان سے اپنے خاندان کی تعریف کرت اہے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ جنگ کے معاملات میں اپنی مہارت کا اظہار کرتا ہے۔

(6) جنگ: ہیرو مقابل فوج کے کسی نامور پہلوان سے یا پوری فوج سے بڑی شجاعت اور بہادری کے ساتھ لڑتا ہے۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کی تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

(7) شہات: ہیرو میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے آخر کار دشمنوں کے ہاتھ زخمی ہو کر شہید ہو جاتا ہے۔ مرثیہ کے اس جز میں اسی شہادت کا بیان انتہائی موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔

(8) بین: یہ مرثیہ کا آخری حصہ میں مرثیہ گو اس مقام پر ایسی منظر کشی کرتا ہے کہ پوری مجلس رونے اور ماتم کرنے لگتی ہے۔

یہاں پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جن میں تمام اجزائے ترکیبی ملتی ہیں۔ ایسے مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں صرف حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر اظہار غلم کیا گیا ہے۔

سوال: کوئی دو مشہور مرثیہ نگاروں کے نام لکھئے اور ان کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں تحریر کیجئے۔

جواب: اردو کے مشہور مرثیہ نگار میر ببر علی انیس ہیں اور ان کے حریف ہم عصر اور حریف مرزا دبیر ہیں۔ میر ببر علی انیس 1804ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد میر خلیق کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ میر انیس کا مطالعہ وسیع تھا۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے میں رائج علوم سے خوب واقف تھے۔ انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ انیسؔ نے شاعری کی غزل سے کی لیکن بہت جلد غزل چھوڑ کر مرثیہ کہنے لگے۔ انیسؔ کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادر الکلامی ہے۔ واقعہ نگاری میں میر انیسؔ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ زبان و بیان کے معاملے ہیں۔ انیسؔ کا مقابلہ کوئی اور مرثیہ گو نہیں کر سکتا۔ ان کے کلام میں جو سلاست، روانی فصاحت، بلاغت اور شگفتگی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ انیسؔ نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں کو ایک اعلیٰ فن کا درجہ دیا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ماہر فن کار بھی تھے۔ زبان پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ لفظوں کے انتخاب اور استعمال میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ منظر نگاری اس کمال کی کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھیچ جاتی ہے۔ جذبات کی عکاسی میں انہیں بڑی مہارت حاص ہے۔ میر انیسؔ کے ہم عصر اور حریف مرزا دبیر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال ہے۔ دبیرؔ اپنے

مرثیوں میں پرشکوہ الفاظ شاعرانہ استدلال اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ گوئی کو ایک اعلیٰ فن کا درجہ دیا اور اسے استحکام بخشا اور اجزائے مرثیہ کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھایا۔ انیسؔ اور دبیر کے بعد بھی مرثیہ لکھے گئے لیکن کوئی اس فن کو ان دونوں سے آگے نہ لے جا سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ مرثیوں کی ترقی سے اردو شاعری میں زرمیہ شاعری (جنگ سے متعلق شاعری) کی جو کمی محسوس ہوتی تھی وہ پوری ہوگئی بلکہ منظر نگاری، جذبات نگاری اور دیگر اخلاقی مضامین سے اردو شاعری اور نکھر گئی۔

سوال: مثنوی کی تعریف کیجئے اور بتلائے کہ مثنوی کی خصوصیات کیا ہے اور مثنوی پڑھنے کے کیا فائدے ہیں؟

جواب: مثنوی کے نعوی ہیں دود ہرا کیا ہوا۔ یا دو دو والا۔ اصطلاح میں ان مسلسل اشعار کے مجموعے کو مثنوی کہتے ہیں۔ جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر شعر میں الگ الگ قافیہ لایا جاتا ہے۔ ہیت کے اعتبار سے مثنوی کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مطلع ہوتا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔

اردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنیوں میں میر حسن کی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' ہیں اور مختصر مثنویوں میں میر تقی میرؔ کی مثنویوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ طویل مثنویوں میں عام طور پر مندرجہ ذیل اجزا پائے جاتے ہیں۔

(1) حمد و مناجات (2) نعت (3) منقبت (4) حاکم وقت کی مدح (5) اپنی شاعری کی تعریف
(6) مثنوی لکھنے کا سبب (7) قصہ یا واقعہ (8) خاتمہ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مثنوی میں یہ تمام اجزا موجود ہوں۔

مثنوی پڑھنے کے فوائد:

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنف سخن ہے۔ اس میں جن اور پریوں کے حصے اور ماقوف الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و عشق کے قصے خوشیوں اور غموں، جنگ، بزم طرب شادی اور کوت کی رسموں، اخلاقی قصوں، تصوف کے مسائل اور مذہبی تعلیمات کا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط ن ہوگا کہ کسی زمانے کے سیاسی، سماجی حالات رسم و رواج رہن سہن کے طریقے، لباس اور زیورات وغیرہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مثنوی کا مطالعہ سب سے زیادہ مفید ہے۔

سوال: اردو کی دو مشہور مثنویوں اور ان کے شعرا کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: اردو کی سب سے زیادہ مشہور و معروف مثنوی ہے۔ مثنوی سحر البیان ہے اس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی

وہ کسی اور مثنوی کو مل نہ سکی۔ عام طور پر سحر البیان کو اردو کی بہترین مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس مثنوی کے شاعر ہیں غلام میر حسنؔ اور تخلص حسنؔ تھا۔ 1736ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

میر غلام حسنؔ نے غزلیں بھی کہی، قصیدے اور مرثیے بھی لکھے لیکن ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کی مثنویاں ہیں۔ انہوں نے گیارہ مثنویاں لکھیں لیکن مثنوی سحر البیان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی کسی اور مثنوی کو نہ مل سکی۔

اس مثنوی کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اردو میں پہلی بار کسی شاعر نے ہندوستانی تہذیب وتمدن، رہن سہن آداب واطوار، زیور اور لباس وغیرہ کا اتنا تفصیلی ذکر کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پوری مثنوی میں جو سلاست، روانی، شگفتگی اور رنگینی ہے وہ اس سے پہلے کسی اور مثنوی میں نہیں ملتی۔

سوال: اردو کی دوسری مشہور مثنوی کے شاعر ہیں پنڈت دیا شنکر نسیم

جواب: اردو کی دوسری مشہور مثنوی ''گلزار نسیم'' ہے۔ اس کے شاعر کا نام ہے دیا شنکر، نسیم تخلص کرتے تھے۔ 1811ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نسیمؔ نے اس مثنوی میں جو زباں استعمال کی ہے اس میں لفظی تکلفات، الفاظ کا تناسب، تشبیہیں اور استعارے اور رعایت لفظی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی سحر البیان دلی کی اور گلزار نسیم لکھنو کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔ ابتداء میں نسیم نے جو مثنوی لکھی تھی وہ بہت طویل تھی لیکن آتش نے اختصار کی طرف مائل کیا۔ اس طرح اس مثنوی میں ایک طویل داستاں کو بہت ہی مختصر کر کے پیش کیا لیکن خوبی یہ ہے کہ حسن کہیں متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ نسیم نے صنعتوں کے ذریعہ اس مثنوی کو خوب سے خوب تر بنا دیا۔

سوال: اردو کے کوئی دو رباعی گو شعرأ کے حالات لکھئے؟

جواب: 1857ء کے ناکام انقلاب کے بعد جب تمام ہندوستان پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا تو ہندوستانیوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا وہ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ اس سیاسی انقلاب اور مغربی علوم کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں میں نیا شعور پیدا ہوا اور رباعی میں ایسے مضامین کہے جانے لگے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کہے گئے تھے۔ ایسے شاعروں میں مولانا الطاف حسین حالیؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حالیؔ نے جہاں اخلاقی فلسفیانہ رباعیاں کہی وہاں اصلاحی اور سیاسی رباعیاں کہہ کر قوم کو سدھارنے کی کوشش بھی کی۔ مثلاً ان کی ایک رباعی ؎

اے علم! کیا تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آپا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس اعیال

امجد حیدر آبادی:۔

امجد حیدر آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں جن کی تمام تر شہرت رباعی گوئی کی بدولت ہے۔امجد حیدر آبادی پورا نام سید امجد حسین تھا۔1886 کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔امجد نے اپنی شاعری میں تصوف اور اخلاق کے مضامین پیش کئے۔ان کا کلام نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔اوران کے مزاج میں انکساری قناعت اور سادگی تھی۔امجد کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔رباعی گوشاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے۔زیادہ رباعیات امجد کی تین جلدوں کے علاوہ، ریاض امجد، نذر امجد اور خرقۂ امجد ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

رباعی:۔

ہر چیز کو کھونا بھی بڑی دوت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے

افلاس نے سخت موت آساں کردی۔دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دوت ہے۔

سوال: قطعہ کی تعریف کیجئے اوراس کی اہمیت اورافادیت کوواضح کیجئے؟

جواب: غزل کے دو یا دو سے زائد ایسے اشعار جن میں کوئی مضمون یا خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہوقطعہ کہا جاتا ہے۔

غزل گوشاعر اگر اپنے خیال کوایک شعر میں مکمل نہیں کر پاتا تھا تو ایک سے زیادہ اشعار میں خیال ادا کر کے اسے قطعہ بند کر دیتا تھا اور اس کے لیے ''ق'' کی علامت لگادی جاتی تھی لیکن جدید شاعری میں دو اشعار یا چار مصرعوں کے قطع کو ایک علیحدہ صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے ہیں۔ قطعہ سے ہماری مراد وہ صنف سخن ہے جس میں شاعر دو یا دو سے زیادہ اشعار کو خیال اور مضمون کے اعتبار سے تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔قطعہ اور غزل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قطعہ کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں جبکہ غزل کے ہر شعر کا ایک آزاد اور جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔

قطعہ کی اہمیت:

رباعی کی طرح قطعہ بھی دو اشاعر یا چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ رباعی میں پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے جب کہ قطع میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی عام طور پر قطع میں مطلع نہیں ہوتا۔ رباعی کی ایک مخصوص بحر ہے جب کہ قطعہ کسی بھی بحر میں کیا جاتا ہے۔ ہم قطعہ کے ذریعہ ایک مختصر نظم کو سمٹ کر چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ قطعہ گو شاعر چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پوری شدت اور تاثر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دور حاضر میں شعرا نئے نئے مضامین کو قطعات میں پیش کر رہے ہیں مثال کے طور پر وسیم بریلوی کا ایک مشہور قطعہ ہے

ٹوٹی ہوئی قبروں پر بال بکھرائے
جب کوئی ماہ جبیں رتی ہے
میں یہ اکثر خیال کرتا ہوں
موت کتنی حسین ہوتی ہے

سوال: رباعی کی تعریف کیجئے۔ اس کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: غزل قصیدے اور مثنوی کی طرح رباعی کا نام بھی عربی سے نکلا ہے۔ یہ لفظ ربع سے بنا ہے۔ جس کے معنی چار کے ہیں۔ اس اعتبار سے رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی اور ترانہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر چار مصرعے والی نظم کو رباعی نہیں کہتے۔ رباعی ایک خاص بحر اور مخصوص وزن کے تحت لکھی جانے والی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔ اس بحر کا نام ''ہزج'' ہے۔ رباعی کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ کبھی کبھی تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوگا۔ قطع کے پہلے دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ مضمون کے اعتبار سے چاروں مصرعوں سے بات کا مطالب واضح ہوتا ہے۔ رباعی کا آخری مصرعہ خاص طور سے بہت زوردار ہوتا ہے۔ یہ پوری رباعی کا نچوڑ اور نقطہ عروج ہوتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے رباعی میں حسن و عشق، فلسفہ، تصوف، مذہب، نصیحت اور شاعر کے ذاتی حالات کا بیان ہوتا ہے۔

رباعی کے الفاظ کے انتخاب اور اسلوب بیان میں متانت اور معروفیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اردو شاعری میں رباعی کی روایت زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ شمالی ہند میں شیر، شاعری نے کچھ نہ کچھ رباعیاں ضرور کہی ہیں۔

شمالی ہند کے مشہور شاعروں میں مرزا رفیع سودا نے تقریباً تمام مضامین باندھے ہیں۔ دکن میں امجد حیدر آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں جن کی تمام تر شہرت رباعی گوئی کی بدولت حاصل ہوئی۔

24 : سودا

(قصیدہ)

سوال: قصیدہ کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے؟

جواب: قصیدہ کی تعریف: وہ نظم جو قصد کر کے حالات کے متعلق لکھی جائے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے بنا ہے کیونکہ اس میں شاعر ایک خاص موضوع پر ارادہ کر کے پوری توجہ کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ اصطلاح میں ایسی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف یا مذمت کی جائے۔

قصیدہ کی بناوٹ یا ہیئت:۔

غزل کی طرح قصیدے کے بھی پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جو مطلع کہلاتے ہیں۔ باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ قصیدے میں کبھی کبھی ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں۔

قصیدے کی قسمیں: (الف) خطابیہ:۔

جو قصیدہ براہ راست اصل موضوع یعنی مدح یا مذمت سے شروع ہوتا ہے خطابیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

تمہیدیہ: جو قصیدہ براہ راست مدح یا مذمت سے شروع نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کچھ اشعار تمہید کے طور پر شامل کئے جاتے ہیں وہ تمہید قصیدہ کہلاتا ہے۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی:۔

ساقت کے لحاظ سے قصیدہ کے چار ارکان ہیں۔1. تشبیب نسبب 2. گریز 3. مدح یا مذمت

4. دعا یا حسن طلب

1. تشبیب یا نسبب: عربہ کے شعرا قصیدے کی ابتداء عشقیہ اشعار سے کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ اس حصہ کو تشبیب کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن اردو میں شعرا نے تشبیب میں حسن و عشق کے علاوہ پند و نصیحت فلسفہ و حکمت، موسم بہار کی کیفیت وغیرہ کو نظم کر کے اسے وسعت عطاء کی۔

2. گریز: تشبیب کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح، مذمت پر آتا ہے۔ مگر تشبیب اور اصل موضوع چونکہ دو

مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔اس لئے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے شاعر ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہتا ہے۔ان اشعار کو گریز کہتے یں۔ یہ تشبیب اور مدح کے درمیان کڑی کام کا کرتا ہے۔

گریز قصیدے کا سب سے نازک حصہ گریز کے اشعار جتنے خوبصورت اور انوکھے ہوتے ہیں قصیدہ اتنا ہی معیاری مانا جاتا ہے۔

3. مدح یا مذمت:

قصیدے کا اصل موضع مدح یا مذمت ہے۔مدح میں جس کی تعریف کی جاتی ہے اس کا علم و فضل عدل وانصاف دلیری اور سخاوت وغیرہ کو بہت بڑھا چڑھا کر مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مدح اگر بزرگانِ دین کی ہوتی ہے تو اشعار میں عقیدت اور احترام جھلکتی ہے اور اگر قصیدہ انعام کی غرض سے کہا جاتا ہے تو اشعار میں مبالغہ آمیز تعریف وتوصیف پائی جاتی ہے۔

4. دعا یا حسن طلب:۔

یہ قصیدے کا آخری حصہ ہے۔مدح کے بعد بزرگان دین کے توسط سے خدا سے دعا مانگی جاتی ہے اور اگر قصیدہ کی شخص کی مدح میں ہے تو حسن طلب سے کام لے کر شاعر اپنے لئے انعام کا طالب ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں صرف ممدوح کی صحت اور درازی عمر وغیرہ کی دعا مانگ کر قصیدہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

سوال: سودا کے انداز بیان پر روشنی ڈالئے؟

جواب: سودا بڑے باکمال اور قادرالکلام شاعر تھے۔انہوں نے غزلوں میں طبع آزمائی کی اور ایک مخصوص انداز اختیار کیا۔جس میں دردمند کی جگہ شوخی، موز و گداز کی جگہ نشاط نمایاں ہے۔سودا نے مرثیہ نگاری بھی اور مسدس کی شکل میں مرثیوں کی باقاعدگی عطاء کی۔

سوداؔ مزاجاً قصیدے کے شاعر ہیں۔ان کے مزاج میں شوخی درا کی اور جوش وولولہ تھا۔اس لیے وہ قصائد میں بہت کامیاب ہوئے۔ان کا مرثیہ قصیدہ گوئی میں سب سے بلند ہے۔ان کے فصائد شوکت الفاظ، نازگی مضامین اور بلند خیالی کی وجہ سے قصاحت و بلاغت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔سوداؔ کے قصائد میں مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں۔

سودا اردو قصید نگاری میں اپنی انفرادیت کے لیے مشہور ہیں۔ان کے قصائد میں شکوہ الفاظ متانت اور جوش بیان پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔انہوں نے قصائد کو اپنے حسن بیان سے نہایت شگفتہ اور سلیس بنا دیا

ہے۔فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ نرم اور سبک ہندی الفاظ کا استعمال ان کے قصیدوں میں ایک عجیب لطف پیدا کر دیتا ہے۔ان کا اندازِ بیان منفرد اور متاثر کن ہے۔

سوال:حسب ذیل شعر کی تشریح کیجئے؟

تجھ کو للکار کے میدان میں صف مرداں کی
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک

تشریح:اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کی بہادری کی تعریف کرتا ہے۔وہ بہت بہادر جوان مرد اور نڈر ہے۔ جب وہ میدانِ جنگ میں آگے نکلتا ہے تو سب خوف کے مارے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔کسی مرد کی مجال نہیں کہ وہ مقابلہ کے لیے سامنے آئے۔وہ مقابلے سے پہلے ہی ڈر جاتے ہیں۔

سوال:کس شعر کے ذریعہ سوداؔ نے ممدوح کی سخاوت کی تعریف کی ہے؟

جواب:

ہوگہر بار تجھ آگے جو سحابِ تیساں
برق ہوکر متبسم اسے مارے چشمک

شاعر اس شعر کے ذریعہ اپنے ممدوح کی تعریف شروع کرتا ہے۔یہ قصیدہ کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔شاعر کہتا ہے میرا ممدوح بہت سخی اور فیاض ہے۔جب بارش ہوتی ہے تو بجلی کڑک کر اس کا مذاق اڑاتی ہے اور چمک کر کہتی ہے کہ تو بھلا میرے محبوب کا کیا مقابلہ کرے گی وہ تو دریا دل ہے۔مبالغہ سے کام لیتے ہوئے شاعر نے ممدوح کی سخاوت کی تعریف کی ہے۔وہ کہتا ہے کہ بارش بھی اتنی تیزی سے..... برستی، جتنی تیزی سے وہ دولت بانٹتا ہے۔

سوال:حسن تعطیل کسے کہتے ہیں؟

جواب:حسن تعطیل کی تعریف:کسی عمل کے واقع ہونے کی وجہ کچھ اور ہو لیکن شاعر اس کے لیے کوئی اور سبب بیان کرے تو اسے حسن تعطیل کہتے ہیں۔ مثلا

پیاسی چوتھی شاہِ خدا تیں رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں جونیں فرات کی

اس شعر میں فرات کی موجوں کے ساحل سے ٹکرانے کو سر پٹکنے سے تعبیر کیا ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ

سپاہ خدا تیں رات سے پیاسی تھی اس کے غم میں موجیں سر پٹکتی تھیں۔

سوال: قصیدے کے ارتقاء کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: دکن میں جب اردو کا آغاز ہوا تو قصیدہ نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔ کیوں کہ اس زمانے میں اردو شاعر سے دلچسپی لینے والے لوگ عام طور پر صوفیائے کرام تھے۔ اس لئے ایسے قصیدے زیادہ کہے گئے جن میں خدا اور بزرگانِ دین کی مدح کی جاتی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ غالباً پہلا شاعر ہے جس نے قصیدہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس نے حمد، نعت، منقبت وغیرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی تہواروں اور موسموں پر بھی نظمیں لکھی جو قصیدے ہی کی ایک شکل ہیں۔

سودا کے زمانے تک اردو میں اچھے خاصے قصیدے کہے جا چکے تھے۔ لیکن سودا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا اگر انہیں اس فن کا امام کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ انہوں نے حمد، نعت منقبت بھی کہے اور بادشاہوں اور امیروں کی مدح بھی کی۔

قصیدے کا انداز بیان دوسرے اصناف سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرین، جوش بیان، پرشکوہ الفاظ روانی، سلاست اور جدت وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔

سودا کے قصیدوں میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی زمانے میں میر تقی میر اور قائم چاند پوری وغیرہ نے بھی قصیدے کہے۔ لیکن ان کی شہرت سودا کے مقابلے بہت کم ہے۔

اردو قصیدہ نگاری میں سودا کے بعد انشاء کا نام آتا ہے۔ انشاء نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ کے استعمال کی وجہ سمجھتے ہیں۔ دشواری ہوتی ہے اس کے علاوہ سودا کے بعد قصیدہ نگاروں میں شیخ محمد ابراہیم ذوق انہیں بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کے تمام قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔

ذوق کے ہم عصروں میں غالب اور مومن نے چند اچھے قصیدے کہے۔ مومن کے قصیدے زیادہ تر بزرگانِ دین کی مدح میں ہیں۔ غالب کے اردو میں چار قصیدے ملتے ہیں۔ جن میں دو حضرت علیؓ کی مدح میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں۔

مومن اور غالب کے بعد قصیدہ نگاری میں ایک اہم نام محسن کاکوری کا ہے۔ جنہوں نے بہت سے قصیدے کہے۔ محسن کاکوری کے علاوہ داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی، امیر شیائی، جلال لکھنوی وغیرہ نے بھی چند

قصیدے کہے مگر انہیں کوئی خاص شہرت حاصل نہ ہوسکی۔

آج نہ بادشاہ ہیں اور نہ ان کا دربار اور نہ ہی انعام واکرام کرنے کی بارش کرنے والے اور فن کی قدر کرنے قدرداں موجود ہیں۔

ایسی حالت میں اگر قصیدے کو زوال نہ آتا تو ہے تعجب کی تھی۔آج اس صنف کو گھن لگ گیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر کام کرنے والوں کی عزت اور حوصلہ افزائی صرف اسی صنف کے ذریعہ ممکن ہے۔

25 : مرزا دبیر

(مرثیہ)

I. درج ذیل سوالات کے جوابات مختصر لکھئے۔

سوال: مرثیہ کی تعریف بیان کیجئے؟

جواب: لفظ مرثیہ عربی لفظ رثاء سے بنا ہے جس کے معنی رونا، رلانا اور اظہار غم کے ہیں۔ اسی لفظ سے مرثیہ نکلا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں میت کی اچھائیوں اور خوبیوں کو ایسا بیان کرنا کے سننے والے کے دل میں رحم اور رنج وغم کے جذبات پیدا ہو جائیں لیکن اردو میں جب بھی لفظ مرثیہ استعمال کیا جائے تو اس سے وہ نظم مراد لی جائے گی جس میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے عزیز و اقارب کی شہادت کا تذکرہ کیا گیا ہو۔

اگر مرثیہ میں کسی خاص شخص کا ذکر کیا گیا ہو اور وہ کربلا کے واقعات و محمدؐ کی آل (اہل بیت) سے متعلق نہ ہو تو ایسی نظم تعزیتی نظم کہلائے گی اور ایسا مرثیہ لکھنا ہو تو شاعر کے لیے پہلے ہی عنوان کے طور پر اس کی وضاحت کر دینا ضروری ہے جیسے مرثیہ غالب وغیرہ۔

سوال: نظم کی کسی قسم کو مسدس کہتے ہیں؟

جواب: مسمط عربی لفظ ہے جس کا مادہ تسمیط ہے جس کے معنی موتی پرونے کے ہیں۔ مسمط مختلف بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے مسمط کی آٹھ قسمیں ہیں۔

1. تین مصرعوں کا بند	مثلث	(5) سات مصرعوں کا بند	مسبع
2. چار مصرعوں کا بند	مربع	(6) آٹھ مصرعوں کا بند	مثمن
3. پانچ مصرعوں کا بند	مخمس	(7) نو مصرعوں کا بند	متبع
4. چھ مصرعوں کا بند	مسدس	(8) دس مصرعوں کا بند	معشر

مسدس کا ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور باقی دو مصرعوں میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو، نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

سوال: اس مرثیے میں حضرت علی اصغر کے لیے کیا الفاظ استعمال کئے گئے ہیں؟

جواب: اس مرثیے میں شاعر نے تیسرے بند میں حضرت علی اصغر کے لیے شش ماہہ، بے زباں، نبی زادہ، مظلوم زادہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چوتھے بند میں درنجف، بانوئے لال، بشرت کا شہزادہ علی کا پوتا کہا ہے اور پانچویں بند میں پسر اور نورعین جیسے الفاظ حضرت علی اصغرؓ کے لیے استعمال کئے ہیں۔

II. درج ذیل سوالات کے جوابات 10 سطر میں دیجئے۔

سوال: یزید کی فوج کی طرف جاتے ہوئے حضرت امام حسینؓ کے دل میں کیا خیالات آ رہے تھے اور کیوں؟

جواب: حضرت امام حسینؓ کو یزید کی فوج کی طرف جاتے ہوئے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے کیوں کہ حضرت امام حسینؓ کی طبیعت میں اس قدر خودداری تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی جائز ضروریات کے لیے بھی کبھی کسی کے آگے دست دراز نہیں کیا لیکن اس وقت حضرت علی اصغرؓ کی حالت حضرت شہر بانو اور حضرت حسینؓ کو دیکھی نہیں گئی۔ وہ حضرت شہر بانو یعنی والدہ علی اصغر کیا صرار پر پانی مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے اندر اس قدر غیرت تھی کہ ان کے قدم نہیں اٹھتے تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ وہاں جا کر کیا کہوں گا اور پانی کس طرح مانگوں گا۔

یہی سوچتے ہوئے وہ یزید کی فوج کی طرف چل پڑے اور قریب پہنچ کر ان کی طرف دیکھ کر گھبرا گئے شرم کے مارے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور زبان بند ہو گئی اس لیے بچے کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر حضرت علی اصغر کا پاس کی شدت کا نڈھال چہرہ ان لوگوں کے سامنے کر دیا اور بس اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ میں اپنے لیے کچھ مانگنے نہیں آیا بلکہ یہ معصوم بچہ مجھے یہاں لے آیا۔

سوال: آخری بند میں شاعر نے حضرت امام حسین کے کن جذبات کی ترجمانی کی ہے؟

جواب: شاعر مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر نے آخری بند میں حضرت امام حسینؓ کے جذبات کی خوب عکاسی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ حضرت حسینؓ اپنے لخت جگر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں بیٹا! تمہاری پیاس بجھانے کے لیے میں ان لوگوں کو جتنی منتیں کر سکتا تھا کر لیا ہوں اور تمہارے مقام و مرتبے کا، معصومیت کا واسطہ بھی دے چکا ہوں۔ اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب تم ہی اپنا منہ کھول کر اپنی پیاس سے سوکھی ہوئی زبان انہیں دکھا دو شاید کہ ان ظالموں کو ترس آ جائے اور یہ تمہیں پانی پلا دیں۔ جب حضرت علی اصغر نے بمشکل تمام اپنا منہ کھولا اور زبان باہر نکالی تو حضرت امام حسین سے بچے کی طرف دیکھا نہ گیا بچے کی تکلیف کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھے اور وہ بے اختیار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر عاجز ہو گئے۔ خدارا! تو ہی اب میرے بچے کی پیاس بجھا سکتا ہے تو ہی ہے جو میرے بچے کو پیاس کی شدت میں تڑپ تڑپ کر مرنے سے بچا سکتا ہے۔ تیری ہی ذات ہے جو ظالموں کے دل میں رحم و کرم کی کرن جلا سکتی ہے خدارا! رحم و کرم کا معاملہ فرما۔

II. متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

سوال: پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری

پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

جواب: حوالہ: یہ مصرعے (شعر) ہماری درسی کتاب میں شامل مرثیہ دبیر سے لئے گئے ہیں۔ جس کے شاعر مرزا سلامت علی دبیر ہیں۔

تشریح: نصاب میں شامل مرثیے میں پانچ بند ہیں اور مرثیے کا ہر بند چھ مصرعوں کا ہے۔ جسے مسدس کہتے ہیں۔ درج بالا دو مصرعے پہلے بند کے آخری دو مصرعے ہیں جو ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں جس میں شاعر نے حضرت امام حسینؓ کی طبیعت کی خودداری اور عزتِ نفس کو بیان کیا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت علی اصغر کی پیاس کو حضرت حسین و حضرت شہر بانو جو کہ حضرت علی اصغر کے والدین ہیں اپنے لال کا تڑپنا برداشت نہیں کر سکے حضرت شہر بانو، امام حسینؓ کو مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ آپ اسے یزید کی فوج کے پاس لے جائیے اور انہیں اس معصوم بچے کی پیاس کی شدت سے سوکھی زباں بتائیے شاید کہ ان ظالموں کو ترس آ جائے اور دو ایک گھونٹ پانی پلا دیں۔

علی اصغر کے لیے والدہ کی سفارش تھی امام حسینؓ برداشت نہ کر سکے اور اپنی خودداری اور عزت نفس کا لحاظ کئے بنا دشمنوں کی طرف چل پڑے۔ اس وقت کے جذبات کو شاعر نے خوب اشعار کا پیرہن دیا ہے۔ امام حسین قدم قدم پر سوچتے رہے کہ میں وہاں جا کر کیا کہوں گا حالانکہ میں علی اصغر کو لے تو چلا ہوں، مجھے خودداری

اتنی زیادہ ہے کہ حیاء کے مارے میں ان سے سوال نہیں کرسکتا اور اگر میں منت بھی کروں تو وہ حاجت روا نہیں کرنے والے وہ تو سراسر دشمن ہیں۔ ادھر پیاس کی شدت کی تاب نہ لاکر علی اصغر کی جان جائے گی اور ادھر میری آبرو تار تار ہو جائے گی۔

سوال: متن کے حوالے تشریح کیجئے۔

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

جواب: حوالہ: یہ مصرعے درسی کتاب میں شامل مرثیہ دبیر کے دوسرے بند کا آخری مصرعے ہیں۔ جس کے لکھنے والے مرزا سلامت علی دبیر ہیں۔

تشریح: ان مصرعوں میں شاعر کہنا چاہتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ بالآخر فوج یزید تک پہنچ گئے ہیں اور غیرت کے مارے گھبرا کر دست سوال دراز کرنا چاہتے ہیں مگر حیاء انہیں اس کی طرف مائل ہونے نہیں دے رہی ہے۔

بہر حال غیرت سے رنگ فق بھی ہو رہا ہے اور خودداری کے جذبات کو ٹھیس بھی لگ رہی ہے لیکن پیاس کی شدت سے نڈھال علی اصغر کی حالت ان سے دیکھی نہیں گئی اور زبان سے کچھ نہ کہا بیٹے کے چہرے سے چادر نکال کر انہیں دکھا دیا اور شرم و حیا سے آنکھیں جھکا کر عرض کئے ہم اپنی مرضی سے نہیں آئے ہیں بلکہ علی اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں اور وہ غرض پیاس کی ہے۔ تم انہیں پانی پلا دو ہم یہاں سے لوٹ کر چلے جائیں گے۔ لیکن دشمنوں نے ان کی ایک نہ مانی اور بچے کی پیاس سے نڈھال چہرہ دیکھ کر بھی انہیں ترس نہیں آیا۔

سوال: متن کے حوالے سے وضاحت کیجئے

سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

جواب: حوالہ: نصاب میں شامل مرثیہ سے ماخوذ یہ مصرعے ہیں جس کا شاعر مرزا دبیر ہے۔

تشریح: حضرت امام حسینؓ مخاطب ہیں عمر ابن سعد سے جو سپہ سالار ہے یزیدی فوج کا اور دوسرا شمر ہے۔ کہتے ہیں میں تم لوگوں کا قصوروار ہوں لیکن یہ کم سن معصوم پیاسا بچہ تو تمہارا قصوروار نہیں ہے بلکہ اس بچہ کو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے۔ یہ بچہ چھ ماہ کا ہے۔ بے زبان ہے یہ کیا تمہارا برا چاہے گا۔ تم بھی خدا کے نام لیوا ہو اور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے ہو یہ نبی زادہ ہے، اور نونہال دودھ پیتا بچہ ہے تمہیں اس کی حاجت روا کرنے میں تردد نہیں ہونا چاہئے۔ بے چارہ سات دنوں سے پیاسا ہے۔ تم اس کی پیاس بجھانے کا سامان کرو۔ ارے میں مظلوم ہوں، تمہارا قصوروار ہوں لیکن یہ تو نہیں ہے۔ بے چارہ مظلوم زادہ پیاس سے تڑپ رہا ہے تم اس کی پیاس بجھادو۔

سوال: متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری بے حساب ہے

جواب: حوالہ: مرثیہ دبیر سے اخذ کئے گئے یہ مصرعے مرزا دبیر کے تخلیق کردہ ہیں۔

تشریح: حضرت امام حسینؓ فوج یزید سے مخاطب ہوکر ہر طرح کی منتیں کر کے عاجز آ چکے ہیں۔ لیکن ان پر اس کا بالکل اثر نہیں ہوا تو حضرت امام حسین اور علی اصغر کے مرتبے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ بے زباں کون ہے۔ یہ در نجف اور شہر بانو جو حضرت علیؓ کی بہو کا صاحب زادہ ہے تمہیں اس بے زباں، معصوم، شیر خوار کا واسطہ ہے اور قسم ہے اللہ ذوالجلال کی کہ بشرب کے شاہ زادے سے مراد یشرب مدینہ منورہ کا قدیم نام ہے جس کو محمدؐ نے بعد میں مدینہ کہا ہے یعنی اللہ کے نبی کے شہر کا شاہزادہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کا پوتا ہے اور اس کا سوال صرف پانی ہے یہ تم سے جاہ و منصب نہیں چاہتا صرف پانی کی چند بوندوں کا طلب گار ہے پھر اگر تم انہیں پانی پانی پلا دیں تو اس میں تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بے حساب اجر عظیم ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ تمہاری یہ دنیاوی غلطی کو بھی معاف فرمادے گا۔ اس طرح وہ تمہیں توبہ کا ایک موقع عنایت فرمائیں گا۔

III. درج ذیل سوالات کے جوابات 20 سطروں میں لکھئے۔

سوال: مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں لکھئے۔

جواب: مرثیہ کے درج ذیل اجز اُوضع کئے گئے ہیں۔

1. چہرہ 2. سراپا 3. رخصت 4. آمد
5. رجز 6. ازم یا جنگ 7. شہادت 8. بین

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میر ضمیر نے معین کئے لیکن مرثیہ میں اس کی پابندی خود میر ضمیر بھی پورے طور پر نہیں کئے۔

چہرہ:۔اسے مرثیہ کی تمہید بھی کہتے ہیں اور اس کا موضوع مرثیہ کے اصل موضوع سے مختلف ہوتا ہے جیسے حمد، نعت، صبح کا منظر، گرمی کی شدت وغیرہ۔

شراپا: اس حصے میں حسینی اصحاب کا تعارف ہوتا ہے اور کبھی یزید کے ساتھیوں کا سراپا بیان کیا جاتا ہے اور ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

رخصت: میدان جنگ میں جانے کے لیے اہل خانہ اور عزیزوں سے اجازت لینے کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ جہاں اہل خانہ انہیں قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔

آمد: حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کا میدان جنگ میں شریک ہونے کے بیان میں اشعار لکھے جاتے ہیں اور یہ بند رخصت اور رجز سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

رجز: جنگ کی شروعات سے پہلے ایک دوسرے اپنے اکابروں کی شجاعت اور کارناموں کا ذکر کرتے ہیں جس میں جوش اور غصے کے جذبات ہوتے ہیں۔

جنگ: یہ مرثیے کا نہایت اہم حصہ ہوتا ہے جہاں شاعر میدان جنگ کی تیاری، فوجوں کے ساز وسامان گھوڑوں کی تعریف، تلواروں کی چمک، نیزوں کی کڑک، سپاہیوں کی پھرتی، وغیرہ کا ذکر نہایت ہی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کرتا ہے۔

شہادت: اس حصے میں میدان جنگ میں حضرت حسین اور ان کے رفقاء کی بہادری، فن سپاہ گری کے کمالات کا بیان بین کی شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔

بین: یہ مرثیہ کا آخری حصہ ہوتا ہے جس میں شہدائے کربلا کی نعشوں کو خیمے میں لانے، خواتین کی آہ بکاہ متعلقین کی گریہ وزاری کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ یہی مرثیہ کا مقصد بھی ہے اور ذکر شہادت و بین کی کامیابی پر ہی مرثیہ کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔

سوال: مرزا دبیر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

جواب: مرزا دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی اور تخلص دبیر رکھتے تھے۔ 9 اگست 1803ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ایرانی النسل تھے۔ ان کے مورث الیٰ ملا ہاشم شیرازی ایران کے مشہور شاعر ملا اہلی شیرازی کے بھائی تھے۔ شیرازہ یہ خاندان دہلی آیا اور سلاطین مغلیہ کے دوباروں میں بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ مرزا دبیر کے دادا ملا رفیع شاہ دہلی کے میر منشی تھے۔

مرزا دبیر کے والد دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ کا رخ کئے اس وقت دبیر کی عمر تقریباً سات سال تھی۔ محنت اور شوق کی بدولت اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے لکھنؤ کے جید علماء سے عربی اور فارسی سیکھی، صرف ونحو، منطق اور ادب وحکمت غلام ضامن سے پڑھیں تفسیر قرآن اور اصول حدیث وفقہ کا علم مولوی مرزا کاظم علی سے حاصل کیا۔ فارسی ملا مہدی مازندرانی سے سیکھی۔

شاعری کا شوق فطری اور مرثیہ گوئی سے بچپن ہی سے شغف تھا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے نام کمایا۔ دبیر اودھ کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ مرزا دبیر کی شہرت کے زمانے میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور ان دونوں مرثیہ گویوں میں مقابلے ہونے لگے۔ میر انیس کے حمایتی انیسے اور مرزا دبیر کے لوگ دبیریے کہلاتے تھے۔ لیکن یہ مقابلے تہذیب اور متانت کی حدود میں ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مرزا دبیر کی سیرت اور ان کی تشکیل میں مولانا مرزا کاظم علی کا بڑا دخل ہے جو شاعر تو نہیں تھے مگر اپنے عہد کے شعرأ میں بہ حیثیت عالم بے بدل قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان ہی کے فیض تربیت اور تعلیم سے مرزا دبیر کی طبیعت میں تقدس، پرہیز گاری، خدا پرستی، جیسے اوصاف پیدا ہوئے۔ مرزا دبیر اکثر باوضو رہتے تھے۔ مرثیے جائے نماز پر بیٹھ کر تصنیف کرتے تھے۔ انہوں نے نہ کبھی کسی کی غیبت کی اور نہ کسی سے غیبت سنی اگر کوئی شخص کسی کے شعر پر اعتراض کرتا تو اس کو وہ علمی بات سمجھ کر جواب دیتے تھے۔

مرزا دبیر کے مرثیوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ انہوں نے رباعیات، سلام اودنوحے بھی لکھے ہیں۔ محرم کا 1875ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور اپنے گھر میں ہی دفن ہوئے۔

26 : مرزا شوق

(مثنوی)

I. درج ذیل سوالات کے جوابات 10 سطروں میں دیجئے۔

سوال 1. مثنوی کی تعریف بیان کیجئے؟

جواب: مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے یہ لفظ مثنیٰ سے بنا ہے جس کے لغوی معنی دو دو کیا گیا یا دو دو کے ہیں۔ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور اس کا ہر شعر الگ الگ قافیہ کا ہوتا ہے اس میں اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہوتی۔ بعض مثنویاں اتنی طویل ہیں کہ ایک مکمل کتاب کی شکل اختیار کر لی ہیں۔

مثنوی اردو کی جملہ اصناف سخن میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے اس میں قصیدہ کی شان و شوکت مرثیہ کا رنج وغم، غزل کا سوز و گداز، سب ہی کچھ پایا جاتا ہے۔

مولانا حالی نے مثنوی کے بارے میں اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کی تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ کارآمد یہی صنف ہے اور ہو سکتی ہے مثنوی میں ظاہری باطنی اور معنوی ہر اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے ''شاہنامہ'' اور ''مثنوی معنوی'' کا نام لینا کافی ہے''۔

سوال 2. مثنوی کی اقسام کیا ہیں؟

جواب: مثنوی کا میدان دیگر اصناف نظم کے مقابلے میں بڑا وسیع ہے اس میں جہاں اخلاقی قصے، مذہبی موضوعات، تصوف کے مسائل، سیاسی و تاریخی واقعات ملتے ہیں وہیں تہذیبی اور سماجی زندگی کے نقشے، مناظر قدرت اور عشقیہ داستانیں بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے مضمون ''اردو مثنوی کا دکنی دور'' میں دکنی مثنویاں کو چھے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1. رزم نامے 2. عشقیہ داستانیں 3. سچی کہانیاں 4. عشقیہ آپ بیتیاں

5. اخلاقی و فلسفیانہ مثنویاں اور 6. صوفیانہ مثنویاں

اسکے علاوہ امداد امام اثر نے مثنویوں کو موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1. رزمی مضامین 2. بزمی مضامین 3. حکمت آموز مضامین

4. تصوف آمیز مضامین 5. متفرق مضامین

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مثنوی کو چھے حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے:

1. مذہبی مثنویاں 2. تاریخی مثنویاں 3. ہندوستانی معاشرتی مثنویاں

4. فطری مظاہر یا موسموں کے متعلق مثنویاں 5. حب الوطنی کی مثنویاں اور

6. ہندوستانی حصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں

سوال3. صنعت تلمیح سے کیا مراد ہے اور مثنوی میں موجود تلمیحات کو قلم بند کیجئے؟

جواب: کلام میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں مگر اس کے پیچھے وہ پورا قصہ ہوتا ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ تلمیح سمجھنے کے لیے آس پاس پورے قصے کا جاننا ضروری ہے جو شعر میں لایا گیا ہے۔

مثنوی میں موجود تلمیحاتی اشعار یہ ہیں۔

کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے
تھے جو مشہور قیصر و مغفور
باقی ان کا نہیں نشانِ قبور
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

سوال4. مراعات النظر کسے کہتے ہیں؟

جواب: یہ لفظ مرکب ہے ''مراعات'' اور ''نظیر'' کا، اس کے معنی ''رعایت کرنا'' یا ''جمع کرنا'' کے ہیں۔ اس طرح کی چیزوں کے نام جن میں باہمی مناسبت ہو مراعات النظر کہیں گے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلام میں مراعات النظر سے مراد ایسی چیزوں کا ذکر کرنا ہے جن میں آپسی مناسبت یا تعلق پایا جائے۔ مثلاً

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشان باقی

مکاں باقی اور نشاں باقی ہم قفیہ اور ہم ردیف بھی ہیں اور مکاں باقی نہ رہنا اور نشاں باقی نہ ہونا دونوں میں مناسبت اور تعلق پایا جاتا ہے۔ مراد دونوں فنا ہو چکے ہیں۔

5. مثنوی کا کونسا شعر ضرب المثل بن گیا ہے اور کیوں؟

جواب: ویسے تو مثنوی مرزا شوق کے بیشتر اشعار ضرب المثل کے زمرے میں آتے ہیں لیکن آخری شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

چند جملے جو عرصہ دراز سے کسی خاص موقع پر بار بار بولے جاتے ہیں اور ان کے الفاظ اپنے اصلی معنوں سے ہٹ کر کچھ اور ہی معنی دیتے ہیں ان کو ضرب المثل کہتے ہیں۔

درج بالا شعر میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ شعر نہایت سہل، رواں اور عام فہم ہے لیکن اس میں ایک کڑوی حقیقت پوشیدہ ہے اور یہ وہی سچائی اور اٹل حقیقت ہے جس کی بدولت اس شعر کو اہل زباں نے تسلیم کرتے ہوئے ''ضرب المثل'' بنا دیا ہے کہ موت کا مزہ ہر ذی روح کو چکھنا ہے۔

II: درج ذیل سوال کا جواب بیس سطروں سے کم نہ ہو۔

سوال1. مرزا شوق کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں قلم بند کیجئے؟

جواب: نواب مراز کا اصل نام حکیم تصدق حسین خان تھا، نواب مرزا عرفیت اور شوق تخلص رکھتے تھے لیکن حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور ہوئے۔ مراز صاحب 1780ء یا 1783ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام آغا علی خاں تھا۔ شوق کا پورا خاندان حکمت وطباعت کے لیے مشہور تھا۔

شوق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔انہیں خاندانی پیشہ طب اور حکمت پر بھی عبور تھا وہ شاہی طبیب تھے۔ان کے چچا مرزا علی خان لکھنؤ کے نمائندہ حکیموں میں شمار کیے جاتے تھے وہ شاہان اودھ کے دربار میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔بادشاہ کی طرف سے حکیم الملک کا خطاب بھی ملا ہے۔

جب شوق نے ہوش سنبھالا تو اس وقت لکھنؤ میں شعر وشاعری کا بڑا چرچا تھا اس وجہ سے مرزا شوق کو بھی شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔انہیں اپنے دور کے اساتذہ میں خواجہ حیدر علی، آتش کا رنگ پسند آیا تو انہی کے شاگرد ہو گئے۔ابتداء میں غزل کہی پھر مثنوی کی طرف متوجہ ہوئے۔

مرزا شوق کی سب سے پہلی مثنوی فریب عشق ہے، مثنوی، بہار عشق کے بعد لکھی گئی اور آخر عمر میں انہوں نے مثنوی ''زہر عشق'' لکھی۔ان کی یہ آخری مثنوی بہت مشہور ہوئی اس مثنوی میں دنیا کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت پر بڑے پر اثر اشعار ملتے ہیں۔اس مثنوی کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور مرزا شوق کا بیان بڑا آفریں ہے۔

کہتے ہیں کہ شوق کی جوانی کے موسم میں شہر کے خوب صورت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا عیش پسند اور رنگین مزاج تھے۔اس لیے ان کے بزرگوں نے انہیں دربار سے الگ رکھا تھا۔واجد علی شاہ کے زمانے میں دربار سے وابستہ ہوئے۔پانچ ہزار روپے وظیفہ مقرر ہوا انعامات واکرام سے بھی نوازے گئے وہ ذی علم اور طبیب حاذق تھے۔

شوق 30 جون 1871ء کو انتقال کیے اور لکھنؤ کے ریلوے لائن کے نیچے قبرستان میں دفن ہوئے۔

سوال: درج ذیل اشعار کی متن کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے

حوالہ: یہ نصاب میں شامل مثنوی کا پہلا شعر ہے جس کو مرزا تصدیق حسین خان شوق نے لکھا ہے۔

تشریح: شاعر نے اس شعر میں بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے جیسی ہے جہاں مسافر دم بھر ٹھہرتے ہیں اور صبح ہوتے ہی اپنی منزل کا رخ کرتے ہیں۔اسی طرح انسانوں کے لیے اس دنیا کی حیثیت ایک سرائے جیسی ہے اسے کچھ وقت گزار کر یعنی اپنی زندگی پوری کر کے دنیا سے کوچ کرنا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی یہ معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ دنیا بھی اور جو کچھ اس میں ہے سب کے سب فنا ہو جائیں گے اس لیے ہمیں اس فانی دنیا سے دل نہیں لگانا چاہیے۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

حوالہ: یہ درسی کتاب میں شامل مثنوی کا دوسرا شعر ہے جس کے خالق حکیم تصدق حسین خان ہیں۔

تشریح: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے ایسے مشہور و معروف لوگ گزرے جو عالی شان محلات اور پرسکون مکانوں میں رہتے تھے اور جنہیں اپنے مسکن پر ناز تھا۔ آج نہ وہ لوگ باقی ہیں اور نہ ان کے عالی شان مکانات کا کوئی پتا ہے سب کچھ ختم ہو چکا ہے اگر کچھ مشہور بار دشاہوں کے مضبوط محلات کے آثار بھی ملتے ہیں تو وہ کھنڈر بن چکے ہیں۔

غرض شاعر ان سب باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس دار فانی میں بادشاہ ہو کہ فقیر مشہور و کہ گم نام، طاقت ور ہو کہ کم زور انجام سب کا ایک ہی ہے اور وہ ہے فنا ہونا اور انہیں بڑے بڑے محلوں اور مکانوں کو چھوڑ کر تنگ و تاریک قبروں میں دفن ہونا ہے۔

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

حوالہ: یہ شعر ہماری درسی کتاب کی مثنوی سے ماخوذ ہے جس کے لکھنے والے شاعر مرزا نواب شوق ہیں۔

تشریح: شاعر نے مشہور لوگوں، بڑی بڑی عمارتوں، خوب صورت باغوں اور بڑے بڑے معروف بادشاہوں کے ختم ہو جانے کی مثالیں دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ انسانوں کی بھیڑ، بلبلوں کے مانند ہے گویا شاعر نے افسانوں کو بلبلوں سے تشبیہ دی ہے اور دنیائے سرائے فانی کو چمن سے تشبیہ دے کر اپنے کلام میں وزن پیدا کیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ماضی میں اس جہاں میں جو جا انسانوں اور اللہ کی دیگر مخلوقات کی جہل نیہل اور ہجوم تھا وہیں آج الوؤں کے رہنے کی جگہ بن گئی ہے۔

الو ہمیشہ اجاڑ اور ویران جگہ پر ہی جا گزیں ہوتے ہیں اور کھنڈرات ان کے جائے مسکن ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے شاعر نے محاورہ کو آشیانہ بوم کہہ کر استعمال کیا ہے۔

مطلب یہ کہ دنیا ماضی میں پر ہجوم تھی نہ رہی، حال بھی اب ہے ایک دن یہ بھی بے حال ہو جائے گا اور مستقبل میں تو یہ فنا و برباد ہو کر رہنے والا ہے۔

27 : رباعیات

فراق گورکھپوری

I. درج ذیل سوالات کے جوابات 10 سطور میں لکھئے۔

سوال: رباعی کی تعریف بیان کیجئے؟

جواب: رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جو ربع سے بنا ہے۔عربی میں ربع کے معنی چار کے ہیں چوں کہ یہ چار مصرعوں پر یا دو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے رباعی کہلاتی ہے۔

اصلاح میں رباعی اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہو اور جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جب کہ تیسرا مصرعہ کا قافیہ ان سب سے جدا ہوتا ہے اور یہ مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے۔

رباعی میں کسی بھی موضوع کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ مصرعہ بہ مصرعہ خیال کا تسلسل پایا جائے اور چوتھے مصرعہ میں خیال اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے اس طرح چوتھا مصرعہ رباعی کا خلاصہ ہوتا ہے۔

رباعی ایران میں پیدا ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔اگرچہ رباعی عربی لفظ ہے لیکن فارسی شاعری میں رباعی بہت پرانی صنف ہے اردو نے فارسی سے ہی یہ صنف لی ہے رباعی ایک ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے اس وجہ سے عموماً شعرا نے اس کی طرف کم توجہ دی ہے۔اردو میں رباعیات کے مجموعے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

سوال 2. رباعی کے اور کیا کیا نام ہیں؟

جواب: رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جس کے کئی ایک نام ہیں رباعی کو ترانہ، دوبیتی، چہار بیتی، چہار مصراعی، جفتی، خصی جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عربی فارسی اور اردو میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس کے ناموں میں اتنا تنوع اور ایسی رنگارنگی ہو۔

فارسی کی قدیم کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ رباعی کو ترانہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسدی طوسی نے ترانہ کے معنی ''دوبیتی'' لکھے ہیں۔ترانہ کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے نجم الغنی لکھتے ہیں:

''ترانہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں موسیقی کے وزان پر اچھے اچھے راگ
بنائے جائیں''۔

رباعی کا دوسرا نام چار بیتی ہے یعنی اس میں ہر مصرع ایک بیت ہے۔ چہار بیتی کے بعد اس کا نام دو بیتی پڑ گیا کیوں کہ چار مصرعوں کو دو شعر فرض کیا گیا اور دو مصرعوں کو ایک بیت یا شعر شمار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چہار بیتی کو دو بیتی کے نام سے موسوم کیا گیا۔

رباعی کے قدیم نام میں خصی بھی تھا۔ خصی دو بیتی کو کہتے ہیں جس کے تیسرے مصرعے میں قافیہ نہیں ہوتا۔ رباعی کو مصراعی اور جفتی بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح اگر چہ رباعی مختلف ناموں سے پکاری گئی لیکن اس کا سب سے مقبول نام رباعی ہی رہا ہے۔ البتہ جدید فارسی ادب میں اس کو ترانہ کہا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ترانہ فارسی الاصل ہے اور رباعی عربی الاصل۔

سوال۔ رباعی کی قسمیں بیان کیجئے؟

جواب: رباعی کی دو قسمیں ہیں۔ 1. رباعی مستزاد اور 2. رباعی غیر خصی

رباعی مستزاد: غزل کی طرح بعض اوقات رباعی میں بھی ہر مصرعے کے بعد ایسا ٹکڑا لایا جاتا ہے جو اس مصرعے کے رکن آخر کے برابر ہو یعنی رباعی کے ہر مصرعے کے آخر میں ایک ٹکڑے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیں تو رباعی کے چاروں مصرعوں کے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مستزاد کے ٹکڑے بھی رباعی کے چار مصرعوں کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

رباعی غیر خصی: رباعی کی ہیئت میں ایک دوسری تبدیلی یہ بھی ہوئی ہے کہ اس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں یعنی تیسرے مصرعے کا قافیہ جدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عام طور پر رباعی میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور کے شعرأ میں فراق کے یہاں غیر خصی رباعیاں ملتی ہیں۔

II. حسب ذیل سوالات کے جوابات مختصر لکھئے۔

سوال 1. رباعی کے موضوعات کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: رباعی کے لیے کوئی خاص موضوع یا مضمون مختص نہیں ہے کیوں کہ رباعی اپنے موضوع کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی ہیئت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ اس میں ہر طرح کے مضامین باندھنے کی گنجائش ہے جیسے فلسفیانہ، حکیمانہ، صوفیانہ، ناصحانہ، عشقیہ، خماریہ، بہاریہ اور اخلاقی غرض ہر طرح کے مضامین کے علاوہ مختلف سماجی

مسائل اور موضوعات بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔

سوال 2. چند رباعی گو شاعروں کے نام بتائیے؟

جواب: شعرائے دہلی اور لکھنؤ نے غزلیات وقصائد کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ میر، درد، سودا، میر حسن، حسرت، جرأت، انشاء، مصحفی، مومن وغالب، امیر مینائی، انیس، دبیر، حالی، شمس منیری، جگت موہن لال رواں نے قابل قدر رباعیاں کہی ہیں۔ ان کے بعد کے زمانے میں یگانہ، فانی، جمیل مظہری، فراق، محروم، جوش، راغب مرادآبادی، عبدالعزیز خالد، مجد حیدرآبادی وغیرہ نے خوب رباعیاں کہی ہیں اور موجودہ دور میں بھی اس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

سوال۔ رباعی اور قطعہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں اور قطعہ سے دو وجوہ کی بناء پر مختلف ہوتی ہے ایک یہ کہ قطعہ میں تین یا چار شعر بھی ہو سکتے ہیں لیکن رباعی میں صرف دو شعر یا چار مصرعے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ قطعہ میں صرف آخری مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رباعی کی بحر مخصوص ہوتی ہے جب کہ قطعہ کے لیے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے۔

III. درج ذیل سوال کا جواب تفصیل سے لکھئے۔

سوال۔ فراق گورکھپوری کے حالات زندگی بیان کیجئے؟

جواب: فراق گورکھپوری کا پورا نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراق تھا۔ 28 اگست 1896ء کو لکشمی بھون گورکھپور کے بانس گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گورکھ پرساد سہائے نامور وکیل اور ایک عمدہ شاعر تھے۔ عبرت تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔

فراق نے اگرچہ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کی سرزمین میں پر پائی اور بچپن ہی سے شعر کہنے کی مشق کی تاہم الٰہ آباد کی سرزمین نے انہیں عظمتیں دیں۔ پروفیسر ناصری کی سرپرستی سے انہیں وہ سب کچھ ملا جس کے لیے فراق کی روح بے چین تھی۔ بی اے، کے بعد ڈپٹی کلکٹری کی کرسی نے صدا لگائی۔ فراق عدالتی کرسی آباد کرنے کے بجائے کانگریسی ہونے کی پاداش میں جیل کی کوٹھری آباد کر بیٹھے۔ فراق کے لیے یہ گوشہ بھی بڑا سودمند ثابت ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور آزاد جیسے پایہ کہ شاعروں اور علم کے پرستاروں سے فراق نے جیل کی چہار دیواری کے اندر عظمت ادب پائی جس کو جیل کے باہر ڈھونڈھنا ناممکن تھا۔

فراق فلسفی بھی تھے اور مفکر بھی، لیکن قریب سے دیکھنے پر یہ پتا چلا ہے کہ نہ وہ فلسفی تھے اور نہ ہی مفکر، نہ مذہبی اور نہ اخلاقی مصلح، البتہ فراق میں مفکرانہ شان وشوکت پائی جاتی تھی۔ فراق کے یہاں تشبیہات، استعارات اور روایتی علامتیں ملتے ہیں۔ بلکہ کلام میں ندرت، پاکیزگی، دلکشی، جاذبیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

فراق نے اردو غزل کو نئی وسعتیں بخشیں، نئے موڑ دکھائے، خود راہیں استوار کیں، جن کی بنیاد پر فراق کو ہم جدید غزل کی ایک عظیم طاقت مان سکتے ہیں۔ فراق نے نظم، رباعی، سب کچھ لکھیں ہیں لیکن جو خصوصیات فراق کی غزل کو حاصل ہوئیں کسی دوسری صنف کو حاصل نہ ہوئیں۔ فراق ایک زندہ دار اور ادب بیدار شاعر تھے جس کی عظمت اس کی کامیابی کا خود سرٹیفکیٹ ہے۔

اپنی منفرد آواز اور غزل میں نئے اسلوب اور نئے مضامین کے لیے یاد کیے جانے والے فراق گورکھپور کی پہچان ان رباعیوں سے بھی نہیں جنہیں ہم روپ کی رباعیاں کے نام سے جانتے ہیں۔ فراق کی بیشتر رباعیاں عشقیہ ہیں جب کہ اردو میں رباعی کی شاعری کا اصلی مضمون بے ثباتی دنیا یا پند و نصائح رہا ہے۔ ان کی رباعیوں کے دو ادوار کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے دور کی رباعی پر آسی غازی پوری، انیس اور حالی کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا دور جو 1945ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی رباعیوں کا اسلوب الگ ہے خیالات میں انوکھا پن اور ہندوستانیت کا غلبہ ہے۔ یہ رباعیاں عشقیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تو ہیں مگر عشق کا یہ رنگ خالص ہندوستانی ہے۔ یہاں فراق نے معشوق کی ہر ہر ادا پر اپنی نگاہیں جمائی ہیں اور ان کا بیان نرالے ڈھنگ سے کیا ہے۔ فراق کی رباعیوں کی اصل پہچان محبوب کے سراپا کا معصوم بیان ہے ان کی مضمون آفرینی اور جدت نے ایک ایسا اسلوب خلق کیا ہے جسے پڑھنے والا فوراً پہچان لیتا ہے۔ فراق کا انتقال 1982ء میں ہوا۔

سوال: فراق گورکھپوری کی پہلی رباعی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

صحرا میں زمان و مکان کے کھوجاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سوجاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہوجاتی ہیں

اس رباعی میں تہذیبوں کی تاریخ کی یاد دلا کر اس امر کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ دنیا میں چاہے انسان ہو یا اس کا کوئی بھی نظم یا تہذیب اس اتار چڑھاؤ عروج وزوال سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ آج جو قوم اور

اس کی تہذیب بہت کمتر محسوس ہوتی ہے کبھی اس تہذیب کا ڈنکا بجتا تھا۔تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے جس کے نتیجے میں ہندوستان میں جس ہندو اسلامی تہذیب، گنگا جمنی تہذیب کا عروج ہوا تھا اسے آج زوال کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ واضح رہے کہ رباعی کا آخری مصرع کو ہی رباعی کی روح قرار دیا گیا ہے۔فراق نے پہلے کے تین مصرعے میں یہ نہ بتایا کہ وہ کونسی ایسی شئے ہے جو زمان و مکان کے صحرا میں یعنی تاریخ اور وقت کے صحرا یا بیان میں کھو جاتی ہے۔ جو صدیوں تک چمک دمک کی مثال بن کر زندہ رہتی ہے اور ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔یعنی روبہ زوال ہو جاتی ہے۔تنہائی میں ہر حساس انسان کی شاید یہی سوچ ہوتی ہے کہ آخر دنیا میں پائی جانے والی یہ شاندار تہذیبیں ایک دن آخر کیوں ڈوب جاتی ہیں۔شاید اس لیے کہ دنیا میں کسی شئے کو بھی ہمیشگی حاصل نہیں ہے جو پیدا ہوتا ہے اسے ایک دن مرنا ہوتا ہے دکھ کے بعد سکھ اور سکھ کے بعد دکھ انسان اور اس کی تہذیب یا معاشرے میں ایک زندہ اصول ہے۔

28 : قطعات

از:اختر انصاری

I. درج ذیل سوالات کے جوابات دیجئے۔

سوال1. قطعہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: قطعہ کے لغوی معنی ''ٹکڑے'' کے ہیں۔ اصطلاح شاعری میں اس نظم مسلسل کو کہتے ہیں جو دو اشعار سے کم کی نہ ہو۔ ہاں اس سے زیادہ اشعار ہو سکتے ہیں مگر اس نظم میں ''مطلع'' نہیں ہوتا۔ چنانچہ بغیر ''مطلع'' کی مسلسل نظم کو قطعہ کہتے ہیں۔ قطعہ کے اشعار مربوط ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی بحر مخصوص نہیں یہ ہر بحر میں لکھ جا سکتا ہے۔ قطعہ کا استعمال غزلوں کے درمیان میں بھی کیا گیا ہے۔ چار اشعار سے زیادہ شعروں پر مشتمل جو قطعات کہے گئے ہیں ان کو قطعہ سے زیادہ نظم کہنا مناسب ہے۔

سوال2. قطعہ اور غزل کے فرق کو بیان کیجئے؟

جواب: قطعہ میں غزل اور قصیدہ کی طرح مطلع کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

1. قطعہ میں غزل اور قصیدہ کی طرح مطلع کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

2. قطعہ کے سب ہی اشعار کو ملا کر مضمون پورا ہوتا ہے یعنی اس کا ہر شعر ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ جب کہ غزل کا ہر شعر جدا جدا مطلب رکھتا ہے۔

سوال3. چند قطعہ گو شاعروں کا نام لکھئے؟

جواب: موجودہ دور میں اس صنف شاعری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور تقریباً ہر شاعر اس میدان میں طبع آزمائی کیا ہے اور کر رہا ہے۔ حالی، اکبر، اقبال، جوش، فراق، فیض اور اختر انصاری وغیرہ نے بہت عمدہ قطعات لکھے ہیں جو اپنی بلاغت اور گہرے مشاہدے کی وجہ سے پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔

سوال4. قطعہ اور رباعی کے فرق کو سمجھایئے؟

جواب: خارجی ہیئت کے لحاظ سے نظم کے اصناف میں قطعہ کے علاوہ کوئی دوسری صنف سخن رباعی سے اس قدر قریب اور مشابہ نہیں ہے۔ تلفظ قطعہ ہے گمان کیا جاتا ہے کہ شروع شروع میں کسی نام نہاد تعلیم یافتہ نے غلط

تلفظ کیا ہوگا اور عام سامعین نے یہ سمجھا کہ جب پروفیسر صاحب اس طرح بولتے ہیں تو یہی صحیح ہوگا۔

عربی میں قصیدے سے پہلے کی منزل قطعہ تھی نیز فارسی شاعری کے ابتدائی نقوش بھی قطعہ ہی کی ہیئت میں ملتے ہیں جسے اس وقت دوبیتی کہا جاتا تھا۔

اردو میں قطعہ ابتداً غزل کی راہ سے داخل ہوا پھر قطعہ عموماً دو اشعار پر محدود ہو گیا اور غزل کی قید سے آزاد ایک باضابطہ جداگانہ صنف کی حیثیت اختیار کرلیا ہے اور ایک حد تک رباعی کو پیچھے ڈھکیل دینے میں کامیاب بھی ہے البتہ صنفی اعتبار سے رباعی کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ قطعہ کو میسر نہیں ہے۔

قطعے کو رباعی پر اس جہت سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ رباعی دوسری زبانوں میں جا کر کچھ اور ہوگئی رباعی نہ رہی جبکہ قطعہ نے دوسری زبانوں میں بھی اپنا اثر ورسوخ قائم رکھا۔ قطعہ اور رباعی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ رباعی کے لیے ایک بحر مخصوص ہے لیکن قطعہ کسی بھی بحر میں کہا جاسکتا ہے۔ دوسری یہ کہ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے جبکہ قطعہ میں یہ شرط نہیں صرف دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔

سوال 5. قطعہ فطرت کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے؟

جواب: اس قطعہ میں شاعر نے فطرت کے لیے دیوی کا لفظ استعمال کر کے اس عقیدے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس کے مطابق سکون کی دیوی جنگل میں رہتی ہے۔ جب انسان جنگل میں راستہ بھٹک کر یا سکون کی تلاش میں جنگل کا رخ کرتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتی ہے، اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اسے سکون بخشتی ہے حضرت خضر کی طرح۔

چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ دور جنگل میں ایک ایسی ہستی رہتی ہے جو غمگین دلوں کی اداسی دور کرتی ہے جب لوگ پریشان حال اس کے پاس جاتے ہیں تو وہ محبت سے ان کے آنسو پونچھ کر سرشار کر دیتی ہے۔ جب انسان اداس ہو جاتا ہے تو فطرت کے حسین نظاروں میں گم ہو کر سکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہری بھری وادیاں، جنگل، پہاڑ، دریاؤں کی روانی اور بادلوں کی گھن گرج یہ تمام نظارے انسانوں کو خوش کر دیتے ہیں وہ اپنے سارے غم بھول جاتا ہے۔

سوال 6. دوسرا قطعہ ''دھوپ اور مینہ'' میں شاعر نے کیا بات کہنے کی کوشش کی ہے؟

جواب: شاعر اختر انصاری نے اس قطعہ میں صنعت تکرار کا استعمال کیا ہے یعنی کہ شاعر نے ایک ہی لفظ کو دوبارہ استعمال کیا ہے جیسے ہلکی ہلکی اور روتے روتے اور سورج بے پردہ ہوا محاورتاً استعمال کیا گیا ہے۔

اس قطعہ میں اختر انصاری نے غم کے بعد خوشی کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔شاعر نے اس کی مثال اس طرح دی ہے کہ جب ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی ہیں اور رم جھم رم جھم بارش ہوتی ہے تو اچانک سورج بادلوں میں چھپ جاتا ہے اور بارش ختم ہونے پر سورج بادلوں میں سے نکل کر فضاء کو روشن کر دیتا ہے اور قوس قزح کو بکھیر دیتا ہے۔اس وقت کے سماں کو دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص روتے روتے ہنس پڑا ہو۔یہی حال ہماری اپنی زندگی کے دکھ سکھ ہے جب انسان دکھ جھیلتے جھیلتے گھبرا جاتا ہے تب اچانک اس کے حالات بدل جاتے ہیں اور اس کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

سوال 7. آلام روزگار میں شاعر کے خیالات کے اظہار کو اپنے الفاظ میں بیان کیجئے؟

جواب: قطعہ آلام روزگار میں شاعر دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ میرے مقدر میں تو مایوسیاں، ناکامیاں، غریبی اور مفلسی ہے اور ان سب کے علاوہ ایک اور غم جو سب سے زیادہ ہے وہ ہے غم یار جس نے مجھے اپنے عشق میں گرفتار کر رکھا ہے۔اس کے باوجود میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کیوں کہ میں ایک بہتا ہوا دریا کے مانند ہوں جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے چاہے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں۔دوسرے معنی میں شاعر یہ پیغام دے رہا ہے کہ جس طرح دریا سب کو سیراب کرتا ہے سب کی پیاس بجھاتا ہے میں بھی وہی کام کرتا ہوں۔

سوال 8. کیا واقعی دل کا باغ آباد ہے؟ لکھئے۔

جواب: اس قطعہ میں اختر انصاری نے دل کو ایک باغ سے تشبیہ دی ہے اور دل کے ارمانوں کو باغ کے پھولوں سے، اس طرح ایک خوب صورت استعارہ پیش کیا ہے۔

اس قطعہ میں شاعر نے جس محبوب کی آرزو کی ہے اس کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں ہے اس نے اپنے دل میں طرح طرح کے ارمان سجائے اور آرزوؤں کا محل تعمیر کیا۔وہ عمر بھر صرف محبوب کی خدمت میں پیار کی سوغات پیش کرنے کی تیاری کرتا رہا۔اب وہ پچھتا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہائے میں نے یہ کیا کیا؟ اس بات کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا کہ یہ آرزو اور ارمان کس طرح پورے ہوں گے۔

سوال 9. اختر انصاری کے انداز بیان پر روشنی ڈالئے؟

جواب: اختر انصاری نے اردو شاعری میں اپنے قطعات کی وجہ سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔انہوں نے قطعہ کو ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے برتا ہے اور بڑی باقاعدگی تسلسل اور اہتمام کے ساتھ اس کے مطالبات

کی تکمیل کی ہے۔اختر انصاری 1929ء میں اپنی قطعہ نگاری کا آغاز کیا۔وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ قطعہ کا کوئی مصرع غیر ضروری اور بھرتی کا نہ ہو۔

چار مصرعوں میں خیالات کی تکمیل آسان نہیں۔چار مصرعوں میں خیال کی بتدریج نشو ونما اور اختتام کا تقاضہ یہ ہے کہ الفاظ کے انتخاب میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے۔

اختر انصاری نے قطعہ کو ایک مکمل وحدت اور اکائی کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے قطعات پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور ان کا قطعہ خود ایک سمٹی ہوئی نظم اور ایک داستان کا لب لباب ہے۔

وہ اپنے مضمون ''کچھ اپنے قطعات کے بارے میں'' میں لکھتے ہیں:

''قطعہ نگاری کا فن ڈرامائیت کا فن ہے اور اس میں چونکا دینے والا انداز بہر حال ضروری ہے۔غزل میں اگر ایک شعر کمزور ہو تو دوسرے اشعار اس کی تلافی کر سکتے ہیں لیکن قطعہ میں ایک مصرع بھی بامعنی اور ترشا ہوا نہ ہو تو سارا آہنگ بگڑ جاتا ہے اور قطعہ ناکام ثابت ہوتا ہے''۔

اختر انصاری کے قطعات ان کے مشاہدات، ذاتی تجربات اور شخصی کیفیات کے غماز ہیں اور ان میں شیرینی، اثر آفرینی اور فکری عنصر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ان کے اکثر قطعات مظاہر قدرت کی خوبصورت اور دل آویز تصویروں سے سجے ہوئے ہیں اور ان مناظر قدرت کے تناظر میں وہ اپنے دلکش انداز میں اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جمالیاتی حظ اور انبساط حاصل کرتے ہیں۔

10۔اختر انصاری کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کیجئے؟

جواب: اختر انصاری کا پورا نام محمد اختر تھا اور شاعری کا آغاز کیا تو اختر انصاری کہلانا پسند کیا ان کے آباء واجداد محمد بن قاسم کے ساتھ دوسرے بہت سے قبائل ہندوستان آئے تو انصار کی ایک جماعت بھی ساتھ ہو گئی تھی اور اسی جماعت کے افراد بریلی اور بدایوں میں بھی پھیل گئے۔اختر انصاری 1909ء میں یوپی کے قبضہ بدایوں میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تاریخ پیدائش سرٹیفکیٹ میں یکم فروری 1908ء درج کر دی گئی تھی۔اختر انصاری کے والد کا نام محفوظ انصاری اور والدہ کا نام صفیہ بیگم تھا آپ کی عمر پانچ برس ہی تھی کہ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر میں اینگلو عرب اسکول دہلی میں داخل ہو گئے۔پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور پھر سینٹ اسٹیفن کالج (دہلی) میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ ملا۔لیکن ناکام

رہے۔ اس کے بعد ہندو کالج دہلی میں انٹرمیڈیٹ (آرٹس) سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج میں بی اے آنرز میں داخلہ لیا۔ 1931ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے لیکن چند ماہ بعد واپس ہوگئے۔ 1933 میں علی گڑھ کا رخ کیا اور BT میں اعلیٰ نشانات سے کامیابی حاصل کی۔ 1947ء میں ایم اے اردو درج اول سے کامیاب کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1927ء میں چچازاد بہن سے شادی کر لی۔ 22 جون 1983ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

29A : خط وکتابت، دفتری نوٹ، درخواست اور دفتری خط

سوال1. تعزیتی خط کس موقع پر لکھا جاتا ہے؟

جواب: ہم میں سے اکثر لوگ خطوط لکھا کرتے ہیں جس میں خیر خیریت کے ساتھ ساتھ سلامتی و دعا بھی شامل ہوتی ہے جو خط کسی کی موت واقع ہونے پر یا کوئی چیز گم ہو جانے پر یا ناکامی پر لکھا جاتا ہے اسے تعزیتی خط کہتے ہیں جس میں موت، کھوئی ہوئی چیز یا ناکامی پر افسوس کیا جاتا ہے اور مکتوب الیہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ایسے خطوط میں دلی جذبات کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

سوال2. کسی کی صحت کے بارے میں پوچھنے کو کیا کہتے ہیں؟

جواب: جو خط ہم اپنے دوستوں یا اہل خاندان کو لکھتے ہیں جس میں کسی کی صحت یا بیماری کا ذکر ہو اور جلد شفایاب ہونے کی دعا بھی شامل ہو ایسے خطوط کو عیادت کے خطوط کہتے ہیں جس میں عام طور پر مریض کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے جلد صحت یاب ہونے کے لئے دعا کی جاتی ہے۔

سوال3. کس قسم کے خطوط کو نجی خطوط کہتے ہیں؟

جواب: ایسے خطوط جنہیں ہم اپنے گھر والوں، دوستوں یا رشتہ داروں کو لکھتے ہیں انہیں نجی خطوط کہتے ہیں۔ نجی خطوط میں کسی بھی آدمی کے نجی مسائل اور واقعات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ نجی خطوط میں خاندان والوں دوستوں اور رشتہ داروں سے راز کی باتیں کی جاتی ہیں۔ نجی خطوط میں تعزیتی خطوط اور عبادت کے خطوط بھی شامل ہیں۔

سوال4. کس قسم کے خطوط کو کاروباری خطوط کہا جاتا ہے؟

جواب: تاجروں یا صنعت کاروں کے درمیان جو خطوط لکھے جاتے ہیں انہیں کاروباری خطوط کہا جاتا ہے۔ کچھ تاجر، صنعت کار یا افراد دوسرے تاجروں، صنعت کاروں سے کچھ سامان منگواتے ہیں جو سامان وصول ہوتا ہے اس کی وصولی کی اطلاع دی جاتی ہے۔ سامان دیر سے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی شکایت کی جاتی ہے ایسے خطوط کو کاروباری خطوط کہتے ہیں۔ اس میں جذبات نہیں ہوتے بلکہ کاروباری معاملات ہوتے ہیں صاف طور پر کام کی بات کی جاتی ہے۔

سوال5. نجی خط اور کاروباری خط میں کیا فرق ہے؟

جواب: نجی خط میں راز کی باتیں، گھریلوں مسائل اور نجی زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔اس میں دلی جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔غم وغصہ، رحم، ہمدردی اور افسوس کے جذبات ہوتے ہیں جبکہ کاروباری خطوط میں یہ سب چیزیں نہیں ہوتے بلکہ جو بھی بات ہے دوٹوک کہی جاتی ہے۔سامان کے نہ ملنے پر شکایت کی جاتی ہے اور وصول ہونے پر وصول یابی کا خط لکھا جاتا ہے۔ یہاں جذبات کام نہیں آتے بلکہ فائدہ اور نقصان دیکھا جاتا ہے۔

سوال 6. کسی شکایتی درخواست کو کس طرح شروع کرتے ہیں؟

جواب: شکایتی خط میں سب سے پہلے خط کے دائیں جانب جس آفیسر یا شخص کو شکایت کر رہے ہیں اس کا پتہ لکھا جاتا ہے۔ بعد آداب وتسلیمات کے اصل شکایت درج کی جاتی ہے۔شکایت کے نقصانات بتائے جاتے ہیں آخر کار اس شکایت کے حل کے لیے درخواست کی جاتی ہے اور شکایت کو دور کرنے کی امید کرتے ہوئے اس سے خواہش بھی کی جاتی ہے کہ جلد از جلد اس شکایت کو ختم کرے۔اختتام پر شکایت کرنے والے کا نام اور پتہ لکھا جاتا ہے۔

سوال 7. دفتری نوٹ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

جواب: دفتری کام کاج میں کسی بھی مسئلہ کے حل کے لیے یا کسی فائل کی منظوری کے لیے دفتری نوٹ لکھا جاتا ہے۔دفتری نوٹ شعبے کا متعلقہ کلرک یا سینئر کلرک لکھتا ہے اور اپنی دستخط کرتا ہے۔اس نوٹ یا فائل کی منظوری کے لیے اس دفتری نوٹ کو سربراہ تک روانہ کر دیا جاتا ہے۔سربراہ افسر اس نوٹ پر سرسری نظر ڈال کر دستخط کرتا ہے اور اس نوٹ کو منظوری دی جاتی ہے۔

سوال 8. فائل ایک افسر سے دوسرے کے پاس کیوں جاتی ہے؟

جواب: کسی بھی مسئلہ کے حل کے لیے یا کسی بل کی منظوری کے لیے فائل ایک افسر سے دوسرے افسر کے پاس جاتی ہے۔ فائل پر نوٹ تیار کرنے کے بعد کلرک اس فائل کو اپنے افسر کے پاس روانہ کرتا ہے اگر وہ اس کو منظوری دے دیتا ہے تو فائل دوبارہ اعلیٰ افسر کے پاس جاتی ہے اور اگر وہ بھی فائل کو قبول کرتے ہوئے دستخط کرتا ہے تو فائل اور آگے بڑھتی ہوئی سربراہ یا آفیسر تک جاتی ہے اور وہ اس پر دستخط کر کے منظوری دے دیتا ہے اس طرح فائل ایک افسر سے دوسرے افسر تک جاتی رہتی ہے۔

سوال 9. سرکاری اور نیم سرکاری خط میں کیا فرق ہے؟

جواب: سرکاری خط ایک سرکاری محکمہ سے دوسرے سرکاری محکمہ کو یا کسی فرد کی طرف سے دوسرے فرد کو لکھا جاتا ہے۔ سرکاری خط شکایتی یا درخواست کا جواب دینے کے لیے لکھا جاتا ہے جبکہ نیم سرکاری خط برابر کے آفیسر ایک دوسرے کو لکھتے ہیں یا بڑا آفیسر چھوٹے کو لکھ سکتا ہے مگر چھوٹا آفیسر بڑے آفیسر کو نہیں لکھ سکتا۔ نیم سرکاری خط سخت ضرورت اور فوری کاروائی کے لیے ہی لکھا جاتا ہے۔ ایک سرکاری خط ایک ہی مرتبہ کئی لوگوں کو اطلاع کے لیے روانہ کیا جاتا ہے جبکہ نیم سرکاری خط صرف ایک آفیسر کو لکھا جاتا ہے۔

سوال 10. ایک نجی خط کی خصوصیات کیا ہیں؟

جواب: نجی خط کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ نجی خط ایسا خط ہے جو رشتہ داروں، دوستوں اور اپنے قریبی لوگوں کو لکھا جاتا ہے۔ کسی کی شادی پر مبارک بادی کا خط، کسی کے انتقال پر تعزیتی خط اور کسی کے بیمار ہونے پر عیادت کا خط وغیرہ تمام نجی خط ہیں۔ جن میں دلی جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔

II. ذیل کے سوالات کے جواب ایک لفظ میں خالی جگہوں میں لکھئے۔

1. بھتیجے کی شادی پر جو خط لکھا جائے گا وہ کس قسم کا ہوگا۔ (نجی خط)
2. ایک فرم دوسری فرم سے سامان منگاتی ہے۔ کس قسم کا خط لکھیں گے۔ (کاروباری خط)
3. کسی سرکاری خط میں سب سے اوپر کیا لکھتے ہیں۔ (مراسلہ کا نمبر اور تاریخ)
4. ایک آفیسر دوسرے کو خط میں کیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ (جناب عالی/ڈئیر)
5. دفتری نوٹ کون تیار کرتا ہے۔ (شعبے کا کلر)

30A : صحافت اور رپورٹ

I. تفصیلی جوابات۔

سوال 1. اسکول کی کسی تقریب کی مختصر نوٹ لکھئے؟

جواب: 12 مارچ گورنمنٹ ہائی اسکول میں دسویں جماعت کے طلباء کے لیے ایک وداعیہ تقریب منعقد کی گئی جس میں صدر مدرس کے ساتھ ساتھ اسکول کے تمام اساتذہ اور طلباء نے شرکت کی۔ جلسے کی ابتداء عبدالرحمٰن کی قرأت کلام پاک سے ہوئی جبکہ محمد عبداللہ نے نعت شریف پیش کرنے کی سعات حاصل کی۔ صدر مدرس اس تقریب سے مخاطب ہوکر طلباء سے کہا کہ وہ محنت اور محبت سے تعلیم حاصل کریں۔ تعلیم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر چیز کی چوری ہوسکتی ہے مگر تعلیم کو کوئی بھی چرا نہیں سکتا۔ انہوں نے دسویں کے طلباء کے لیے مخصوص انداز میں کہا کہ دسویں کے کامیابی کے بعد انٹرمیڈیٹ میں اپنی پسند سے مضامین کا انتخاب کریں اور دلچسپی و محنت سے کالج میں تعلیم حاصل کریں۔ انہوں نے غریب و نادار طلباء سے کہا کہ اگر وہ مزید تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکتے تو فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ اپنی تعلیم کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے تمام طلباء کے لیے نیک خواہشات اور کامیابی کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد اسکول کے مختلف اساتذہ اپنی اپنی تقریروں میں طلباء کو مفید معلومات اور زرین مشورہ سے نوازا۔ اس کے بعد دسویں جماعت کے طالب علم محمد عبداللہ بات کرتے ہوئے اسکول میں گزارے ہوئے دنوں کو یاد کیا اور اسکول سے تعلیم ختم ہونے پر افسوس کا اظہار کیا اور تمام اساتذہ سے معافی چاہتے ہوئے اپنے غم کا اظہار کیا۔ اس طرح یہ اجلاس ختم ہوا جلسہ کی کامیابی پر صدر مدرس نے تمام منتظمین، اساتذہ اور طلباء کو مبارکباد پیش کی۔

سوال 2. اپنے گھر کی کسی تقریب کو رپورٹ کی شکل میں بیان کیجئے؟

جواب: یکم جنوری: مکان نمبر 72 محلّہ رحمت نگر میں واقع ہمارے گھر میں آج ہمارے چھوٹے بھائی محمد عدنان کی یوم پیدائش تقریب بڑے جشن کے ساتھ منائی گئی۔ جس میں امی، ابا کے علاوہ دادا، دادی، رشتہ دار اور محلے کے دوست واحباب نے شرکت کی۔ وقت مقررہ کے مطابق رات 8 بجے تمام لوگ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ٹھیک 8 بجکر پانچ منٹ پر محمد عدنان نے کیک کٹ کیا جس پر تمام مہمانوں نے انہیں سال گرہ کی

مبارکباد پیش کی۔کئی دوستوں نے کیک کاٹ کر انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔عدنان نے سب دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کرتے ہوئے ان کی دعائیں لیں۔اس کے بعد والد صاحب نے تمام لوگوں سے گزارش کی کہ ان کی جانب سے انتظام کئے گئے دعوت میں شرکت کریں چنانچہ تمام لوگ دعوت قبول کئے۔ دعوت ختم ہونے کے بعد تمام لوگ والد صاحب سے رخصتی لے کر اپنے اپنے گھروں کو گئے اس طرح آج ہمارے گھر میں ایک بہترین سالگرہ کی تقریب منائی گئی۔

II. مختصر جوابی سوالات۔

سوال 1. جالب صاحب نے دیوان سنگھ سے کئی دن بعد کیوں کام شروع کرایا؟

جواب: صحافت کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے جلد بازی، بے صبری اس میدان میں کام نہیں آتی۔صحافت کا پہلا اصول لگن دوسرا شوق اور تیسرا مستقل مزاجی ہے۔اگر کسی کے پاس یہ تین خصوصیات نہیں ہیں تو وہ کامیاب صحافی نہیں بن سکتا۔جالب صاحب اپنے شاگرد سے بھی یہی توقع کر کے کام کراتے رہے جب انہیں اطمینان ہوا تو ان کی ترجمہ کی ہوئی خبریں درست کرنے لگے۔

سوال 2. استاد شروع کے ترجموں کو پڑیا بنا کر ردی کی ٹوکری میں کیوں ڈالتے رہے؟

جواب: علمی میدان کا ہر کام مسلسل کوشش اور مستقل مزاجی چاہتا ہے۔صحافت میں اس کی ضرورت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔استاد جالب صاحب بھی اپنے شاگرد میں مستقل مزاجی اور لگن دیکھنا چاہتے تھے۔اسی لئے ان کے ترجموں کے پڑیا بنا کر ردی کی نظر کر دیتے تھے۔اس کے علاوہ جو کام ابتداء میں شروع کیا جاتا ہے اس میں کئی خامیاں ہوتی ہیں۔مسلسل کام کرتے رہنے سے یہ خامیاں ختم ہو سکتی ہیں۔اسی لئے جالب صاحب ابتداء میں معنوں کے ترجموں کو نظر انداز کر دیا مگر جب ایک مدت گزری تو انہوں نے معنوں کے ترجمان کی اصلاح کرنا شروع کی۔پھر چند دن کی مسلسل کوشش کے بعد اصلاح کی بھی ضرورت نہ رہی۔

سوال 3. وقفہ اشاعت کے مطابق اخبار اور رسائل کی کون کونسی قسمیں ہیں؟

جواب: اخبار یا خبر نامے وقفہ اشاعت کے لحاظ سے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔جس اخبار میں تازہ خبریں ہو اور وہ روزانہ شائع ہو رہا ہو تو اس کو روزنامہ کہتے ہیں۔اگر کوئی اخبار یا رسالہ تین دن میں ایک مرتبہ شائع ہونے والا ہو تو اس کو سہ روزہ کہتے ہیں۔اس طرح کوئی اخبار ہفتہ میں ایک دو مرتبہ شائع ہونے والا ہو تو اس کو وہفتہ واری اخبار کہتے ہیں۔جو اخبار یا رسالہ پندرہ دن میں ایک مرتبہ شائع ہو رہا ہو تو اس کو پندرہ روزہ کہتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی رسالہ مہینے میں ایک مرتبہ شائع ہورہا ہوتو ماہانہ کہتے ہیں اور اگر کوئی رسالہ تین ماہ میں ایک مرتبہ شائع ہورہا ہے تو سہ ماہی اور اگر چھے ماہ میں ایک مرتبہ شائع ہورہا ہوتو ششماہی اس طرح صرف سال میں ایک مرتبہ شائع ہورہا ہوتو سالانہ یا سالنامہ کہتے ہیں۔ روزانہ اخبار ہی میں تازہ خبریں ہوا کرتی ہیں۔ باقی تمام رسائل اور اخبارات کا دائرہ کار الگ الگ ہوا کرتا ہے۔ کوئی ادبی ہے تو کوئی مذہبی و سیاسی اور کوئی طبی وکھیل کود سے متعلق ہوتا ہے۔

سوال 4. اخبارات یا رسائل کی پالیسی سے کیا مراد ہے؟

جواب: ہر روز تازہ خبروں کے ساتھ شائع ہونے والے اخبار کو روزنامہ کہتے ہیں اس کے علاوہ بھی کئی اخبار و رسائل میں مثلاً سہ روزہ، ہفتہ واری، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ وغیرہ روزنامہ کے علاوہ تمام رسائل واخبارات کا مقصد الگ ہوتا ہے۔ ان رسائل میں تازہ خبریں نہیں بلکہ تفصیلی مضامین ہوتے ہیں جن کا تعلق ادب، تعلیم، رسم و رواج، کھیل کود، طبی معلومات وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے تعلق رکھنے والے اخبارات ورسائل کو رسائل کی پالیسی کہتے ہیں۔ جن کا مقصد تازہ خبریں شائع کرنا نہیں ہے بلکہ جو مضامین ہیں انہیں تفصیلی پیش کیا جائے اور ان تمام کا ایک ہی موضوع ہو۔

سوال 5. صحافی کو تاریخ کا مستند گواہ کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: آج کے واقعات اور حالات کل کی تاریخ میں شامل کئے جاتے ہیں اسی طرح صحافی اپنے روزنامے میں جو بھی خبر لکھتا ہے اس کو بغیر دیکھے نہیں لکھتا بلکہ وہ خود حالات کا مشاہدہ کرتا ہے اور تفصیلی معلومات حاصل کر کے خبریں لکھتا ہے۔ اسی لئے صحافی کو مستند گواہ کہا گیا ہے کیوں کہ وہ حالات و واقعات کا ذاتی مشاہدہ کرتا ہے اور اس کو اخبار میں چھاپ دیتا ہے۔

سوال 6. سالانہ رسائل عام طور پر کیوں شائع کئے جاتے ہیں؟

جواب: سال میں صرف ایک مرتبہ شائع ہونے والے رسالہ کو سالنامہ کہتے ہیں۔ عام طور پر سالانہ رسائل تعلیمی اداروں کی جانب سے شائع ہوتے ہیں جس میں اس ادارے کی تعلیمی رپورٹ کے ساتھ ساتھ طلبا و اساتذہ کے مضامین تعلیمی ادارے کے مقاصد اور آئندہ سال روبہ عمل آنے والے منصوبوں کا اعلان بھی شامل ہوتا ہے۔

31A : اداریہ

سوال 1. کسی اخبار یا رسالہ میں اداریہ کی کیا اہمیت ہے لکھئے؟

جواب: اکثر اداریہ تازہ، ہلچل مچانے والے اور جدید تر موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ اداریہ کے مضامین ہی سے اس اخبار کا معیار معلوم ہوتا ہے۔ اداریہ دراصل مدیر کی رائے ہوتی ہے جس کو ایک مضمون عنوان کے ساتھ اخبار کے کسی اہم حصہ پر اخبار کے نام کے بعد شائع کیا جاتا ہے۔ اداریہ میں صرف مدیر ہی کی رائے نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی اخبار کے سینئر صحافی اور کارکنان بھی اداریہ لکھتے ہیں مگر یہ مدیر کے نام ہی سے شائع ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ اداریہ کے لیے صحافی آپس میں ایک میٹنگ کے ذریعہ گفتگو بحث ومباحثہ کرتے ہیں جس میں تمام صحافی و دانشور اپنی اپنی رائے دیتے ہیں۔ آخر میں مدیران تمام آرأ کو لے کر اداریہ لکھتا ہے۔

اداریہ میں سب سے پہلے موضوع ومسئلہ کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اس کے بعد موضوع کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ رائے یا فیصلہ تحریر کیا جاتا ہے۔ اس طرح اداریہ لکھنے میں تین مراحل آتے ہیں۔ موضوع کا انتخاب، غور وخوص اور اداریہ لکھنے کا عمل۔

اخبار میں اداریہ کی کافی اہمیت ہے کیوں کہ اس میں مختلف موضوعات پر تفصیلی و دلائلی معلومات فراہم کئے جاتے ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ اخبار میں اس موضوع پر صرف تازہ خبر شائع کی جاتی ہے جبکہ اداریہ میں اس کا ماضی حال اور مستقبل کی تاریخ پیش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے عام آدمی اداریہ کو پسند کرتا ہے اور پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔

اداریہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں ذہن سازی کی جاتی ہے جو موضوع اداریہ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے مدیر اعلیٰ اس کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں پر کھل کر اظہار کرتا ہے اس میں اس کی ذاتی رائے بہت کم ہوتی ہے وہ قاری کی ذہن سازی کا کام کرتا ہے۔ قاری اداریہ پڑھ کر متفق بھی ہوسکتا ہے اور مخالفت بھی کرسکتا ہے۔

اداریہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ کئی معلومات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ جو خبر اخبار میں شائع ہوتی ہے وہ بہت مختصر ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں وہی موضوع وخبر اداریہ میں شائع ہوتی ہے تو قاری کی تشنگی باقی

نہیں رہتی بلکہ اس کا ذہن کشادہ ہوتا ہے اور قاری اداریہ پڑھنے کے بعد سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اداریہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں قومی، مذہبی، سماجی، معاشی، ادبی ہر طرح کے موضوعات پر کھلے ہوئے انداز میں بحث کی جاتی ہے۔ موضوع کو جانب داری سے نہیں بلکہ غیر جانب دار ہو کر اس موضوع کے مسائل، نفع اور نقصان پر واضح دلائل ملتے ہیں۔

سوال 2. اداریہ لکھتے وقت کن باتوں کو دھیان رکھیں گے واضح کیجئے؟

جواب: اداریہ لکھنا ایک فن ہے۔ اداریہ لکھتے وقت اس فن کے تمام نکات اور باریکیوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے موضوع کا انتخاب اداریہ کا پہلا کام ہے۔ موضوع ایسا ہو کہ سب کو پسند آ جائے۔ کیوں کہ صرف چند لوگوں کے لیے اداریہ لکھا جائے تو وہ ناکام ہوگا۔ اسی لیے ہر قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے اچھے اور تازہ ترین موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے۔ ہمیشہ ایک ہی موضوع پر اداریہ لکھنے سے قاریوں میں بوریت محسوس ہوگی اور قاری صرف عنوان دیکھ کر آگے بڑھے گا اس کا مطالعہ نہیں کرے گا اسی لیے موضوعات میں ردو بدل ہوتے رہنا چاہئے۔

جو موضوع پر اداریہ لکھا جا رہا ہے سب سے پہلے اس کے مسئلہ کو پیش کیا جانا چاہئے اس کے بعد اس پر تفصیلی بحث کی جائے اس کے مثبت و منفی پہلو کو اجاگر کیا جائے اور اپنی بات کو دلیل و ثبوت کے ذریعہ پیش کی جائے اور آخر میں اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

اداریہ کی زبان عام فہم اور سیدھی سادھی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مدیر اعلیٰ ادبی یا کتابی زبان استعمال کریں ایسا کرنے سے عام قاری اداریہ سے دور ہوتا ہے۔ اداریہ کا موضوع کتنا ہی مشکل اور دقیق کیو نہ ہو مگر مدیر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس موضوع کو عام انداز میں اور آسان زبان میں پیش کریں۔ اداریہ میں ایسے الفاظ جملے اور محاورے و ضرب المثال استعمال کریں جیسے قاری روزانہ اپنی زندگی میں استعمال کر رہا ہو۔ زبان کے ساتھ ساتھ عبارت میں روانی ہو۔ قاری بیک وقت اداریہ کو پڑھتا چلا جائے ایسا نہ ہو کہ ابتدائی حصہ پڑھنے کے بعد اس کی تفہیم کے لیے تھوڑی دیر رک کے پھر آگے بڑھیں بلکہ وہ آسانی کے ساتھ روانی سے سمجھتا ہوا پڑھتا جائے۔

اداریہ جتنا مختصر اور جامع ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا کیوں کہ قاری طویل اداریہ پڑھنے سے بوریت محسوس کرتا ہے اور درمیان ہی میں وہ اداریہ کو ختم کرتا ہے۔ اداریہ میں جو موضوع پیش کیا ہے اس کے مقصد کو واضح انداز میں پیش کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ موضوع ایک ہو اور بحث دوسری کی جائے۔

اداریہ میں وسعت کا ہونا بہت ضروری ہے۔یعنی ہر روز ایک ہی طرح کے موضوعات پر اداریہ نہ لکھا جائے بلکہ سماج کے ہر طبقہ اور گروہ کے تعلق سے اداریہ لکھا جائے۔اداریہ کے ذریعہ رائے عامہ پر اثر ڈالنے کی قوت ہونی چاہئے۔اداریہ میں جو موضوع ہو اس کے دلائل اور حقائق واضح انداز میں ہوں اور حقائق کو واضح کرنے کی ضرورت پڑے تو اعداد و شمار کو بھی شامل کیا جائے۔

اداریہ میں سچائی اور ایمانداری سے بات کہی جانی چاہئے۔کسی فرد کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ملک و قوم کے مفاد کے لیے اداریہ لکھا جانا چاہئے۔اداریہ میں لب ولہجہ سخت نہ ہونا چاہئے بلکہ درمیانی یا اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

اداریہ کی سرخی پر کشش ہونی چاہئے۔سرخی دیکھنے کے ساتھ ہی قاری میں اداریہ پڑھنے کی دلچسپی پیدا ہونی چاہئے۔اسی لیے جہاں تک ہو سکے اداریہ کی سرخی کو پر کشش رکھیں۔اداریہ لکھتے وقت غیر جانب داری کے اصول کو اپنانا چاہئے۔اپنا نظریہ قائم رکھتے ہوئے دوسروں کے نظریات کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ اداریہ جذبات میں آ کر نہیں لکھنا چاہئے بلکہ غیر جذباتی اداریہ ہونا چاہئے۔اداریہ سے قارئین کو صحیح اور واضح راستہ دیکھائیں انہیں گمراہ نہ کریں۔

مذکورہ باتوں کو ذھن میں رکھ کر اگر اداریہ لکھا جاتا ہے تو وہ ایک کامیاب اور ہر قاری کا پسندیدہ اداریہ ہوگا۔

سوال: موضوع کے اعتبار سے اداریہ کی کتنی قسمیں ہیں لکھئے؟

جواب: موضوع کے اعتبار سے اداریہ کی چار قسمیں ہیں۔

1. خبری یا اطلاعاتی اداریہ
2. تاثراتی اداریہ
3. لطف اندوزی کے اداریئے
4. خصوصی مواقع کے اداریئے

1.خبری یا اطلاعاتی اداریہ:۔

ایسا اداریہ جس کے پہلے حصہ میں خبر پیش کی جائے دوسرے حصہ میں اس سے بحث کی جائے اور آخر میں معاملہ کی تشریح کی جائے مگر اس طرح کے ادارے میں عموماً کوئی رائے نہیں پیش کی جاتی۔اس لیے ایسے اداریہ کو خبری اداریہ کہتے ہیں۔

2.تاثراتی اداریہ:

یہ اداریہ مدیر کسی واقعہ یا حادثہ کے برے اثرات کو کم کرنے کے لیے یا کسی اچھی بات یا خیال کو عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو قبول کروانے کے لیے لکھتا ہے۔ جس میں مدیر اپنی رائے کو دلائل اور ربط کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتا ہے اور قاری کی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

3.لطف اندوز ی کے ادارئے :

سماج میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس میں انسانی دلچسپی کا موضوع بہت نمایاں رہتا ہے اور عوام میں اس پر عام طور پر گفتگو ہونے لگتی ہے تو مدیر ایسے موضوع پر ہلکے پھلکے انداز میں اداریہ لکھتا ہے جس سے قارئین کی بھی تفریح ہو جاتی ہے۔ مدیر باتوں باتوں میں مسکراتے ہوئے کام کی بات کر جاتا ہے یہاں مدیر مذاق مذاق میں اپنا کام نکال لیتا ہے۔

4.خصوصی مواقع کے ادارئیے:

کسی قومی دن، قومی شخصیتوں کی سالگرہ و برسی یا کسی بڑی شخصیت کے استقبال کے بارے میں جو اداریئے لکھے جاتے ہیں انہیں خصوصی مواقع کے ادارئے کہتے ہیں۔

32A: سرخی

I.4 نشانات والے سوالات:

1. سرخی کی تعریف کرو؟

جواب: سرخی کسی مضمون، خبر، بیان، تحریر یا موضوع کی مختصر ترین شکل کو کہتے ہیں۔ اسے عام زبان میں عنوان بھی کہا جاتا ہے جبکہ صحافتی زبان میں اس کو سرخی کہتے ہیں۔ یہ اس پوری خبر کا لب لباب ہوتی ہے۔ سرخی کے بغیر کوئی بھی خبر یا مضمون نامکمل ہی ہوتا ہے۔ سرخی کو مختلف طریقوں سے لکھا جاتا ہے۔ کسی خبر کے لئے ایک سطری سرخی ہوتی ہے تو کسی کیلئے دوسطری سرخی دی جاتی ہے۔ اوپر کی سرخی کو جلی حرفوں میں لکھا جاتا ہے جبکہ دوسری سطر کو ذیلی سرخی کہتے ہیں جو پہلی سطر کے مقابل چھوٹے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ کسی بھی خبر کے متعلق فوری معلومات دینے کے لئے سرخی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ سرخی تیار کرنا ایک فن ہے۔ جس سرخی سے خبر کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے وہ کامیاب سرخی کہلاتی ہے۔

2. سرخی لکھتے وقت کونسی باتوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے؟

جواب: سرخی کیلئے حسب ذیل امور پر توجہ دینا ضروری ہے۔

a) سرخی مختصر اور جامع ہو۔

b) الفاظ آسان اور سہل ہوں۔

c) پرکشش اور دل کو چھو لینے والی ہو۔

d) سرخی خبر کی مکمل وضاحت کرتی ہو۔

e) سرخی لکھتے وقت انسانی نفسیات پر بھی دھیان دینا ضروری ہے۔

II. ایک لفظ میں جواب دیجئے؟

1. دوسطری سرخی میں دوسری سطر کہلاتی ہے۔ (ذیلی سرخی)

2. خبر یا مضمون کا عنوان کیا کہلاتا ہے۔ (سرخی)

3. سرخی طویل ہو یا مختصر؟ (مختصر)

33A : کمپیوٹر کے ذریعہ ہونے والے کام

8.I نشانات کے جوابات

1. MS Office پر نوٹ لکھو؟

جواب: یہ ایک ایسا پروگرام ہے جس کے ذریعہ دفتری امور کی انجام دہی کی جاتی ہے۔ ایم ایس آفس میں مختلف پروگرامس شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

a) ایم ایس ورڈ: یہ انگریزی ٹائپنگ کا پروگرام ہے۔ اس میں خطوط، یادداشتیں، رپورٹ یا کتابیں ٹائپ کی جاتی ہیں۔ اس میں متن کے مطابق اشکال، جدول اور نقشے بھی محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔

b) ایم ایس اکسس:۔ اس پروگرام کے تحت مختلف صارفین یا کمپنیوں کے پتے، ریکارڈز، قیمتوں کی فہرست، دعوت نامے، مارک شیٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ تیار کئے جاسکتے ہیں۔ نہ صرف مذکورہ بالا ریکارڈ محفوظ رکھا جاسکتا ہے بلکہ حسب ضرورت اسے دوسروں کو ارسال بھی کیا جاسکتا ہے اس پروگرام کو ڈاٹا بیس سافٹ ویر بھی کہا جاتا ہے۔

c) ایم ایس اکسل: اس پروگرام میں بہی کھاتے، خرید و فروخت کا حساب کتاب، بیلنس شیٹ اور اکاؤنٹس کے جدول تیار کئے جاتے ہیں۔

d) ایم ایس پاؤر پائنٹ:۔ اس میں کسی بھی فائیل، کتاب یا دعوت نامے کا سرورق تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس میں خوبصورت ڈیزائننگ کی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ نمائشی سلائیڈس، اشتہار (اور فلمیں تیار کی جاسکتی ہیں)

e) ایم ایس شیڈول:۔ اس میں کسی بھی قسم کے نظام الاوقات کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ خاص کر ریلوے اور ہوائی جہازوں وغیرہ کے ٹکٹس کی بکنگ اسی پروگرام میں کی جاتی ہے۔

2. کمپیوٹر کی افادیت اور اہمیت پر نوٹ لکھئے؟

جواب: کمپیوٹر عصری ٹکنالوجی کا ایک بہترین تحفہ ہے جس کے ذریعہ گھنٹوں کا کام منٹوں بلکہ سکنڈس میں نمٹایا جاسکتا ہے۔ خاص کر تجارتی امور اور دفاتر کے لئے اس کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حساب کتاب اور مختلف اکاؤنٹس کو کمپیوٹر کی مدد سے چند منٹوں میں نمٹایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دفتری امور کی انجام دہی میں بھی یہ معاون ہوتا ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعہ قدیم ترین ریکارڈز کو محفوظ رکھنا آسان ہوگیا۔ دفاتر میں کمپیوٹر کی ایجاد سے قبل کاغذی رجسٹرس استعمال ہوا کرتے تھے جس میں اندراجات کرنا ہی نہیں بلکہ انہیں عرصہ دراز تک محفوظ رکھنا بڑا جوکھم کا کام ہونا ہے خاص کر کاغذی رجسٹرس کو دیمک وغیرہ سے بچا کر رکھنا ساتھ ہی ساتھ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے ایک بڑی جگہ بھی درکار ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی پرانا ریکارڈ تلاش کرنا ہوتا تو رجسٹروں کی ڈھیر سے مطلوبہ رجسٹر کو نکالنا کافی وقت طلب کام تھا لیکن کمپیوٹر کی بدولت یہ تمام امور اب بہت سہل ہوگئے ہیں۔ اس میں انتہائی چھوٹی سی ڈسک میں سینکڑوں رجسٹروں کا ڈاٹا محفوظ کیا جاسکتا ہے اور تلاش کرنے میں بھی چند منٹ درکار ہوتے ہیں۔

کمپیوٹر کی بدولت تجارتی ودفتری امور میں بڑی آسانی ہوگئی ساتھ ہی ساتھ یہی عصری ایجاد تعلیمی، سائنسی، سماجی اور طبی شعبہ جات میں بھی خود کو منوا چکی ہے۔ کمپیوٹر سے ہی جڑی ہوئی ایک اور ایجاد ای میل، انٹرمیٹ وغیرہ سے ہزاروں میل کے فاصلے لمحوں میں سمٹ گئے ہیں۔

آج ہر صفت اور ہر شعبہ میں کمپیوٹر کا استعمال عام ہوگیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کمپیوٹر نئی نسل کی ضروریات زندگی میں شامل ہوگیا ہے تو شائد غلط نہیں ہوگا۔ خط وکتابت، بات چیت، دور دراز مقام پر رہنے والے کسی عزیز سے ملاقات (انٹرنیٹ چاٹنگ کے ذریعہ) وغیرہ جیسے کئی ایک معاشرتی مسائل بھی اس کی بدولت حل ہوگئے ہیں۔ کمپیوٹر نے گویا دنیا کو ایک چھوٹے سے ڈبہ میں سمو دیا ہے۔

II. 2 نمبر کے سوالات:

1. بنیادی دستورالعمل بیان کرو؟

جواب:a) اندراجی واخراجی نظام کو درست اور قائم رکھنا۔

b) اندرونی اور بیرونی یادداشت کے نظاموں کو درست رکھنا۔

c) فائلوں کے انتظام کو درست رکھنا۔

d) جاب ورک کے نظام کو درست رکھنا۔

2. کمپیوٹر کے چند مخصوص پروگرامس کے نام بتاؤ؟

جواب:1. Dos پروگرام۔ یہ ایک بنیادی دستورالعمل ہے۔

2. Windows پروگرام یہ ایک ماحولیاتی پروگرام ہے۔

3. World پروگرام یہ خاص کام کرنے والا پروگرام ہے جو Window کے ماحول میں کام کرتا ہے۔

4. Animation پرگروام۔اس کے ذریعہ کارٹون وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر کمپیوٹر کو ترسیل کا ذریعہ بنانا ہو تو اس کے لیے انٹرنیٹ ایکسپلورر یا ای میل پروگرام ضروری ہے۔

3. کمپیوٹر زندگی کے کن کن شعبوں میں مستعمل ہے؟

جواب: فی زمانہ کمپیوٹرس انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں شامل ہوگئے ہیں۔تجارت ،تعلیم ، طب، سائنس و ٹکنالوجی، ریسرچ، سماجیات وغیرہ۔

29B : فیچر

I. دونشانات کے جوابات:

1. فیچر سے کیا مراد ہے؟

جوابا: آسان اور ہلکے پھلکے انداز میں لکھا گیا۔ بیانیہ مضمون فیچر کہلاتا ہے جس کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ فیچر کی زبان مضمون نگاری کی زبان سے آسان ہوتی ہے اور یہ بہت مختصر ہوتا ہے۔

2. فیچر کی خصوصیات بیان کرو؟

جواب: 1. فیچر کی زبان آسان اور سہل ہوتی ہے۔ یہ ہلکا پھلکا ادب ہے۔

2. فیچر میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے طوالت اس کی دلچسپی کو ختم کر دیتی ہے۔

3. اس میں کسی خاص اصول وضوابط کی پابند نہیں ہوتی۔

4. فیچر میں دلچسپی پیدا کرنے ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کی جاتی ہے۔

3. فیچر کی کوئی 4 خصوصیات بیان کرو؟

جواب: فیچر میں کسی دقیق مضمون کو پیش نہیں کیا جاتا۔

2. اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

3. مضمون کی کوئی قید نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی خاص تحریری ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے۔

4. قاری کی نفسیات اور اس کے نیچر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

4. فیچر اور مضمون نگاری میں کیا فرق ہے؟

جواب: فیچر میں ایک ہی بات پر پوری توجہ صرف کی جاتی ہے۔ فیچر کا مزاج دیگر اصناف نثر سے مختلف ہوتا ہے اور یہ طوالت سے دور ہوتا ہے جبکہ مضمون میں رسمی ابتداء یا آغاز، درمیانی نفس مضمون اور روایتی اختتام کے پہلوؤں کا خیال ضروری ہے۔ مضمون میں دقیق امور پر تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے اور یہ کافی طویل بھی ہو سکتے ہیں جبکہ فیچر ان تمام امور سے پرے ہے۔

30B : اخباری انٹرویو

I. نوٹ درج ذیل سوالات کے جوابات ایک جملے میں دیجئے۔

سوال1: انٹرویو کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب: انٹرویو کی چار قسمیں ہیں۔

سوال2: انٹرویو کی قسمیں گنایئے؟

جواب: (1) خبری انٹرویو (2) معلوماتی انٹرویو (3) شخصی انٹریو (4) مذاکراتی انٹرویو

سوال3: چشم دید گواہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: موقع واردات پر رہنے والے کو چشم دید گواہ کہتے ہیں۔

سوال4: اخباری انٹرویو میں گواہ اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت نہ دے تو کیا کرتے ہیں؟

جواب: اخباری انٹرویو میں گواہ اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت نہ دے تو ایک چشم دید گواہ لکھ دیتے ہیں۔

II.: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تین چار سطروں میں لکھئے۔

سوال1. انٹرویو کسے کہتے ہیں؟

جواب: کسی مسئلے یا واقعے سے متعلق اہم شخصیتوں یا منتخب افراد کے خیالات جاننے کی غرض سے جو بات چیت ان سے ہوتی ہے اسے انٹرویو کہتے ہیں۔ انٹرویو کے ذریعہ کسی خبر کے تمام اجزائے ترکیبی کو جمع کیا جاتا ہے۔

سوال2. انٹرویو کا مسودہ تیار کرتے ہوئے کن باتوں کی طرف دھیان دینا چاہئے؟

جواب: انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے نوٹس کی مدد سے انٹرویو تحریر کرے نہ کوئی دوسرا شخص ترتیب دے جو بات انٹرویو میں اہم ترین ہے اسی کو پہلے پیرا گراف میں لکھا جانا چاہئے ضروری نہیں کہ ہر وہ بات تحریر میں لائی جائے جو انٹرویو کے دوران کہی گئی ہو۔ جہاں بیان اہم ہو وہاں بیان کو پہلے تحریر کیا جائے اور جہاں شخصیت اہم ہو وہاں شخصیت کا ذکر پہلے کیا جانا چاہئے۔ انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ وہ انٹرویو لئے گئے جگہ اور وقت کا بھی حوالہ دے اس کے علاوہ انٹرویو دینے والا بعض باتیں ''آف دی ریکارڈ'' بھی کہتا ہے جسے شائع کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ انٹرویو لینے والے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس حصے کو نہ چھاپے۔

سوال 3. شخصی انٹرویو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اس پر ایک پیراگراف لکھئے؟

جواب: شخصی انٹرویو خبر کے علاوہ ایک فیچر کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس میں شخصیت کے خدوخال پیش کئے جاتے ہیں۔ شخصی انٹرویو صرف اہم شخصیتوں سے ہی نہیں بلکہ معمولی حیثیت کے ان لوگوں سے بھی لئے جا سکتے ہیں جنہیں اچانک شہرت مل جائے جیسے کسی کو کھیل کے میدان میں بڑا انعام مل گیا، کسی نے ہمالہ کی چوٹی سر کی ہو، کسی مہم میں کامیاب ہونے والا شخص، تماشہ یا کرتب دکھانے والے لوگ ان کے علاوہ ہر اس شخص سے انٹرویو لیا جا سکتا ہے جو کسی نہ کسی میدان میں اپنا مقام بنایا ہو۔

سوال 4. انٹرویو برائے حقائق اور انٹرویو برائے رائے میں کیا فرق ہے؟

جواب: انٹرویو برائے حقائق میں انٹرویو لینے والا یا صحافی مقام واردات پہنچ کر چشم دید گواہوں سے ''ک'' سے شروع ہونے والے سوالات کی روشنی میں حقائق کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے خدانخواستہ کسی مقام پر حادثہ ہو جائے تو صحافتی یا انٹرویو لینے والے کو صرف حادثہ کی خبر ملتی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور فراست سے جائے واردات، وقت حادثہ معلوم کرنے کے لئے لوگوں سے سوال کرتا ہے کیا ہوا؟ کہاں ہوا؟ کب ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا اور کون لوگ گواہ ہیں وغیرہ پھر حقائق تک پہنچتا ہے جبکہ انٹرویو برائے رائے میں ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی کوئی اطلاع مل جانے پر متعلقہ حکام اور افسروں کی رائے جاننے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کسی بڑی سیاسی تبدیلی، نئی ایجاد یا سائنسی تجربے پر ماہرین کی رائے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

سوال 5. کیا انٹرویو اہم شخصیتوں سے ہی لیا جاتا ہے؟ تین جملوں میں جواب دیجئے۔

جواب: نہیں انٹرویو صرف اہم شخصیتوں سے ہی نہیں لیا جاتا بلکہ انٹرویو کی چار بڑی قسمیں ہیں۔

(1) خبری انٹرویو (2) معلوماتی انٹرویو

(3) مذاکراتی انٹرویو اور (4) شخصی انٹرویو۔

لگاتار 24 گھنٹے ناچنے والے، سینکڑوں میل پیدل چلنے والے وغیرہ ایسے ناقابل یقین اور حیرت انگیز کارناموں کے پس پردہ اشخاص کے انٹرویو، طویل عمر پانے والے افراد کے انٹرویو بھی قارئین کے لئے دلچسپی سے کم نہیں ہوتے۔

III. نوٹ: حسب ذیل سوالات کے جوابات تفصیل سے لکھئے۔

سوال 1. انٹرویو کی کتنی قسمیں ہیں اور وہ کون کون سی ہیں لکھئے؟

جواب: عام طور پر انٹرویو کی چار قسمیں کی جاتی ہیں۔

(1) خبری انٹرویو (2) معلوماتی انٹرویو (3) مذاکراتیا نٹرویو اور (4) شخصی انٹرویو

1. خبری انٹرویو:

خبری انٹرویو کو نیوز انٹرویو یا Factual Interview بھی کہتے ہیں۔ جب کسی بڑے ادارے کی جانب سے ایسے فیصلے کا اعلان کیا گیا ہو یا پھر کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے جس پر لوگوں کی بالخصوص ماہرین کی رائے لینا ضروری ہو جاتا ہے تو ایسے انٹرویو کو خبری انٹرویو کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے تمام انٹرویو جو خبر کی تیاری میں معاون و مددگار ہوں گے خبری انٹرویو کے دائرے میں آئیں گے۔

2. معلوماتی انٹرویو:

اخبارات، رسائل ہفت روزہ اور ماہناموں کا بنیادی مقصد قارئین کو معلومات فراہم کرنا ہے۔ دراصل معلوماتی انٹرویو کا دائرہ کار نہایت وسیع ترین ہے اس کے ضمن میں جہاں روزمرہ کے حوادث کی مکمل تصویر کشی کی جاتی ہے وہیں غیر ملکی سیاحوں سے تاثرات، علمی کانفرنسوں کی روداد، سفرناموں کی روئیداد، فلم اسٹارس، ڈائرکٹرس، موسیقار یا دیگر فنکاروں سے انٹرویو کے ذریعہ معلومات اور تجربات کو خبروں میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

3. مذاکراتی انٹرویو:

جب کبھی کوئی اہم مسئلہ رونما ہوتا ہے یا حکومت کوئی فیصلہ کرتی ہے جس کے نتائج دوررس ہو سکتے ہوں تو اخباری نمائندے رائے عامہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن سے نہ صرف مختلف طبقات اور عوام کا مجموعی تاثر معلوم ہو سکے۔ اس لئے ایک سے زائد افراد سے انٹرویو کے ذریعہ ان کے تاثرات معلوم کر لئے جاتے ہیں۔ کسی اہم شخصیتوں کی موت پر بھی اس طرح کے مذاکراتی انٹرویو لئے جاتے ہو۔

4. شخصی انٹرویو:

شخصی انٹرویو فیچر کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس میں شخصیت کے خدوخال اس طرح دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کئے جاتے ہیں کہ لوگوں کو دلچسپی پیدا ہو۔ شخصی انٹرویو میں مطلوبہ شخصیت کی مختلف سوانح اور کارناموں کے ساتھ مختلف امور پر ان کی رائے معلوم کی جاتی ہے۔ جس کا مقصد حقائق اور افکار کو منظر عام پر لانا مذکورہ شخصیت کو ابھارنا بھی ہوتا ہے تاکہ خبر کے تاثر میں افسانہ کیا جا سکے۔ بعض مرتبہ ایسے اشخاص اچانک

شہرت کی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں جن کی شہرت اس وقت سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ایسے گمنام ہستیوں کی راتوں رات شہرت کے باعث ان کے بارے میں جاننے کے لوگ آرزومند ہوتے ہیں۔صحافی شخصی انٹرویو کے ذریعہ ان کا ماضی معلوم کر کے عوام کے سامنے رکھتا ہے۔

سوال 2. انٹرویو ایک فن ہے بحث کیجئے؟

جواب: یقیناً انٹرویو لینا ایک فن ہے یاد رکھئے کسی بھی اہم شخصیت کو کسی اہم مسئلہ پر اظہار خیال کے لئے آمادہ کرنا اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔زبانوں کو کھلوانا، کم گو اور کم سخن اصحاب کو بولنے اور کھل کر اظہار خیال کرنے کی ترغیب دینا فن نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسا فن ہے جس میں ذہانت، فراست، صلاحیت، کمال اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ شخصیت کے اعتبار سے انٹرویو کی نوعیتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔صدر مملکت یا کسی سربراہ کے ساتھ ملاقات میں انداز گفتگو کچھ اور ہی ہوگا، کسی مشہور فلمی اداکارہ یا گلوکار سے انٹرویو لیتے وقت کا انداز اس سے الگ ہوگا۔رویوں اور لب ولہجہ کی تبدیلی کا انحصار انٹرویو دینے والی شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ وہ انٹرویو سے قبل ہی باقاعدہ ہوم ورک کی صورت میں کام کرے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخصیت سے انٹرویو لیا جانے والا ہے اس کے بارے میں ضروری معلومات قبل از وقت حاصل کر لے جیسے اس کے دلچسپ موضعات کیا ہیں، کن شعبوں میں انہوں نے تجربہ حاصل کیا۔ان کی تعلیم، شوق، مشغلوں اور دیگر متعلقہ پہلوؤں کا جائزہ لے۔ پھر سوالاتکی ایک فہرست تیار کر لے صرف ضروری اور اہم ترین سوالات ہی کئے جائیں۔انٹرویو کے دوران یہ احساس ہو کہ دو دوست تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ایک اچھا انٹرویو نگار اپنی زبان سے کم اور کان سے زیادہ کام لے گا۔اگر کسی بات پر اختلاف ہو تو اس کا انداز ہ جارحانہ نہیں بلکہ نرم ہونا چاہئے نیز اگر انٹرویو لینے والا موضوع سے ہٹ رہا ہو تو اسے اپنی ڈگر پر لانے کی کوشش کرے اور گفتگو کے دوران ستائش، تعریف اور دلچسپ فقروں کے ذریعہ انٹرویو دینے والے کے موڈ کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکتا ہے اگر انٹرویو لینے والا تھوڑی سی چالاکی دکھائے تو وہ معمولی سوال کے ذریعہ ایک اہم اور قابل انکشاف جواب حاصل کر سکتا ہے۔انٹرویو دینے والے کو خوشی ہوتی ہے کہ اس کی کہی ہوئی باتیں نوٹ کی جارہی ہیں اس طریقہ سے دوسرا بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ بعد میں غلطی ہونے کا امکان بھی کم ہوتا ہے۔انٹرویو کے دوران وقت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے اور انٹرویو کے ختم پر انٹرویو دینے والی شخصیت کا شکریہ ادا کرنا اور چند ایک تعزیتی کلمات کا اظہار کرنا اخلاقی فریضہ ہے۔

31B : خبریں تیار کرنا

I. نوٹ: درجہ ذیل سوالات کے جوابات ایک یا دو سطر میں دیجئے۔

سوال 1. خبر لکھتے وقت کس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

جواب: خبر لکھتے وقت مضمون والا طریقہ نہیں اختیار کیا جانا چاہئے بلکہ نتیجے والی بات یعنی انتہا کا ذکر پہلے ہونا چاہئے۔

سوال 2. خبر لکھتے وقت درمیانی حصہ کیسا ہونا چاہئے؟

جواب: خبر لکھتے وقت نتیجہ والی بات کا ذکر پہلے کریں گے اور جیسے جیسے لائنیں یا پیراگراف بڑھتے جائیں کم اہمیت والی باتیں بیان کی جانی چاہئے۔

سوال 3. خبر تیار کرتے وقت ترتیب کیسی ہونی چاہئے؟

جواب: خبر تیار کرتے وقت پہلے ضروری بات جسے ابتدائیہ کہتے ہیں مختصر الفاظ میں ہونا چاہئے پھر اس کی تفصیل مزید معلومات، گواہوں یا موقع پر حاضر لوگوں کا بیان اور پھر بقیہ تفصیلات دی جائیں گی۔

سوال 4. جلسہ کی خبر کا خلاصہ کس شکل میں دیا جائے گا؟

جواب: جلسہ کی خبر کا خلاصہ آسان اور مختصر الفاظ میں سرخی کی شکل میں دیا جائے گا۔

سوال 5. صدر جلسہ کی تقریر کہاں دیں گے؟

جواب: خبر بناتے وقت صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کیا کہا اس کی اہم باتیں آخر میں آئیں گی۔

II. نوٹ: درج ذیل سوالات کے جوابات 10 لائین سے زیادہ نہ ہوں۔

سوال 1. خبر کی تعریف بتایئے؟

جواب: خبر کو انگریزی میں News کہتے ہیں اس لئے کچھ لوگوں کی یہ دلیل ہے کہ جہار سمتوں سے موصولہ اہم واقعات خبر ہیں

N:North, E:East, W:West & S:South

پروفیسر ہاشمی کا کہنا ہے کہ news دراصل New کی جمع ہے اور New کے معنی ہیں نیا، تازہ یعنی کہ تازہ واقعات کو خبر کہتے ہیں۔ ایک امریکی صحافی نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں خبر کی تعریف یوں کی ہے:

''اگر کتا انسان کو کاٹے تو وہ خبر نہیں البتہ انسان کتے کو کاٹے تو یہ خبر ہے''۔

اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کتے کا انسان کو کاٹنا معمولی بات ہے مگر کوئی انسان کتے کو کاٹ لیتا ہے تو یہ غیر معمولی بات ہے گویا غیر معمولی واقعہ خبر کہلاتا ہے۔

وبسٹر (Welbester) نے صرف تازہ واقعہ کی رپورٹ کو خبر کہا ہے۔

کارل وارن (Carrel Warren) نے اپنی کتاب Radio News Writing میں خبر کی تعریف یوں درج کی ہے:

''خبر عموماً وہ رپورٹ ہوتی ہے جو اس سے پہلے عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی یہ رپورٹ نبی نوع انسان کی ایسی سرگرمیوں کے متعلق ہوتی ہے جو قارئین، ناظرین، سامعین کے لیے دلچسپی، تفریح طبع یا معلومات کا موجب ہوتی ہے''۔

ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے اپنی کتاب فن ادارت میں خبر کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''خبر ایسے واقعہ کا فوری صحیح اور بے لاگ بیان ہے جس میں قارئین کے لیے دلچسپی یا اطلاع موجود ہو''۔

ان تعریفوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خبر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے بارے میں لوگ دلچسپی لیں۔

سوال 2. طے شدہ اور غیر طے شدہ خبروں سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ مثال دے کر سمجھائیے؟

جواب: طے شدہ خبروں کو متوقع خبریں اور غیر طے شدہ خبروں کو غیر متوقع خبریں کہتے ہیں۔ طے شدہ خبریں وہ ہوتی ہیں جو مسلسل اور بڑی تعداد میں ملتی رہتی ہیں جیسے امتحانات، کھیل کود کے نیجے اور جلسوں کی رپورٹیں وغیرہ جب کہ غیر طے شدہ خبریں وہ ہوتی ہیں جو غیر متوقع یعنی اچانک رونما ہونے والی ہوتی ہیں۔ جن میں حادثے، وبا، قحط، خشک سالی، سیلاب، طغیانی، زلزلے، طوفان غرض آفات سماوی جو اچانک رونما ہوتے ہیں غیر طے شدہ خبروں کے زمرے میں آتی ہیں۔ طے شدہ خبریں عدالتوں، تھانوں، تحصیل کے دفتر ضلع کے ہیڈ کوارٹر وغیرہ سے مل جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف غیر طے شدہ خبروں کو جمع کرنا زیادہ مشکل، وقت طلب، دشوار کن اور صبر آزما کام ہوتا ہے جس کے لیے ذہن، تجربہ کار اور پھرتیلے نامہ نگاروں اور رپورٹروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ طے شدہ خبریں معمولی دلچسپی کی ہوتی ہیں جب کہ غیر طے شدہ خبریں سنسنی اور ہلچل پیدا کر دیتی ہیں

جس کی مثالیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ طے شدہ خبروں میں غیر طے شدہ خبریں بھی رونما ہو جاسکتی ہیں جیسے کسی جلسہ میں تقریر کے دوران اچانک ہر دل عزیز لیڈر کے قلب پر حملہ ہو جائے اور ابتدائی طبی امداد سے قبل ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تو ایسی صورت میں طئے شدہ خبر سنسنی پیدا کر دیتی ہیں اور لوگوں کی نظریں ٹیلی ویژن پر، کان ریڈیو پر، اور آنکھ اخبارات میں گم ہو جاتی ہیں۔

سوال 3. خبر لکھنے کا طریقہ بیان کیجئے؟

جواب: بہترین خبر وہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ افراد دلچسپی لیں اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی اہم واقعہ ہو اس میں خبر پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اس واقعہ کو خبر کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب اس واقع کو ایسی روداد یا رپورٹ ان لوگوں تک پہنچائی جائے تو اس واقعہ کا مشاہدہ نہ کر پائے ہوں اس لیے خبر لکھتے وقت مضمون والا طریقہ اختیار نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ نتیجہ والی بات یعنی انتہا کا ذکر پہلے کرنا چاہئے اور جیسے جیسے سطر بڑھاتے جائیں کم اہمیت والی باتیں بیان کی جانی چاہئے مثلاً ریل گاڑی میں ڈکیتی کے واقعے کی خبر لکھتے ہوئے یہ تفصیل پہلے نہیں دی جائے گی کہ ڈبے میں کتنے مسافر تھے وہ کس طرح بیٹھے تھے، جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے بلکہ یہ پہلے لکھا جائے گا کہ فلاں گاڑی میں ڈکیتی پڑی ڈاکو مسافروں سے پیسے چھین کر فرار ہو گئے۔ یعنی ضروری بات جسے ابتدائیہ کہا جاتا ہے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جانا چاہئے پھر اس کی تفصیل، مزید معلومات، گواہوں یا موقع واردات پر حاضر لوگوں کا بیان اور پھر بقیہ تفصیلات بیان کی جانی چاہئے۔ خبر لکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ خبر تبصرہ نہ ہو، کوئی الزام عائد نہ کیا جائے، کوئی حقیقت مسخ نہ کی گئی ہو اور اپنی جانب سے کسی بات کا اجافہ یا کمی نہ کی گئی ہو اور کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ اہم ہو اور ممکن حد تک ڈرامائی بھی معلوم ہو۔

سوال 4. دھماکہ خیز اور عام خبر کا کیا مطلب ہے مثالیں دیجئے؟

جواب: دھماکہ خیز خبر اور عام خبر ان دونوں کو پڑھنے والوں کی دلچسپی اور توجہ کے اعتبار سے دو قسمیں بنائی گئی ہیں۔ جس میں دھماکہ خیز خبر بہت اہم ہوتی ہے جبکہ عام خبر جو یقیناً کم اہم ہوتی ہے۔ پڑھنے والا ان سے باخبر نہ رہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دھماکہ خیز خبروں میں ہم مجرموں کے کس گروہ پر پولیس کا چھاپہ، قحبہ گری کے اڈے پر چھاپہ مار کر دوشیزاؤں کو چھڑانا، سلسلہ وار بم دھماکوں کے مجرم کا پکڑا جانا، شہر کے امن و آمان کو تار تار کرنے کی کوشش ناکام بنانا، ٹیکس میں بھاری اضافہ یا کمی، پٹرول کی قیمتیں بڑھ جانا، غرض کہ حکومت کا کوئی ایسا نیا فیصلہ جس سے

پورے ملک کے حالات پر اثر پڑ سکتا ہو، کا شمار کر سکتے ہیں۔

جب کہ عام خبریں وہ ہوتی ہے جو زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوتی روداد اور جلسہ کی رپورتاژ آئے دن ہونے والی چھوٹے موٹے حادثے، چوری کے واقعات کسی میٹنگ کی تفصیل یا پھر کسی شخص کے حالات زندگی وغیرہ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر ان سے لوگ ناواقف رہیں بھی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

سوال5. اپنے محلے میں ہوئی چوری سے متعلق دو پیرا گراف کی مختصر خبر بنائیے؟

جواب: ہمارے محلے میں آئے دن چوری کے واقعات رونما ہو رہے ہیں گزشتہ ہفتہ دو، دو دن کے وقفے سے تین واقعات پیش آئے۔ بڑے تشویش کی بات ہے کہ ایک گھر کے سامنے رکھی ہوئی Pulsar گاڑی راتوں رات غائب ہوگئی پھر دو دن بعد چور گھر میں اتر کر قریب رات کے 2 بجے الماری کھولا اور 5 تولے طلائی زیورات لے کر فرار ہوگیا۔ اس طرح متعدد گھروں سے سیل فون کی چوری کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر چور جھانکتا ہے اور موقع پا کر سیل فون لے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی چوری اور ڈکیتی کے تدارک کے لیے اہلیان محلّہ کو چوکنا اور Alert رہنے کی بے حد ضرورت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ اگر رات کو چند دن باری باری ایک ایک گھر کا آدمی شب بیداری کرے تو چور پکڑا جا سکتا ہے اور ایسے واقعات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں پولیس کے تعاون کی بھی ضرورت شدید ہے۔

نوٹ: درج ذیل سوالات کے جوابات 20 سطروں میں دیئے جائیں۔

سوال1. ''ک'' سے شروع ہونے والی چھے سوالات کیا ہیں مثالوں سے واضح کیجئے؟

جواب: ''ک'' سے شروع ہونے والے چھے سوالات کا تعلق خبر کے پہلے فقرے ابتدائیہ سے ہے۔ چنانچہ جامع ابتدایہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ رپورٹر ان سوالات کے جوابات طلب کرے جو کسی واقعہ کا اعلان سن کر ایک عام انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں ان سوالات کو عام طور پر ششش کاف (چھے کاف) کہا جاتا ہے اور اسی کا انگریسی میں Five ws and one H یعنی Five wires and one husband کہتے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

1. What : کیا

2. Who : کون

3. When : کب

4. Where : کہاں

5. Why : کیوں

6. How : کیسے

فرض کیجئے کہ خبر آتش زدگی سے متعلق ہے۔تو خبر کا ابتدائی فقرہ لکھتے وقت رپورٹر سوال کیا؟ کا جواب دے گا'' آگ لگ گئی'' پھر کیوں؟ اور کہاں؟ کے جوابات میں بتائے گا کہ آگ فیکٹری میں لگی اور فیکٹری کس مقام پر واقع ہے۔کب؟ کا جواب آتشزدگی کا وقت بتا کر دے گا رات 10 بجے لگی۔اور یہ بھی بتائے گا کہ کتنی دیر تک آگ بھڑکتی رہی، کیوں؟ کا جواب ہوگا وہی جلتے ہوئے سگریٹ کو ادھر ادھر پھینک دینے کی لاشعوری حرکت۔اس کے بعد اس خبر میں سوال کیسے؟ کا جواب رپورٹر کئی ایک طریقون سے دے سکتے ہے آگ کی نوعیت اور شدت بیان کر کے جیسے تیز ہواؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے آگ کو چاروں طرف پھیلا دیا یا وہ کس قدر رکتنا؟ کی وضاحت بھی کرسکتا ہے۔ یہاں وہ آگ کی وجہ سے ہوئے ممکنہ خالی نقصان کا تخمینہ کرے گا اور کوشش کر کے اس بات کا بھی پتہ چلائے گا کہ اس فیکٹری کا انشورنش کرایا گیا تھا کہ نہیں اگر بیمہ کروایا گیا ہوتو اس کی رقم کی تعداد کتنی ہے اور جب بیمہکی رقم مل جائے گی تو کتنے فیصد نقصان کی تلافی ہوگی۔

اس طرح ایک پھرتیلا نامہ نگار یا رپورٹر سوال کے بال کی کھال نکال کر ایسے ایسے گتھیوں کا انکشاف کرے گا کہ بسا اوقات فیکٹر کے مالک کو آگ لگنے کا صدمہ کم اور انٹرویو لینے والے کی انٹرویو میں دیئے گئے بیانات کا زیادہ افسوس ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مثال میں ابتدایہ جائیداد کے مالک کے نام اور اس کے مکمل پتے کی صراحت کرتا ہے وہ اس حادثے کے محل وقوع کا بھی تعین کرتا ہے وہ تازہ ترین صورتحال کی اطلاع دیتا ہے جیسے درج بالا مثال میں نقصان کی حد سے واقف کراتا ہے۔

سوال 2. خبریں جمع کرنے کے کیا طریقے اور ذرائع ہوتے ہیں متصل لکھئے؟

جواب: خبریں حاصل کرنے کا سب سے قدیم اور مستند طریقہ ذاتی ملاقات ہے ٹیلی فون پر بھی ضروری معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن بالمشافہ گفتگو کو ہی ترجیح دینا چاہئے۔ پریس کانفرنس سے بھی مخصوص خبریں حاصل ہوتی ہیں مگر یہ خبریں تمام نامہ نگاروں کے لیے یکساں ہوتی ہیں۔ بڑے اخبار مختلف قسم کے نامہ نگار

رکھتے ہیں۔ جوایسی خبروں کی کھوج میں رہتے ہیں جو دوسروں کو حاصل نہ ہوتی ہوں۔

مرکزی پارلیمنٹ اور قانون ساز اسمبلیوں کی عمارت میں ایک مخصوص کمرہ یا ہال ہوتا ہے جسے لابی (Lobby) کہتے ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہوتا ہے جہاں پارلیمنٹ کے اجلاس سے قبل یا درمیانی وقفے میں بااختتام کے بعد کافی ہلچل رہتی ہے۔ ایسے نامہ نگاروں کو لابی کرسپانڈنٹ کہتے ہیں۔ ایسے نامہ نگاروں کو اہم تبدیلیوں کا احساس ہوجاتا ہے۔ کابینہ میں توسیع یا تبدیلی کا سب سے پہلے اندازہ ہوتا ہے۔ سیاسی تغیرات کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اراکین پارلیمنٹ کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اخبار کی زوردار خبر بن جاتی ہے۔

صدر یا وزیراعظم بیرونی دورے پر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ مختلف زبانوں کے اخبارات کے نمائندوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ نامہ نگار بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوششیں کرتے رہتے ہیں نتیجتاً خبریں جلد سے جلد موصول ہوکر اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ پریس کانفرنسوں سے یکساں خبروں کے حصول کے بعد اپنے انداز میں رپورٹنگ کرنا ان نامہ نگاروں کا کمال ہوتا ہے۔

ایک زمانے میں لوگ پرانی خبروں سے بھی مطمئن ہوجایا کرتے تھے لیکن آج کے دور میں ترقی یافتہ ترسیل کے ذرائع کی وجہ سے کوئی ذرا بھی تاخیر کرے گا وہ پیچھے رہ جائے گا۔ اس لئے جدید آلات کا استعمال کیا جارہا ہے۔ مصنوعی سیاروں کی مدد سے خبروں کی ترسیل نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل کردیا ہے۔

خبر رساں ایجنسیاں پیشہ وارانہ سطح پر خبریں جمع کرتی ہیں اور اپنے خریدار اخبارات کو خبریں فراہم کرتی ہیں۔ فرانس کی نیوز ایجنسی Havas سے سب سے قدیم ایجنسی ہے جو بعد میں (AFP) کے نام سے کام کرنے لگی۔

رائٹر سب سے مشہور ایجنسی ہے۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا' ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ' یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا ہندوستان سماچار، سماچار بھارتی وغیرہ اہم ایجنسیاں ہیں۔ ریڈیو بھی خبروں کی فراہمی کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو سپیکنگ، ریڈیو آسٹریلیا ریڈیو جاپان اہم نشری ادارے ہیں۔ آکاش وانی کا نیشنل چینل بھی ہر گھنٹہ باری باری سے ہندی اور انگریزی میں خبرنامے نشر کرتا ہے۔

ٹیلی ویژن خبروں کی فراہمی کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ 24 گھنٹوں کے نیوز چینل ہونے لگے

ہیں۔انٹرنیشنلBBC 'CNN' CNBC'اسکائی نیوز اور الجزائر ٹی وی ہیں۔نیشنل چینل دوردرشن کے علاوہNDTV،اسٹار نیوز،آج تک،ذی نیوز،ایشیاء نیوز،سہارا،سمئے،ETV،4TV،INNوغیرہ ہیں۔

انٹرنیٹ پر تقریباً دنیا کے تمام بڑے اور اوسط اخبارات ٹیلی ویژن چیانل اور ریڈیو سروس کے ویب سائٹ موجود ہیں مختلف شخصیتوں کی سوانح بھی معلوم کی جاسکتی ہیں خبروں کا پس منظر بھی دریافت کیا جاسکتا ہے۔الغرض کہ انٹرنیٹ نے خبروں کی فراہمی میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔

32B : اشتہار تیار کرنا

I. نوٹ: درج ذیل سوالات کے جوابات دو تین سطروں میں لکھئے۔

سوال 1. پہلے زمانے میں اخبارات اور رسالے کیوں نکالے جاتے ہیں؟

جواب: پہلے زمانے میں اخبارات اور رسالے شوق پورا کرنے کے لیے، کسی تحریک کی حمایت کے مقصد سے اور کبھی سماج میں عزت و وقار حاصل کرنے کی غرض سے نکالے جاتے ہیں۔

سوال 2. اخبارات اور رسائل کی موجودہ صورت حال کیا ہے؟

جواب: موجودہ دور میں اخبارات اور رسائل کے مقاصد میں سب سے اہم مقصد روپیہ کمانا بن گیا ہے اور چوں کہ اس پر آنے والی لاگر میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اس لیے اس کے انتظامی ڈھانچے کو بھی پہلے سے تیز بنالیا گیا ہے۔

سوال 3. کوئی بھی تجارت شروع کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟

جواب: کوئی بھی تجارت شروع کرنے کے لیے سب میں اہم بڑے پیمانے پر سرمایہ فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال 4. تجارتی انتظامیہ کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

جواب: سرمائے کے مناسب استعمال کے لیے اور اس سے پابندی سے ہونے والی آمدنی کو مسلسل بڑھانے کے لیے تجربہ کار اور ماہر منتظمین کی ضرورت پیش آتی ہے اور دوسری تجارتوں کی طرح اس میں بھی ماہر انتظامیہ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

سوال 5. اخبار یا رسالے کو کامیابی سے چلانے کے لیے کن باتوں کا خیال رکھا جانا چاہئے؟ کوئی 2 بیان کرو؟

جواب: 1. اخبار یا رسالے کی اپنی ملکیت یو یعنی کہ کرایے کی عمارت میں نہ ہو۔

2. جہاں سے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹیشن، ہوائی اڈہ، جنرل پوسٹ آفس وغیرہ قریب ہوں۔

II. نوٹ: درج ذیل سوالات کے جوابات 10 سطر سے زائد نہ ہوں۔

سوال 1. نصاب میں شامل کسی ایک اشتہار کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

جواب: گلاب ٹوتھ پیسٹ

تصویر میں گلاب ٹوتھ پیسٹ دکھایا گیا ہے جس کا Gel باہر نکالا گیا ہے اور اوپر جلی حروف میں Gulab Tooth Paste لکھا ہوا ہے۔ پھر نیچے ایک جملہ لکھا گیا ہے:

''اگر آپ پیسٹ ہی استعمال کرتے ہیں تو کسی اور پیسٹ کے بجائے صرف گلاب ٹوتھ پیسٹ استعمال کریں اس لیے کہ اس میں پیلو کا عرق خصوصی طور پر شامل کیا گیا ہے''۔

اشتہار میں کہیں پر بھی ٹوتھ پیسٹ بنانے والے کا نام اور پتہ نہیں لکھا گیا کیوں کہ قاری جانتے ہیں کہ گلاب ٹوتھ پیسٹ تقریباً ہر دکان پر یا دوافروش کے پاس مل جاتا ہے ہاں انہوں نے اس کی خوبی یہ بیان کی ہے کہ اس میں پیلو کا عرق شامل ہیں جو جراثیم کش ہے۔

زمانہ قدیم ہی سے پیلو کے عرق پتہ لگالیا گیا تھا کہ یہ جراثیم کو مارنے میں بے حد مفید ہے اور مسواک کا عرق ہی دراصل پیلو کا عرق ہے کیونکہ مسواک کی لکڑی کو پیلو ہی کہا جاتا ہے۔

سوال 2. بروک بانڈ چائے کے لیے ایک اشتہار 30 الفاظ میں لکھئے جس سے اس کی خوبی پوری طرح واضح ہوجائے؟

جواب: 140 سالہ تجربہ شدہ اور سائنس دانوں کی تیار کردہ انرجی سے لبریز چائے۔

بروک بانڈ چائے

سوتے کو جگائے، دماغ کو تیز کرے

خون جوش مارنے لگے طبیعت خوش وخرم ہوجائے

اور آدمی کام میں جٹ جائے

کم قیمت، خوش ذائقہ، لذیر اور وٹامن سے بھرپور چائے

براک بانڈ

آج ہی خریدئے اور لطف اٹھایئے

سوال 3. بجاج کلاسیک اسکوٹر کا اشتہار کسی رعایت کے اعلان کے ساتھ لکھئے؟

جواب: برق رفتار زندگی کا مقابلہ بجاج کلاسیک کے بغیر ناممکن

بجاج کلاسیک ایک پائیدار اور خوبصورت اسکوٹر

ایک لیٹر میں 60 کیلومیٹر
فیملی کار کے مانند وسیع اور آرام دہ
آج ہی خریدیئے اور زندگی میں چار اندلگایئے
Interest Free اقساط پر آپ کی سہولت کے لیے
آج ہی Log.on کر کے بک کیجئے
فرضی:

www.bajajclassicadv.com (Approx)

یا ای میل کریں: bajaj_classic@yahoo.com (Approx)

سوال 4. تجارتی شعبے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

جواب: تجارتی شعبے کے تحت اخبارات اور رسائل کے انتظامیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک شعبہ ادارت کا جس کو Editorial Section کہتے ہیں دوسرا تجارت کا جس کو Bussiness کہتے ہیں اور تیسرا طباعت یا چھپائی کا جس کو Mechanical Section کہتے ہیں۔

اس تقسیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ اخبار پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے وہ نہ صرف بحال رہے بلکہ وہ برابر آمدنی بھی دیتا رہے اور اس میں اضافے کی بھی گنجائش نکلتی رہی ہیں۔

تاجر اپنی اشیاء کا اشتہار مختلف اخباروں میں دیتے ہیں۔ اس لیے کسی اخبار کی آمدنی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس میں کتنے اشتہار چھپتے ہیں۔ کسی اخبار میں زیادہ اشتہاروں کا چھپنا بذات خود اس کی شہرت کا سبب بن جاتا ہے یہ دیکھ کر اور لوگ اس میں اشتہار دینے کی کوشش کریں گے۔ جب اشتہاروں کی تعداد بڑھے گی تو اس سے اخبار کو دوہرا فائدہ ہوگا ایک طرف اشتہار سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اخبار کی زیادہ کاپیاں فروخت ہوں گی۔

اگر کوئی اخبار دس ہزار کاپیاں روزآنہ چھپتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کی ساری کاپیاں فروخت ہوجائیں گی اوسطاً آٹھ ہزار کاپیاں فروخت ہوتی ہیں تو اس پر حاصل ہونے والی رقم سے اصل لاگت بھی نہیں نکلتی اس لیے اخبارات کو کامیابی سے نکلنے کے لیے اشتہارات کی آمدنی ضروری ہے۔

سوال 5. موجودہ دور میں صحافت کو ایک تجارت کی حیثیت ہی حاصل ہوگئی ہے۔ پہلے صورت حال اس سے مختلف تھی کیوں کہ اخبار اور رسالے کبھی شوق پورا کرنے کے لیے نکالے جاتے تھے تو کبھی کسی تحریک کی حمایت کے مقصد سے اور کبھی سماج میں عزت و وقار حاصل کرنے کی غرض سے اور اس میں کسی نقصان کی فکر کم ہی کی جاتی تھی لیکن اب ان مقاصد کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر اخبار اور رسالہ پیسہ کمانے کا ذریعہ بھی بن گیا ہے اور چوں کہ اس پر آنے والی لاگت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے اس لیے اس کے انتظامی ڈھانچے کو بھی پہلے سے بہتر بنالیا گیا ہے۔ دوسری تجارتوں کی طرح اس میں بھی تجارتی انتظامیہ میں مہارت رکھنے والوں کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔

اخبار یا رسالے کے کامیابی اور نفع بخش طریقے سے چلانے کے لیے جن ضروری باتوں کا دھیان رکھا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ اس کی اپنی ملکیت ہو، اس کی عمارت شہر کے مرکز میں واقع ہو جہاں سے ٹرانسپورٹ کی سہولتیں ہوں، جنرل پوسٹ آفس قریب تر ہو ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں پر آنے جانے والوں کی نظر آسانی سے پڑ سکے وغیرہ۔

نوٹ: حسب ذیل سوالات کے جوابات 20 سطور سے کم نہ ہوں

سوال 1. تشہیر سے کیا مراد ہے اور اس کے ذرائع کیا ہیں؟

جواب: تشہیر یا اشتہار Advertisment عوام کے لیے ایک مخصوص پیغام کی مانند ہوتا ہے۔ اس پیغام کے ذریعہ کسی Product، روزمرہ استعمال کی اشیاء خدمت (Service) یا کسی تصور کے متعلق تفصیلات عوام تک پہنچائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مختلف ممالک میں تشہیر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ تشہیر کے لیے شائع ہونے والے اشتہارات، اخبارات و رسائل میں کافی جگہ لے لیتے ہیں جب کہ پوسٹر وغیرہ کے ذریعہ گاڑیوں، بسوں، دکانوں اور عام مقامات کی عمارتوں پر بھی تشہیر کی جاتی ہے۔

تشہیر کا سب سے اہم مقصد اشیاء و مصنوعات کی فروخت ہوتا ہے مختلف اشیاء تیار کرنے والی کمپنیاں اور ادارے اپنی اشیاء کو بیچنے کے لیے اشتہارات کا سہارا لیتے ہیں۔ کاروباری اداروں سے ہٹ کر مختلف افراد، سیاسی پارٹیاں اور ان کے امیدوار، سماجی تعلیمی ادارے، مخصوص دلچسپیوں کے حامل گروہ بلکہ حکومتی ادارے تک تشہیر سے استفادہ کے لیے اشتہارات کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے اشتہارات زیادہ تر اخبارات میں دیئے جاتے ہیں ان میں بعض اشتہارات محض عوام کی خدمت کی غرض سے بھی دیئے جاتے ہیں مثال کے طور پر بعض

ممالک میں لوگوں کو شراب نوشی اور تمبا کو نوشی کے نقصانات سے بچانے کے لیے ان اشیاء کی خرابیوں کو ظاہر کرنے والے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں۔

اشتہارات کے لیے مختلف سہولت بخش ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں جس میں اخبارات، راست خطوط، رسائل، بیرون در تشہیری بورڈس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اہم ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ساری دنیا میں امریکہ ایسا ملک ہے جہاں تشہیر کی صنعت بہت ترقی یافتہ ہے۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن پر اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہیں لہٰذا ٹیلی ویژن پروگراموں کے وقت کی بہ نسبت وہاں اشتہارات کا وقت زیادہ ہوتا ہے۔ امریکہ سے ہٹ کر دنیا کے دوسرے ممالک جہاں شہیر کی بڑی صنعتیں کام کر رہی ہیں ان میں فرانس، جرمنی، جاپان اور برطانیہ شامل ہیں۔

تشہیر کی صنعت دنیا کے تقریباً ممالک میں قائم ہے تاہم بعض ممالک میں تشہیر پر بعض پابندیاں بھی عائد ہیں مثال کے طور پر مغربی یوروپی ممالک میں ٹیلی ویژن پر اشتہارات پیش کرنے پر بعض پابندیاں اور حدود لاگو کئے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض اقسام کی اشیاء کو مشتہر کرنے پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ناروے اور سویڈن میں ٹیلی ویژن پر تشہیر کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

سوال 2. اشتہار کی اہمیت اور افادیت بیان کیجئے۔

جواب: ایک ہی چیز کو سو آدمی بازار میں بیچ رہے ہیں اور ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی چیز فوراً بک جائے اور اچھے دام سے بکے۔ اس طرح ان سو آدمیوں کے درمیان مسابقت (Compitiosin) کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ ہر کوئی اپنی صلاحیت کے مطابق خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے نئے نئے طریقے اپنائے گا۔ وہ اپنی بنائی ہوئی چیز کی زبانی تعریف بھی کرے گا اور تحریری طور پر بھی کرے گا تاکہ اس کی بات زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ دکانوں سے باہر بنے ہوئے شوکیس میں مختلف چیزوں کی نمائش Key Chain پر اسکوٹر کی اسٹپنی پر اور کار کے پیچھے دلکش حرو میں کسی کمپنی کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو ہم اشیاء بنانے والوں کی طرف سے شہرت یا مشہور ہونے کی کوشش کہہ سکتے ہیں۔ اسی کوشش کو صحافتی زبان میں اشتہار کہیں گے۔

تاجر اپنی اشیاء کا اشتہار مختلف اخبارات میں دیتے ہیں۔ اس لیے کسی اخبار کی آمدنی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس میں کتنے اشتہار چھپے ہیں۔ کسی اخبار میں زیادہ اشتہاروں کا چھپنا بذات خود اس کی شہرت کا سبب بن جاتا ہے۔

صنعت کاروں کی بنائی ہوئی اشیاء کو بازار میں شہرت دلانے اور اخبار کی آمدنی میں اضافہ کرنے میں اشتہار کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے خود اشتہار نویسی بھی ایک باقاعدہ فن بن گیا ہے۔ اشتہار کو اچھے انداز میں لکھنا باقاعدہ ایک فن ہے اس لیے ہندوستان میں بعض اہم اشتہاری ایجنسیاں مختلف صنعتی اور تجارتی بلکہ غیر تجارتی اور سرکاری اداروں سے بھی اشتہارات جمع کرا کے اخبارات میں شائع کرانے کا ذمہ لیتی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اشتہار دینے والے کا وقت بچ جاتا ہے اور اچھے اخبارات میں اس کی بنائی ہوئی چیز کا اشتہار عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کس اخبار میں اشتہار دے، شاید اس کا صحیح فیصلہ وہ خود نہ کر پاتا کیوں کہ اشتہاری ایجنسی والے اس میں پیشہ وارانہ مہارت رکھتے ہیں۔

اشتہار کے خاکے کو صحافتی اصطلاح میں لے آوٹ (Lay Out) کہا جاتا ہے اور اس کے مسودے کو کاپی، کاپی میں تصویروں کا ہونا ضروری نہیں ہے بہت سے اشتہاروں میں صرف الفاظ ہوتے ہیں اور بعض میں صرف تصویر کارٹون سے کام لیا جاتا ہے اور الفاظ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لے آؤٹ کے لیے کوئی خاص اصول نہیں ہیں۔ اشیاء کو مناسبت سے زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتی جاتی ہے۔

مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات ونشریات کے زیر انتظام چلنے والی ڈائرکٹوریٹ آف آڈیو ویژول پبلسٹی (DAVP) ہندوستان کی سب سے بڑی اشتہار رساں ایجنسی ہے کیونکہ اس کی وساطت سے ملک بھر کے بڑے درمیانی اور چھوٹی اخبارات کو سرکاری اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔

33B : الکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت

I. نوٹ: حسب ذیل سوالات کے جوابات ایک پیراگراف میں لکھئے۔

سوال 1. الکٹرانک میڈیا میں سب سے مقبول صنف کونسی ہے؟

جواب: الکٹرانک میڈیا میں سب سے مقبول ترین صنف ٹیلی ویژن ہے جو ہر عمر و جنس کے ناظرین میں مقبول ہے۔ شہروں کے علاوہ ملک کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قریوں میں بھی ٹی. وی تفریح کا ایک بہترین ذریعہ بن گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ٹی. وی ہماری فیملی کا ایک مستقل ممبر بن گیا ہے۔ کسی زمانے میں ٹیلی ویژن کا تصور صرف امیر اور دولت مندوں کے یہاں ہی ہوتا تھا جس گھر میں ٹی وی ہوتا ہے وہ بڑا آدمی یا رئیس انسان سمجھا جاتا تھا لیکن آج کل ٹیلی ویژن بلالحاظ مذہب، ملت، فرقہ رنگ و نسل یا آمدنی پر چھوٹے بڑے، امیر غریب کے گھر میں موجود ہے اور لوگ ٹی. وی پروگراموں کے حساب سے اپنے روزمرہ کے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔

سوال 2. الکٹرانک میڈیا کس طرح نفع بخش ہے؟

جواب: الکٹرانک میڈیا میں سب سے اہم ٹیلی ویژن ہے اور سب سے زیادہ مقبول بھی ہے جس نے فلم اور ریڈیو کی مقبولیت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن کی عمر چار دہائیوں سے بھی زیادہ ہے۔ ان برسوں میں ٹیلی ویژن نے کئی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کافی ترقی کی ہے اس کی عوامیت اور مقبولیت میں گزشتہ دہائیوں سے زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اب ٹیلی ویژن فلم انڈسٹری سے بھی بڑی انڈسٹری ہے۔ لاکھوں لوگ اس سے روزی بھی حاصل کر رہے ہیں۔ چینلوں کی مقابلہ آرائی کی وجہ سے ناظرین کے سیاسی و سماجی شعور میں بے حد اہم تبدیلی آئی ہے۔ عام آدمی سے لے کر بچوں تک کا I.Q کافی اونچا ہوگیا ہے۔ لوگوں کی عام معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ رہن سہن اور فیشن کی دنیا میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ اس طرح بے شمار سہولتوں کی وجہ سے ٹیلی ویژن بے انتہا نفع بخش ثابت ہوا ہے۔

سوال 3. ٹی. وی اشتہارات کی عام زبان کیا ہے؟

جواب: ٹی. وی اشتہارات کی عام زبان اردو ہے یہی نہیں بلکہ ٹی. وی پر آنے والے تمام تر پروگرام سیریلز،

فلمیں اور دیگر مباحثے وغیرہ میں اردو زبان کا عمل دخل ہے۔ ٹی. وی اشتہارات میں جہاں تحریری کام انگریزی یا ہندی زبان سے لیا جاتا ہے وہیں تمام تر اس کے زبانی مکالمے اردو زبان ہی میں ہوتے ہیں کیوں کہ اردو ابتداء سے ہی عوامی رابطے کی زبان ہے۔ اس لیے قدرے نئی ایجا الکٹرانک میڈیا کی بھی رابطے کی زبان ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی، سمجھی اور جانی جانے والی زبان اردو ہی ہے۔ اردو زبان کی شیرینی، سادگی اور اثر انگریزی نے ٹی. وی کے ناظرین کو موہ لیا ہے۔ آپ کسی بھی وقت کسی بھی چینل پر کسی عوامی اشتہار کی زبان پر غور کریں۔ ہو سکے تو اس میں کہے جانے والے جملے کو کاغذ پر لکھ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس جملے میں زیادہ تر الفاظ اور ایکسپریشن اردو کے ہوں گے۔

سوال 4. سیریلز کے شروع میں جو گانا ہوتا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟

جواب: سیریلز کے شروع میں جو گانا ہوتا ہے اسے ٹائٹل سونگ (Tittle Song) کہا جاتا ہے اور اس Song کی تیاری میں اردو شاعری کا استعمال قدرے عام ہے نیز اس کے بول سنتے ہی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیریل کس قسم کا ہے، مذہبی، سیاسی، تہذیبی، تاریخی، تفریحی، بچوں سے منسوب، سماجی یا آزادی سے متعلق ہے۔

جیسے: ٹی وی سیریل ''آنکھیں'' دور درشن پر ایک عرصہ تک آتا رہا اور اس کا ٹائٹل سونگ ایک شعر سے شروع ہوتا تھا جو فلم ''آنکھیں'' میں بھی رہا ہے۔

؎ اس دیش کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا
جس دیش کی سرحد کی نگہبان ہیں آنکھیں

یہ سیریل ہمارے ملک کے تحفظ اور اس میں چھپے دہشت گردوں کو مار بھگانے اور لوگوں کو ان سے روشناس کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جو تفریح کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا درس دیتا رہا۔ اسی طرح دیوآنند کے بھائی وجئے آنند کا سیریئل ''تحقیقات'' بھی رات میں اسی چینل پر آتا رہا ہے اس سیریئل کے ٹائٹل سونگ کی شروع آزاد شاعری بلکہ نثری شاعری سے ہوتی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے:

''جب جب دنیا میں جرم ہوتا ہے، قتل ہوتا ہے، خون ہوتا ہے، رات کے سایہ میں ہوتا ہے، دن کے اجالے میں چلتا ہے تب شروع ہوتا ہے تحقیقات، تحقیقات''۔

سوال 5. ٹی. وی سیریلز میں اردو شاعری کا استعمال کیسے ہو رہا ہے؟

جواب: یہ قول بہت صحیح ہے کہ ٹی. وی سیریلز میں اردو شاعری کا استعمال عام ہے۔ آپ کسی بھی ٹی. وی سیریل کو دیکھ لیں اس کے ٹائٹل سونگ سے لے کر اس سیرئیل کے مکالمات بھی اردو زبان اور اردو آزاد نثری شاعری سے مزین کئے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں ہندی زبان کا پریوگ ضرور کیا جاتا ہے لیکن مجموعی طور پر اردو زبان کا ہی عمل دخل ٹی. وی کے ہر سیرئیل اور ہر پروگرام میں غالب رہے گا۔

اگر آپ ٹی. وی سیریلیز کو بغور دیکھیں اور سنیں گے تو اندازہ ہوگا کہ تمام ہندی چیانل اردو ہی استعمال کرتے ہیں بعض بعض جگہ مذہبی کلمات یا ہندی کے وہ الفاظ جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں ان کا استعمال ہوتا ہے لیکن کہیں پر بھی خالص ہندی نہیں ملے گی ہاں اگر ہندوؤں کے مذہبی سیریلز ہوں تو وہاں ہندی اور سنسکرت کے امتزاج سے کئی ایک ہندی الفاظ سننے کو ملیں گے لیکن وہاں پر بھی اردو غالب رہے گی۔

ٹی. وی سیریلز میں الف لیلیٰ، YUG، دی جنگل بک، نور جہاں، ٹیپو سلطان، جھانسی کی رانی، آواز کی دنیا، مہا عبارت، رامائن، آنکھیں، تحقیقات اور موجودہ دور کے چینلوں میں آنے والے سینکڑوں سیریلز جو ہر دل عزیز ہیں ان میں دو تین کے متعلق درج ذیل میں ٹائٹل سونگ یا ابتدائی کلمات دیئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

الف لیلیٰ	YUG	دی جنگل بک
ہر شب نئی کہانی	یگ بدلہ بدلہ ہندوستان	جنگل، جنگل
دلچسپ ہے بیانی	یگ بدلہ بدلہ ہندوستان	بات چلی ہے
صدیاں گزر گئیں ہیں	آج کے دیش کا ہر انسان	پتہ چلا ہے
لیکن نہ ہو پرانی	یگ بدلہ بدلہ ہندوستان	چڈی بہن کے
پریوں کو جیتنا ہے	اشفاق، چندر شیکھر، آزاد نے	پھول کھلا ہے
جنوں کو بھی ہرائیں	جب موت کے ساتھ شادی کی	پھول کھلا ہے.....
انسان میں وہ طاقت	چڑھ کر پھانسی پر	
سب پہ کرے حکومت	بھگت سنگھ نے	
الف لیلیٰ	کیا قیمت دی	

الف لیلیٰ آزادی کی

الف لیلیٰ آج کے دیش کا ہر انسان

یگ بدلہ بلدہ ہندوستان

نوٹ: حسب ذیل سوالات کے جوابات 20 سطروں سے زائد نہ ہوں۔

سوال 1. ہندوستان میں ریڈیو کی ابتداء کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: آزادئ ہند سے قبل ہی مختلف محکموں اور اداروں کی جانب سے ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام عملمیں آچکا تھا جو محدود پیمانے پر اپنی نشریات جاری رکھتے تھے۔ برسہابرس کے لاسلکی تجربات کے بعد سرکاری تحویل میں ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام سے باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوا۔

آزادئ ہند کے بعد ہندوستان کی حکومت کی جانب سے چلائے جانے والے ریڈیو اسٹیشنوں کو آل انڈیا ریڈیو (All India Radio) کا نام دیا گیا۔ مختلف سرکاری پالیسیاں اور ترجیحات طے کردی گئیں مختلف خانگی و نیم سرکاری نشریاتی اداروں کو آل انڈیا ریڈیو (AIR) میں ضم کردیا گیا۔

دکن ریڈیو کے حیدرآباد اور اورنگ آباد اسٹیشن بھی آل انڈیا ریڈیو کے نذر کئے گئے اور یہ اپنے معیار اور اپنی نشریات کی وجہ سے عوام میں کافی مقبول ہوئے۔

ہندوستان میں نشریاتی اداروں بالخصوص آل انڈیا ریڈیو کے پھیلاؤ سے ملک بھر میں سماجی و معاشی انقلاب لایا گیا۔ ہندوستانیوں کے ذہنی شعور کو بیدار کرنیو بلند کرنے میں ریڈیو نے اہم رول ادا کیا۔ ٹی. وی کے پھیلاؤ کے باوجود اب بھی ریڈیو نہایت ہی اہم رول ادا کررہا ہے۔ ذیل میں ریڈیو کی تاریخ کا اجمالی جائزہ ملاحظہ فرمائیے۔

1. ہندوستان میں اگست 1921ء میں ٹائمز آف انڈیا اور ڈاک وتار کے محکمے نے ممبئی میں نشریات کا آغاز کیا۔

2. ریڈیو سیٹ بنانے والوں اور ریڈیو اسٹیشن چلانے کے لئے حکومت نے مارچ 1923ء میں Licence جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی سال نومبر میں بنگال کے ریڈیو کلب نے اپنی نشریات کا آگاز کردیا۔

3. 16 مئی 1924ء کو مدراس پریسیڈنسی ریڈیو کلب قائم کیا اور جولائی سے اپنی روزآنہ کی نشریات شروع کیں۔

4. 24 جولائی 1927ء کو Indian Broad Casting (IBC) نے ممبئی اسٹیشن سے باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔

5. ہندوستان میں موجود ریڈیو اسٹیشنوں بشمول ریل اسٹیشنوں کی تعداد لگ بھگ 210 ہے۔

6. ہندوستان کی 24 زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

7. ہندوستان کی 142 زبانوں اور مقامی بولیوں میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔

8. ہندوسان میں AIR کے 1.4 اسٹیشن ہیں۔

سوال 2. ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ابتداء کے بارے میں لکھئے؟

جواب: ٹیلی ویژن کے موجد اسکاٹ لینڈ کے مشہور سائنسداں اور انجینئر جان لوگی بیرڈ ہیں۔ ہندوستان میں ٹیلی وین کی عمر اب تقریباً 48 سال ہے۔ ابتداء میں چوں کہ ٹی. وی سیٹ کافی مہنگے ہوتے تھے اس لئے یہ امیر لوگوں کی دلجوئی کا کام کرتا تھا اور عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ اس کا شمار Luxury میں کیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز آل انڈیا ریڈیو کے ایک تجربہ کے طور پر کیا گیا اور Linesco کی مدد سے 15 ستمبر 1959 کو دہلی میں ٹی وی نشریات کا تجربے کے طور پر آغاز ہوا۔ آغاز میں دلی کے مخصوص علاقوں میں یہ نشریات میں تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات اور تعلیمی اسباق کے پروگرام بھی پیش کئے جاتے رہے۔

ہندوستان میں T.V نشریات مختلف تجربات کے دور سے گزرتی ہیں۔ دلی میں اسکولی طلبہ کے لیے 1961ء میں اسکول ٹیلی ویژن (STV) کا آغاز ہوا جس میں تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ اسکولوں کے نصاب کو پورا کرنے یا دد ہانی اسباق کو نشر کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ تفریحی پروگراموں کو متعارف کیا جانے لگا۔ ہندوستان کی ٹی. وی نشریات کا ذکر جب بھی آئے گا بنیادی طور پر اسکول ٹی. وی کے نصابی پروگرام ہی کو ٹی وی کے اولین پروگراموں میں شامل کیا جائے گا۔

دلی مرکز سے تعلیمی نشریات کے ساتھ ساتھ معلوماتی اور تفریحی نشریات کا سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ 1972ء میں ممبئی کے مرکزک افتتاح عمل میں آیا۔ حکومت کی اچھی منصوبہ بندی کی وجہ سے ممبئی کے مرکز کو پیشہ وارانہ مہارت کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ حکومت جرمنی نے ٹی وی کا بے شمار ساز وسامان تحفے کے طور پر ہندوستان کو بطور تحفہ دیا اور ممبئی کے مرکز نے اس ساز وسامان سے پروفیشنل سطح پر اپنی نشریات کا آغاز کر دیا۔

نشریات کے خدوخال میں تبدیلی کرتے ہوئے منتظمین نے تفریح کے ساتھ ساتھ دیہی ضروریات عوامی مسائل کے علاوہ بلدی شعور وغیرہ کو بھی شامل پروگرام کر دیا جس کی وجہ سے مقبولیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ عوام میں جانکاری اور سماجی و بلدی شعور بھی پیدا ہونے لگا اس طرح ٹی. وی سے عوامی خدمات کا سلسلہ صحیح معنوں میں 1970ء کے دہے سے شروع ہو گیا۔

29C : ترجمہ کی تعریف، ضرورت اور اہمیت

I. 8 نشانات کے سوالات:

1. ترجمہ کی تعریف اور اس کی اقسام بیان کرو؟

جواب: کسی ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ اگر اس کی تعریف یوں کی جائے تو بہتر ہوگا۔

''کسی ایک زبان کی عبارت کے معنی و مطلب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے''۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محض اصل زبان کے مواد کو دوسری زبان میں تبدیل کر دینے سے ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ ترجمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنف/شاعر/ ادیب کے خیالات و احساسات کو بالکل اسی طرح دوسری زبان میں منتقل کرے جیسا کہ/مصنف/شاعر/ ادیب نے کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس جگہ مصنف نے زور دے کر بات کہی ہے وہاں پر ترجمہ میں بھی زور دیا جائے، جہاں طنز کیا گیا ہو وہاں طنز سے کام لیا جائے۔ آپ ان تمام باتوں کا خیال رکھیں تا کہ ترجمہ صحیح اور قابل قدر ہو۔

مختلف ماہرین نے ترجمہ کی تعریف یوں کی ہے۔

☆ ترجمہ طرزِ رسائی ہے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں تحریری ابلاغ کی سہولت فراہم کرتی ہے''۔

☆ ترجمہ دوسری زبان میں وہ تحریری ابلاغ ہے جو ہو بہو انہی معانی کا حامل ہوتا ہے جو پہلی زبان کے تحریری ابلاغ کے ہوتے ہیں''۔

☆ کسی ایک زبان کی عبارت کے معنی و مطلب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے''۔

ترجمہ کے مندرجہ بالا تعریفوں پر ایک نظر ڈالنے سے ترجمے کے تعلق سے چند اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ترجمہ نگاری وہ طریقہ کار ہے جس کا اہم ترین عنصر منتقلی کا عمل ہے یعنی ایک زبان سے دوسری زبان میں

منتقل کرنا اس کی اہم خصوصیت ہے۔ محض اصل زبان کے مواد کو دوسری زبان میں تبدیل کر دینے سے ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنف کے خیالات اور احساسات کو اچھی طرح سمجھے اس کے بعد ان خیالات اور احساسات کو بالکل اسی طرح دوسری زبان میں منتقل کرے جیسا کہ مصنف نے کیا ہے۔ اب جس مواد کو منتقل کرنا ہے وہ بلاشبہ خیال، فہم، علم، جذبہ اور احساس حامل ہوگا چنانچہ ترجمہ میں منتقلی کا یہ عمل اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ دوسری زبان میں بھی جو متن ضبط تحریر میں لایا جائے وہ اسی خیال، فہم، علم جذبہ اور احساس کا حامل ہو اس متن میں پایا جاتا ہے جس کو منتقلی کے عمل سے گزارا جا رہا ہے۔ یعنی اس عمل میں نہ تو اپنی جانب سے کچھ شامل کرنا ہے اور نہی اس میں سے کچھ کم کرنا ہے۔ لہٰذا یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے پھر ترجمہ کرنے والے کا سابقہ دو آپسی زبانوں سے پڑتا ہے جو تہذیبی، جمالیاتی، ثقافتی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ دونوں کے پاس محاوروں اور ضرب الامثال مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ایک اچھے مترجم کو ان تمام مشکل مرحلوں سے بہت سوچ سمجھ کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ نگاری ایک ناگزیر عمل اور دورِ جدید کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

2. ترجمہ کی ضرورت پر تفصیلی روشنی ڈالو؟

جواب: ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان پل کا کام انجام دیتا ہے۔ جس کے ذریعہ خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں۔ ترجمے کا تعلق انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ فلسفہ ہو یا سائنس، سماجی علوم ہو یا ادبیات یا پھر جدید ٹکنالوجی ان سب میں کہیں نہ کہیں ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ تو کسی علم سے صرف متعارف کرتا ہے۔ اب اس میں اصل کام تو انسانی ذہن کا ہے وہ اس تعارف کو بنیاد بنا کر کن کن راہوں کی کھوج کر سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ترجمہ ذہن کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نئے موضوعات پر غور کر سکے اور زیادہ بہتر نتائج اخذ کر سکے۔

☆ تاریخی، تہذیبی اور عصری ضروریات:

جب ہم انسانی ذہن اور اس کی فکر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ازل سے ہی انسانی فطرت کے اندر تجسس و تلاش و جستجو کا مادہ رکھا ہے اور یہی وہ انسانی وصف ہے جس نے انسانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی تاریخی و تہذیب کے ساتھ ساتھ دوسرے اقوام کی تاریخ و تہذیب سے بھی واقف

ہو، کیوں کہ اس کے ذریعہ انسانی فکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور اسے سوچنے کا مختلف راستہ نظر آتا ہے۔ اگر ہم ترجمے کی ضرورت کو عصری علوم وفنون کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کی دنیا علم و تحقیق کے شعبہ میں بہت آگے پہنچ چکی ہے اور جب ہم ان علوم وفنون کے بارے میں جاننے اور ان سے کچھ حاصل کرنے کی سوچتے ہیں جو کہ صرف اور سرف ترجمے کے ذریعہ ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

☆ سماجی ضرورت:۔

معاشرہ نام ہے مختلف طبقات گروہوں اور مختلف نسلوں کے ایک ساتھ مل جل کر رہنے کا۔ اسی وجہ سے آج کا سماج اپنی مختلف تہذیبوں سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جب ہمیں معاشرے کے افراد سے کسی لین دین یا کسیضرورت کے تحت سابقہ پڑتا ہے تو اس وقت ہمیں ترجمے کی ضرورت پڑتیہے اور یہ ہماری سماجی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ معاشرے کا نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں بغیر کسی دوسرے کی مدد کے رہنا ناممکن ہے اور اسی وجہ سے مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے معاشرے کے دوسرے افراد سے ملنا پڑتا ہے اس وقت بھی زبان کو سمجھنے کے لیے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔

☆ سیاسی ضرورت:۔

سیاست انسانی زندگی کا ایک ترین حصہ ہے اور اس میں وقت وحالات کے لحاظ سے مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہے۔ خواہ وہ اپنا ملک ہو یا کوئی اور ملک۔ ہمارے ملک ہندوستان میں تقریباً ہر ریاستوں کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ ان زبانوں کو سمجھنے اور سیاستی معاملات میں قابل قدر خدمت انجام دینے کے لیے ترجمہ ہماری بہت مدد کرتا ہے۔ اسی طرح قومی سطح کے رہنماؤں کو ترجمے اور مترجم کی شدید ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ دوسرے ممالک کی زبانیں الگ الگ ہیں۔

☆ قومی اور بین الاقوامی ضرورت:

ہر ملک اپنے اپنے جغرافیائی پہلو اور وہاں کی تہذیب وتمدن سے جانا و پہچانا جاتا ہے اور اس کو جاننے کے لیے ہمیں ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک ملک کا دوسرے ملک سے تعلقات کو استوار کرنے کا طریقہ سفارتی معاملات کو روبہ عمل لانے سے ہوتا ہے اور یہ لازمی نہیں کہ دو ملک کی زبان ایک ہی ہو۔ اس وجہ سے قومی وبین الاقوامی تعلقات کو بہتر بنانے اور اس کے درمیان رشتوں کو مضبوط بنانے میں ترجمہ سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں رائج مختلف تنظیموں اور دوسرے فلاحی اداروں جیسے

UNESCO' WHO' UNO وغیرہ کو ساری دنیا سے اپنا تعلق قائم رکھنے اور ان کے مسائل کے لیے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

4.II نشانات کے جوابات۔

1. ترجمہ ترسیل کا اہم ذریعہ ہے۔ وضاحت کرو؟

جواب: معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا نام ترسیل ہے، ترسیلی معلومات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ان سے استفادہ کے بھی کئی طریقے ہوتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے لیے کونسی زبان استعمال کی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ جس زبان سے لوگ واقف ہوں اسی زبان کا استعمال کیا جائے کیوں کہ ترسیل کا مقصد صرف اور صرف معلومات کو ایک دوسرے تک پہنچانا نہیں بلکہ ان سے استفادہ کے مواقع بھی فراہم کرنا ہے تا کہ ان تمام کا نتیجہ ترقی کی صورت میں مل سکے اور اس اہم کام کے لیے ترجمہ کا سہارا لینا پڑتا ہے کیوں کہ علم صرف ایک ہی زبان تک محدود نہیں بلکہ مختلف زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔

2. ترجمہ کے ذریعہ علوم وفنون کا تبادلہ کیسے عمل میں آتا ہے؟

جواب: ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے اسے دوسرے لفظوں میں ایک طرح کا علمی، تہذیبی اور تمدنی لین دین بھی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں دو زبانوں کے درمیان تقابلی مطالعہ کر کے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اور ترجمہ کی بدولت ہی دوسرے اقوام اور عالم کی تہذیب وتمدن اور ان کے علمی وفنی کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔

3. ترجمہ کے بین الاقوامی خدمات کا جائزہ لو؟

ہر ملک اپنے اپنے جغرافیائی پہلو اور وہاں کی تہذیب وتمدن سے جانا و پہچانا جاتا ہے اور اس کو جاننے کے لیے ہمیں ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک ملک کا دوسرے ملک سے تعلقات کو استوار کرنے کا طریقہ سفارتی معاملات کو روبہ عمل لانے سے ہوتا ہے اور یہ لازمی نہیں کہ دو ملک کی زبان ایک ہی ہو۔ اس وجہ سے قومی وبین الاقوامی تعلقات کو بہتر بنانے اور اس کے درمیان رشتوں کو مضبوط بنانے میں ترجمہ سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں رائج مختلف تنظیموں اور دوسرے فلاحی اداروں جیسے UNESCO' WHO' UNO وغیرہ کو ساری دنیا سے اپنا تعلق قائم رکھنے اور ان کے مسائل کے لیے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

4. ترجمہ کی اہمیت بیان کرو؟

جواب: ترجمہ ایک دور کے علمی خزانے کو یا زبان کے تعلیمی مواد کو دوسری زبان تک منتقل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ترجمہ کی اہمیت و افادیت کو فراموش کر دیا جاتا تو آج دنیا علوم وفنون کی بلندیوں پر پرواز نہ کرتی۔ خصوصاً سائنس وٹکنالوجی اور طب کے میدان میں ہونے والی نت نئی ایجادات ترجمہ کے بغیر صرف اور صرف اسی علاقہ تک محدود رہ جاتی۔ یہ ترجمہ ہی ہے جس کی بدولت ارسطو و افلاطون کے نظریات مختلف زبانوں کے ذریعہ بعد والی نسلوں تک پہنچے۔ یہ ترجمہ ہی ہے جس نے عرب کے صحراؤں میں پنپنے والے ابتدائی سائنسی نظریات کو اہل مغرب تک پہنچایا اور مغرب کی دانش گاہوں میں عرب ماہرین کے سائنسی، ریاضیاتی، فلکیاتی اور علم نجوم کے بنیادی نظریات کی آبیاری کی گئی جس کے ذریعہ ہی عصری ٹکنالوجی تک رسائی ممکن ہوئی۔

نہ صرف زمانہ قدیم بلکہ ماضی قریب اور حال میں بھی ہم ترجمہ کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ آج بھی دنیا کے کسی بھی ملک میں ہونے والے سائنسی تجربات کا مواد ترجمہ کے ذریعہ ہی دوسرے ممالک تک پہنچتا ہے اور پھر اس میں مزید نئے نئے انکشافات وایجادات کی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم ترجمہ کو کسی بھی علم وفن کے خزان کی کلید کہیں تو شائد بیجا نہ ہوگا۔

III. ایک لفظ میں جواب دو؟

1. کسی مواد کی ایک سے دوسری زبان میں منتقلی کہلاتی ہے۔ (ترجمہ)
2. Who کو پھیلا کر لکھو (World Health Organization)
3. ترجمہ کے میدان میں تیزی لانے والی عصری ٹکنالوجی کیا ہے؟ (انفارمیشن ٹیکنالوجی)
4. ترجمہ کے ذریعہ کسی دوسری قوم کے کونسے کارناموں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے؟ (علمی، فنی اور ادبی)
5. کیا ترجمہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کیلئے اہمیت رکھتا ہے؟ (ہاں)

30C : ترجمے کے اصول

I. 8 نشانات کے سوالات۔

1. ترجمہ کے اصول پر تفصیلی روشنی ڈالو؟

جواب: ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے اور جس طرح تخلیقی عمل کے لیے کوئی مستقل اصول یا ضابطہ مروج نہیں اسی طرح ترجمہ کے لیے بھی کوئی خاص بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں، البتہ اصل تحریر کی صحت کے ساتھ بغیر کسی غیر ضروری اضافت کے ساتھ قاری تک منتقلی ترجمے کی شرط اول ہے۔ ترجمے کے لیے وضع کردہ چند عام اصول حسب ذیل ہیں۔

1. اصل متن کے الفاظ کی مناسب ترجمانی کا خاص خیال رکھا جائے۔
2. ترجمہ شدہ متن اصل متن کی طرح پڑھے جانے کے قابل ہو۔
3. مرکزی خیال سے انحراف نہ ہو۔
4. قاری کے دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔
5. نا قابل فہم اور مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔
6. مفہوم واضح اور آسان انداز میں ہو۔ غیر واضح مفہوم کی صورت میں ترجمہ کامیاب نہیں کہلاتا۔
7. زبان کے قواعد و رموز کا بہتر استعمال کیا جائے۔
8. تحریر میں تسلسل اور روانی کا خاص خیال رکھا جائے۔
9. اصطلاحات کے استعمال میں احتیاط برتی جائے۔
10. تاریخی و تہذیبی اور عصری علوم و فنون سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اگرچہ کہ ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں خیالات کی ترسیل اور منتقلی کا عمل ہے جس میں متن کا انتخاب، ابلاغ اور ترسیل کا فن شامل ہے۔ مذکورہ مدارج کی کامیاب تکمیل ترجمے کو بامقصد اور کامیاب بناتی ہے۔

2. مترجم کی خصوصیات بیان کرو؟

جواب: ایک کامیاب مترجم میں پائی جانے والی خصوصیات کے بارے میں ماہرین کی رائے درج ذیل ہے۔

1. مترجم کو ترجمے کا ذوق وشوق ہونا چاہئے۔

2. مترجم کا مطالعہ وسیع، عمیق اور متنوع ہونا چاہئے۔

3. مترجم کو محنت کش اور مستقل مزاج ہونا چاہئے۔

4. مترجم کو زیر ترجمہ کتاب کے موضوع یا مضمون سے گہرا شغف اور ذہنی لگاؤ ہونا چاہئے۔

5. مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھتا ہو۔

6. دونوں زبانوں کی صرف ونحو پر اس کی گہری نگاہ ہو۔

7. مطالعہ کرنے کے بعد تجزیہ کرنے کا اہل ہو۔

8. اس کی نگاہ دوررس ہو۔

9. مترجم کو مترادف کا اچھی طرح شعور واحساس ہو۔

10. لسانی نفسیات اور احساسات کو پڑھنے اور سمجھنے والا ہو۔

11. الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتنے والا ہو۔

12. ترجمے کے جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔

II. 2 نشانات کے جوابات:

1. تھیوڈر ساوری کا اصول بیان کرو؟

تھیوڈر ساوری کی فہرست میں دو خیالات ہیں۔ ایک لفظی ترجمہ پر اصرار کرتا ہے اور دوسرا بامحاورہ آزاد ترجمہ پر۔ لفظی ترجمہ کافی مشکل امر ہے اسی لیے اکثریت آزاد ترجمہ پر زور دیتے ہیں۔ ان تمام نکات کو سامنے رکھنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے جو آسانی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکے۔

2. ترجمے کے کوئی دو عام اصول لکھو؟

جواب: 1. اصل متن کے الفاظ کی مناسب ترجمانی کا خاص خیال رکھا جائے۔

2. ترجمہ شدہ متن اصل متن کی طرح پڑھے جانے کے قابل ہو۔

3. کامیاب مترجم کی دو خصوصیات بیان کرو؟

جواب: 1. مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھتا ہو۔

2. دونوں زبانوں کی صرف ونحو پر اس کی گہری نگاہ ہو۔

4. Source Language اور Target Language کی تعریف کرو؟

جواب: وہ زبان جس کے متن کا دوسری زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہو Source Language ہے اور جس زبان میں ترجمہ ہورہا ہے وہ Target Language ہے۔اسی طرح ترجمہ کیے جانے والے متن کو Source Text اور ترجمے کے بعد حاصل ہونے والے متن کو Target Text کہتے ہیں۔

5. مترجم کیلئے کن خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

جواب: مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت ہونی چاہیے۔مترجم کو اصل مقالے کی زبان اور ترجمے والی زبان کے محاوروں اور کہاوتوں پر یکساں قدرت ہونی چاہیے۔

III. ایک لفظ میں جواب دیجئے۔

1. ترجمہ کی جانے والی زبان کہلاتی ہے۔(Source Language)

2. جو شخص ترجمہ کرتا ہے کہلاتا ہے۔(مترجم)

3. ترجمے کے اصول مدون کرنے والا کون تھا۔(تھوڈر ساوری)

4. کونسا ترجمہ کامیاب نہیں کہلاتا۔(جو غیر واضح اور مبہم ہو)

5. مترجم کی سب سے پہلی خوبی کیا ہونی چاہیے۔(دیانت داری)

31C : ترجمے کی تکنیک

I. 8 نشانات کے سوالات:

1. لفظی ترجمہ سے کیا مراد ہے؟ اس کی اہمیت وافادیت پر تفصیلی روشنی ڈالو؟

جواب: لفظی ترجمہ میں اصل زبان (Source Language (SL کے اہم الفاظ اور اہم اصطلاحات کے بدلے میں ترجمے کی زبان (Target Language (TL کے مناسب اور موزوں الفاظ و اصطلاحات استعمال کئے جاتے ہیں۔ اصطلاحات کا ترجمہ کرتے ہوئے مسلمہ اور مستند اصولوں کی پاسداری انتہائی ضروری ہے تاکہ ترجمے کے مقاصد متاثر نہ ہوں۔

لفظی ترجمہ کے اہم اصول: لفظی ترجمہ کا مطلب یہ نہیں کہ اصل زبان (SL) کے لفظ کی جگہ ترجمے کی زبان (TL) کا ہم معنی لفظ لکھ دیا جائے۔ بہت سے ہم معنی الفاظ ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔ اصل زبان اور ترجمے کی زبان میں جملوں کی ترکیب اور زبان کے قواعد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

مثلاً ایک سادہ انگریزی جملہ دیکھئے

"Ahmed is Drinking Tea"

اس کا ترجمہ یوں کیا جائے ''احمد ہے پی رہا چائے'' تو یہ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ اردو جملے کی ترکیب کے لحاظ سے ''احمد چائے پی رہا ہے'' درست ترجمہ ہوگا۔

اصطلاحات کے ترجمے میں تمام مسلمہ اصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ کسی بھی علمی اور فنی اصطلاح کا ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ ترجمے کی زبان میں جو موزوں ترین ہم معنی اصطلاح ہو اسی پر زور دیا جائے۔ مثلاً سائنسی تجربہ گاہوں میں کسی محلول کو خاص قسم کے کاغذ سے گزار کر چھاننے کے عمل کو Filteration کہا جاتا ہے۔ اس کا بہترین ترجمہ ہے ''تقطیر'' جو اس پورے عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کسی بھی ترجمے میں عموماً اور علمی تراجم میں خصوصاً اس بات کی بہت اہمیت ہوتی ہے کہ اصل متن بغیر کسی تبدیلی یا اضافے کے من وعن ترجمے کی زبان میں منتقل کیا جائے۔ ایک بھی لفظ کے لیے یا اصطلاح کے

لیے مناسب ترین متبادل لفظ یا اصطلاح استعمال نہ کی جائے تو ترجمے کا مقصد مجروح ہوجاتا ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ وہ کہیں بھی اپنے شخصی خیالات وتاثرات کا اظہار نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو بالکل الگ تھلک رکھے۔ علمی تراجم میں محاورات اور ضرب الامثال سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔ لفظی ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو مصنف کے خیالات کی ترجمانی تک ہی محدود رہنا چاہئے۔ اصل زبان اور ترجمے کی زبان میں تمام دوریوں کو ممکنہ حد تک دور کرنا چاہیے۔ دونوں زبانوں کے علاوہ متعلقہ علم وفن اور ان کی اصطلاحات سے بھی بخوبی واقفیت ضروری ہے۔ اگر مترجم میں یہ تمام خوبیاں موجود ہوں تب کہیں جا کر وہ علمی تراجم سے انصاف کرسکتا ہے۔

2°. بامحاورہ ترجمہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے اصول بیان کرو؟

جواب: نامحاورہ ترجمہ کی مختصر تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے: ''اصل متن کے معنی ومفہوم کو اصل زبان کے حسن ونزاکت کے ساتھ ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا، جس پر اصل کا گمان ہو، بامحاورہ ترجمہ کہلاتا ہے۔'' بامحاورہ ترجمہ مطلب محاورے کا لفظی ترجمہ نہیں۔ صرف محاورے کی جگہ محاورہ لکھ دینے سے بامحاورہ ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ استعارات، تشبیہ اور ضرب الامثال وغیرہ کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ تب ہی ترجمے میں ادبی شان پیدا ہوسکتی ہے۔

بامحاورہ ترجمہ کے اہم اصول: ادبی تراجم کے لیے بامحاورہ ترجمہ کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب، اس زبان کے بولنے والوں کی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے اور ادب کا ارتقائی سفر مسلسل جاری رہتا ہے۔ ادب کی ترقی کے بغیر زبان کی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ ادبی تراجم کے لیے دونوں زبانوں کے ادبی ورثے، لسانی خصوصیات اور ادبی امتیازات سے واقفیت ضروری ہے۔ اصل متن کے معنی ومفہوم کو ترجمے کی زبان میں، اصل شان باقی رکھتے ہوئے منتقل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بامحاورہ ترجمہ کرتے ہوئے چند اہم اصولوں کی پاسداری ضروری ہے۔

محاورے کے معنی محض الفاظ میں نہیں بلکہ اس زبان کی تہذیب کے پس منظر میں سمجھے جانے چاہئیں اور ہر زبان اپنی اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت رکھتی ہے۔ محاورے کے ترجمے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ محاورے کا لفظی ترجمہ کردیا جائے۔ اس طرح بڑی عجیب اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی مشہور مثال یوں ہے۔ ''میرا دل باغ باغ ہوگیا'' کا ترجمہ "My Heart is Garden Garden" کردیا جائے تو بالکل غلط ہوگا۔ محاورے کے علاوہ ضرب الامثال استعارات کے ترجمے میں بھی بڑی دقت پیش آتی

ہےاور دونوں زبانوں پر ماہرانہ گرفت نہ ہوتو با محاورہ ترجمہ نا کام ہو جاتا ہے۔

اصل زبان (SL) میں کسی محاورے یا ضرب المثل کے جو معنی ،حقیقی یا مجازی ہیں، پہلے اسے ذہن نشین کرنا چاہئے۔اس کے بعد ترجمے کی زبان میں قریب ترین مفہوم رکھنے والے محاوروں کی تلاش کی جانی چاہیےاور ایسے ہی متبادل محاورات کو ترجمے میں استعمال کیا جانا چاہیے۔

II. 4 نشانات کے سوالات؟

1. "All the top brass attended the last rites" مذکورہ جملہ کا با محاورہ ترجمہ کرو؟

جواب:"All the top brass attended the last rites"اس جملے میں "Toprass" دراصل ایک استعارہ ہے جو اعلیٰ افسروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا لفظی ترجمہ ''اعلیٰ پیتل'' ظاہر ہے نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔اس کلمے کو اس کے مجازی مفہوم میں ہی استعمال کیا جانا ضروری ہے۔اس جملے کا با محاورہ ترجمہ یوں ہوگا۔''تمام اعلیٰ افسروں نے آخری رسومات میں شرکت کی''۔

2. آزاد ترجمہ کی تعریف کرو؟

جواب: آزاد ترجمے میں اصل متن کے الفاظ یا محاورات پر نہیں بلکہ اصل زبان میں ''متن کے مفہوم'' پر توجہ دی جاتی ہےاور ترجمے کی زبان میں مناسب الفاظ کی مدد سے اس مفہوم کو بیان کر دیا جاتا ہے۔گویا آزاد ترجمے میں اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ مفہوم کو سمجھا جائے اور اسے ترجمے کی زبان میں منتقل کر دیا جائے۔الفاظ میں معمولی ردو بدل ایک آدھ جملے کا اضافہ بھی ممکن ہے مگر اس سے اصل مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔آزاد ترجمے کی مختصر تعریف یوں ہے۔

> ''اصل زبان کے متن کے مفہوم کو ترجمے کی زبان میں بیان کر دینا آزاد ترجمہ کہلاتا ہے''۔

آزاد ترجمہ کو مبنی بر مفہوم Meaning Based Translation ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔صحافتی شعبے میں آزاد ترجمے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

3. آزاد ترجمہ کے اصول بیان کرو؟

جواب: آزاد ترجمہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ مترجم اصل زبان (SL) اور ترجمے کی زبان (TL) دونوں پر مکمل عبور رکھتا ہو۔اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون ،تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں،کھیل کود اور ان شعبوں سے متعلقہ

مخصوص لفظیات سے بھی واقف ہو۔اصل زبان کے متن کے مفہوم کو من وعن ترجمے کی زبان میں منتقل کر دینا چاہیے مگر اس میں الفاظ کی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔اہم مقصد مفہوم کا ترجمہ ہے۔الفاظ کا ترجمہ نہیں۔ جہاں تک ہوسکے سادہ الفاظ اور عام فہم زبان استعمال کی جانی چاہیے۔

4. ترجمہ کی مختلف اقسام بیان کرو؟

جواب: ترجمے کی مختلف قسمیں ہیں جیسے علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ وغیرہ۔ان کی مناسبت سے ترجمے کی مختلف تکنیک ہوا کرتی ہے جیسے لفظی ترجمہ بامحاورہ ترجمہ اور آزاد ترجمہ وغیرہ۔

III. ایک لفظ میں جواب دیجئے۔

1. علمی، مذہبی اور قانونی متن کے لیے کونسا ترجمہ بہتر ہوتا ہے۔(لفظی ترجمہ)

2. صحافت کے شعبہ میں ترجمہ کی کونسی تکنیک استعمال ہوتی ہے۔(آزاد ترجمہ)

3. بامحاورہ ترجمہ کہاں استعمال کیا جاتا ہے؟(ادبی ترجمہ کے لیے)

4. All Ears کا بامحاورہ ترجمہ کیا ہوگا؟(ہمہ تن گوش)

5. آزاد ترجمہ میں مترجم کی توجہ کس پر ہوتی ہے(اصل متن کے مفہوم پر)

32C : فن ترجمہ اور اس کی قسمیں

I. 8 نشانات کے سوالات:

1. ترجمے کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالو؟

جواب: یوں تو ترجمے کے بہت مسائل اور مشکلات ہیں یہاں اختصار سے چند ضروری اور اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

1. ترجمہ کرتے وقت لفظوں اور اصطلاحوں کے انتخاب کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ معاشرے کی اپنی ایک تہذیب، زبان اور ثقافت ہوتی ہے اور اس کے علاقائی وجغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔ مترجم کو ان پہلوؤں پر نظر رکھنا چاہیے۔

2. دوسرا مسئلہ لفظ اور اصطلاح کے وضع کرنے کا ہے۔ علمی تراجم کے دوران اصطلاحوں کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اگر ترجمہ کی زبان میں تصنیف کی زبان کی تمام اصطلاحات متبادل نہ ہو تو متبادل اصطلاحیں وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

3. تراجم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مترادف کا انتخاب اور استعمال ہے۔ ترجمے کی زبان میں ایسے مترادف بہم نہیں ہوتے اس میں زبان کے مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر کا بھی دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ مترجم کو مجبوراً قریب المعنی مترادفات کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

4. ترجموں کے دوران ایک اہم مسئلہ طویل جملوں کا ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے موزوں طریقہ یہ ہے کہ ایسے طویل جملوں کو پڑھ کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں توڑ دینا چاہیے۔

5. ترجمے دنیا کی تقریباً زبانوں میں ہوئے ہیں مگر آج تک کوئی ایسی مکمل اور باضابطہ کتاب سامنے آئی جس سے ترجمے کے بنیادی مسائل دور کیے جائیں اور مترجم کو اپنی راہ ہموار کرنے میں مدد مل سکے۔

6. ترجمے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مترجم مصنف کے ہاتھ میں بندھ جاتا ہے۔ مترجم کی ساری باگ دوڑ مصنف کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس لیے مترجم جیسا چاہے ترجمہ نہیں کرسکتا۔

7. سائنسی تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ معیاری اصطلاحات کا فقدان ہے

اردو میں کوئی ایسی معیاری لغت یا فرہنگ نہیں ہے جو کہ ہر طرح سے مکمل ہو اور جسے معیار مانا جائے نیز سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کا کوئی مربوط پروگرام نہ ہونے کے سبب دل جمعی سے کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہوتی ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے لیکن بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہوتی ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے لیکن بعض اصطلاحات کا ترجمہ قطعی مناسب نہیں۔

8. سماجی علوم کے تراجم میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سماجی علوم کے لیے لسانی قابلیت، وسیع مطالعہ اور محنت تینوں چیزیں لازم ہیں جو مشکل سے کسی مترجم میں یکجا ہوتی ہیں۔

9. افسانوی ادب میں بھی ترجمے کے مسائل وہی ہیں جو کسی بھی غیر زبان تحریر کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت پیدا ہوتے ہیں تاہم افسانوی ادب کے تراجم مترجم میں خاص صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی ہو بہ الفاظ دیگر ترجمہ کرتے وقت مترجم تصنیف کی زبان میں پوری طرح رچ بس جائے اور جب ترجمہ کرنا شروع کرے تو ترجمے کی زبان میں لوٹ آئے۔

10. شعری ادب کے تراجم کے مسائل کا ذکر چھڑتے ہی ڈاکٹر جانسن کا وہ قول ذہن میں آجاتا ہے کہ اس نے سادہ الفاظ میں کہا تھا ''نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا'' اور وکٹر ہیوگو نے کہا تھا کہ نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔ ان اقوال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری کا ترجمہ شاعری میں کرنا نہایت مشکل کام ہے تاہم تمام مشکلات کے باوجود دنیا میں شاعری کے تراجم شاعری میں ہوتے آئے ہیں۔

2. مترجم کی ذمہ داری پر مضمون لکھو؟

جواب: ایک کامیاب مترجم میں پائی جانے والی خصوصیات کے بارے میں مختلف ماہرین کے خیالات درجہ ذیل ہیں۔

شاہ پرتگال کنگ ڈیوراٹ نے اپنی کتاب ''دی رائل کونسلر'' میں مترجم کی درج ذیل پانچ خصوصیات بیان کی ہے۔

1. مترجم، اصل متن کے معانی کو سمجھے اور ترجمے میں انہیں کسی تبدیلی کے بغیر منتقل کرے۔

2. مترجم ترجمے مین ترجمے کی زبان کا لحاظ رکھے اور روزمرہ و محاورات کا استعمال کرے لیکن خیال رہے کہ اصل متن سے انحراف نہ ہونے پائے۔

3. مترجم ترجمے کی زبان سے ایسے الفاظ استعمال کرے جو اصل زبان کے الفاظ کے راست اور مناسب متبادل ہوں۔

4. مترجم ناپسندیدہ الفاظ سے گریز کرے۔

5. مترجم ان تمام اصولوں کی پابندی کرے جو عبارت نگاری کا لازمہ ہیں۔اسی طرح Etienne Dolet اپنی معرکتہ آرا کتاب

"The best way translating from one

languageto another"

میں وہ لکھتا ہے کہ مترجم کو چاہیے کہ وہ

1. اصل معنی کو سمجھے۔

2. اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھے۔

3. لفظی ترجمے سے گریز کرے۔

4. ترجمے میں بے محاورہ زبان استعمال کرے۔

5. الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتتے ہوئے جملوں میں مناسب آہنگ پیدا کرے۔

مذکورہ بالا ماہرین فن ترجمہ کے بیانات نے مترجم کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ظاہر ہے وہ آج کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں ان کے خیالات سے صد فیصد اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن ان کی بیان کی گئی بہت سی باتیں آج بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

ترجمے کے سلسلے میں مترجم کی اہم ذمہ داریاں یہ ہیں کہ وہ

1. اپنے وجود، خیال، جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے تابع کردے۔

2. یہ خیال کرے کہ فلاں بات، فلاں جملہ، فلاں عبارت یا محاورہ مصنف خود ہماری زبان میں لکھتا تو کس طرح لکھتا۔

3. ادبی شوق رکھتا ہو اور صاحب طرز ادیبوں اور مصنفوں کا بغائر مطالعہ کرے۔

4. مستقل مزاجی رکھتا ہوں۔اس میں سیمابی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔

5. ادبی ترجمہ کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو۔ وہ دونوں زبانوں کے ادب کی باریکیوں، نفاستوں اور تہہ داریوں کو بخوبی سمجھ سکے۔

6. نئے الفاظ، تراکیب اور اصطلاحیں وضع کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔
7. ذہین اور فریس ہو۔ نیز متن سے ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ مصنف سے مترجم کی جذباتی وابستگی اور نفسیاتی مماثلت بھی ہو۔
8. تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل رکھتا ہو۔
9. اصل متن اور مصنف سے عصبیت نہ رکھتا ہو۔
10. اصل متن کی روح، نوعیت، جذبات، محاورت، اسلوب بیان کے نظام کا خیال رکھتا ہو۔

II. 4 نشانات کے سوالات:

1. مذہبی تراجم کی اہمیت بیان کرو؟

جواب: کسی بھی تہذیب کی بنیاد کچھ خاص قدروں پر رکھی جاتی ہے اور یہ خاص قدریں عموماً مذہب کی دین ہوتی ہیں۔ جب دو تہذیبوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے تو ان میں سماجی، ادبی اور مذہبی قدریں باہم گھل مل جاتی ہیں اور یہ عمل ترجمہ ہی کے ذریعہ طے پاتا ہے۔

مثلاً قدیم دور میں بدھ مت کے پیروکاروں نے اپنے صحائف کے کچھ حصوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا جس سے ان کا مقصد اپنے مذہب کی تبلیغ تھا۔

اسی طرح جب مذہب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو اہل یورپ کو بڑی تشویش اور جستجو ہوئی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن مجید میں وہ کونسی باتیں بتائی گئی ہیں کہ لوگ جوق در جوق مذہب اسلام میں داخل ہو رہے ہیں چنانچہ قرآن شریف کے ابتدائی تراجم نا لترتیب لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں کیے گئے۔ الغرض کہ دنیا کی تاریخ بنانے اور سنوارنے میں مذہبی تراجم نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو میں مذہبی تراجم کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس کی عمر ہے۔

2. قرآن مجید کے تراجم پر مختصر نوٹ لکھو؟

جواب: شمالی ہند کے مشہور عالم دین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند مولانا شاہ رفیع الدین نے 1776ء میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ دوسرا ترجمہ شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے 1795ء میں کیا۔ اس کے بعد سے تا حال ہمیں قرآن شیرف کے بے شمار تراجم ملتے ہیں۔

3. ماخوذ ترجمہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ماخوذ ترجمے میں مترجم آزاد ترجمہ کے حدود کو تجاوز کرتا ہے وہ اصل نظم سے صرف بنیادی خیال کو اخذ کرتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اصل تخلیق کو اپنے انداز میں پیش کرتا ہے۔

علامہ اقبال کی نظم پرندے کی فریاد ولیم کوپر کی نظم

"On a Gold Finch Starved to Death in His Cage"

سے ماخوذ ہے اور دونوں نظموں میں مماثلت ہے۔ ''پرندے کی فریاد'' کے ابتدائی دو بند آزاد ترجموں کی تعریف میں آتے ہیں البتہ بعد کے تین بندوں میں اقبال نے اصل نظم سے انحراف کرتے ہوئے آزادی اور قید کے تجربات اور تاثرات کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

III. دو نشامات کے جوابات:

1. نثری ترجمے کے مراحل کیا ہیں؟

جواب: نثری ترجموں کے لیے درجہ ذیل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔

1. متن کا انتخاب۔2. متن کی تفہیم۔3۔متن سے ہم آہنگی۔4. ترسیل۔5 متن کا ادب پارہ ہونا۔

2. ترجمے کی اقسام بیان کرو؟

جواب:1۔علمی ترجمہ 2۔ادبی ترجمہ 3۔صحافتی ترجمہ 4۔مذہبی ترجمہ

3. مترجم کی اہم ذمہ داری کیا ہوتی ہے؟

جواب: سامع سے ہم آہنگی۔زبان سے ہم آہنگی۔متن کی تفہیم سے ہم آہنگی۔فن پارے سے ہم آہنگی۔ متن کے انتخاب کے وقت مترجم کی ذمہ داری۔

اصل متن سے انحراف۔متن سے آزادی۔متن سے پوری وفاداری۔ان میں سے کوئی نہیں۔

4. انجیل کے کتنی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

جواب:

	زبانوں کی تعداد
افریقہ	665
ایشیاء	585
بحرالکاہل اور قریبی سمندروں کے جزیرے	414
جزائر عرب الہند اور لاطینی امریکہ	404
یورپ	209
شمالی امریکہ	78

اضافی سوالات

I. تفصیلی سوالات۔

1. انٹرویو لینے والے میں کیا خوبیاں ہونی چاہئے؟

جواب: انٹرویو لینے والے میں حسب ذیل خوبیاں ہوں تو وہ کامیاب انٹرویونگار کہلائے گا۔

(1) انٹرویو لینا ایک فن ہے اس لئے انٹرویو لینے والے میں فنکارانہ صلاحیتیں ہونا ضروری ہے۔

(2) وہ ذہین ہو، فریس ہو، اور باکمال ہو، گفتگو میں نرمی، لہجہ میں گرمی اور سادہ اور آسان زبان استعمال کرے۔

(3) انٹرویو لینے والا اپنے لباس کا خیال رکھے، سنجیدہ قسم کا باوقار لباس زیب تن کرے اس سے انٹرویو دینے والے پر اچھا اثر پڑے گا۔

(4) انٹرویو لینے والے کی نظر، انٹرویو دینے والے پر جمی رہے، غور سے ہر بات سنے اور مناسب ردِعمل کا اظہار کرتا رہے کہیں پر بھی یہ احساس نہ ہونے پائے کہ وہ جواب سے مطمئن نہیں ہے۔

(5) انٹرویو میں نفسیاتی پہلو کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بعض انٹرویو دینے والے خوشامد پسند ہوتے ہیں۔ نامہ نگار یا انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ ان کی نفسیات کو سمجھے۔

(6) بعض لوگ اپنی عظمت جتانے کے لئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انٹرویو اور پبلسٹی سے بے نیاز ہیں۔ ایسی شخصیتوں کو شیشے میں اتارنا ایک باصلاحیت صحافی کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

(7) انٹرویو لیتے وقت نہ انکساری سے کام لینے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اتنی خودسری برتی جائے کہ اس پر سوار ہو جائے۔

(8) گفتگو کے آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(9) انداز بیان قدرتی اور بے ساختہ انداز اختیار کرنا اور مقصد کو مدنظر رکھ کر انٹرویو لینا چاہئے۔

(10) انٹرویو کی روداد تحریر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی غلط بات نہ منسوب ہو جائے اگر کوئی بات واضح نہیں معلوم ہو رہی ہے تو انٹرویو دینے والے سے ربط پیدا کر کے اس کی تصدیق یا صحت کر لی جائے۔

(11) بعض شخصیتیں انٹرویو کے بعد مسودہ دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں یہ بہترین ہے لیکن اگر مناسب سمجھا

جائے تو مسودہ دکھا لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

(12) انٹرویو لینے والے کو اپنا شناختی کارڈ ضرور ساتھ رکھنا چاہئے۔

(13) انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ وہ طئے شدہ جگہ پر پہنچنے میں وقت کی پابندی کرے۔

(14) انٹرویو لینے والے کو ذہنی طور پر تیار رہنے کے علاوہ قلم کاغذ، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ جیسے ضروری سامان بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔

(15) انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ انٹرویو دینے والے کے وقت کا خیال رکھے اور اختتام پر انٹرویو دینے والی شخصیت کا شکریہ ادا کرے۔

2. نامہ نگار اور رپورٹر میں کیا فرق ہے؟ دونوں کے کاموں کی نشاندہی کیجئے؟

جواب: رپورٹر اور نامہ نگار میں باریک فرق ہے جس شہر سے کوئی اخبار نکلتا ہے وہیں رہ کر جو لوگ اس کے لیے خبریں جمع کرتے ہیں انہیں صحافتی اصطلاح میں رپورٹر کہا جاتا ہے اور جو شخص اسی اخبار کے لیے خبریں کسی دوسرے مقام پر رہ کر بھیجتا ہے تو اس صحافی کو نامہنگار کہتے ہیں۔

اس طرح ہر اخبار اپنے رپورٹر اور نامہ نگار رکھتے ہیں۔ خبر رساں اداروں کے بھی اپنے رپورٹر ہوتے ہیں جو معاشرہ کا ایک باشعور اور باریک بین مشاہد ہوتا ہے جس کا مقصد خبریں جمع کرنا اور انہیں دیانت داری اور غیر جانب داری کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔

جس رپورٹر کے پاس خبر جس قدر تیز ہوگی وہ دنیائے صحافت میں اسی قدر کامیاب اور مقبول سے مقبول ترین رپورٹر کہلائے گا۔ رپورٹر عام انسان سے ذرا الگ ہوتا ہے اس کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے جسے خبری حس کہا جاتا ہے وہ خبریں سونگھتا ہے، چھوتا ہے، دیکھتا ہے اور چھکتا ہے۔

رحم علی الہاشمی کا کہنا ہے کہ رپورٹر حالات زمانہ کی رفتار کو وسیع ترین معنوں میں مشاہدہ کرتا ہے اور بقیہ حصہ دنیا کے فائدے کے لیے اسکی تصویر کو الفاظ میں کھینچ دیتا ہے۔

رپورٹرس اور نامہنگاروں پر الزام ہے کہ وہ خبریں سنسنی خیز اور غیر مصدقہ اطلاعات کی ملاوٹ نہ کرے۔ خبر کو دلچسپ اور مطالعہ کے قابل بنانے کے لیے توڑ مروڑ کر پیش نہ کرے۔ رپورٹر اور نامہ نگاروں کو چاہئے کہ وہ اپنی پسند ناپسند تعصّبات و ترجیحات، نظریات و خیالات اور احساسات کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تحریر میں توازن پیدا کرے۔

جب کسی رپورٹر یا نامہ نگار کو رپورٹنگ کا خاص کام سونپا جاتا ہے یا بیرون ملک کسی خاص موقع پر رپورٹنگ کی ذمہ داری دی جاتی ہے تو انہیں نمائندہ خصوصی کہا جاتا ہے۔

ہر اخبار کا اپنا رپورٹر، اسٹاف رپورٹر کہلاتا ہے جو چیف رپورٹر کی نگرانی میں ذمہ داریوں کو سنبھالتا ہے چیف رپورٹر تمام رپورٹروں کی مرسل خبروں پر نظر ثانی کرتا ہے۔

خبروں کے موضوع کے اعتبار سے رپورٹر یا نامہ نگار متعین ہوتے ہیں کیوں کہ ایک رپورٹر ہر قسم کی خبروں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ایک معیاری اخبار چیف رپورٹر کے علاوہ اسٹاف رپورٹر، نمائندہ خصوصی غیر ملکی نمائندہ، اسپورٹس رپورٹر، کرائم رپورٹر، پارلیمان نامہ نگار، لابی نامہ نگار، سیاسی نامہنگار، سفارتی نامہ نگار، سائنسی نامہ نگار اور تجرتی نامہنگار مقرر کرتا ہے۔

3. سرخی کیا ہے بیان کیجئے؟

جواب: خبر کے عنوان کو سرخی کہتے ہیں لیکن سرخی کی یہ تریف مکمل نہیں ہے۔ اخبارات میں خبروں کے علاوہ مضامین، فیچر، تبصرے اور متعدد دیگر کالم بھی شائع ہوتے ہیں اور ان پر بھی سرخیاں لگائی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے صحافتی مواد کا عنوان سرخی کہلاتا ہے۔ مواد کے لیے سرخی کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو کتاب کے لیے نام کی ہوتی ہے۔

ایک اچھی سرخی خبر کے اشتہار کا کام کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ خبر کا خلاصہ بھی بیان کرتی ہے اور صفحے کی خوب صورتی میں بھی حصہ لیتی ہے۔

سرخی کے ذریعہ خبر کی اہم ترین اور مرکزی بات اجاگر ہوتی ہے اور خبر کی نوعیت اور اس کے لہجے کی عکاسی بھی ہوتی ہوتی ہے۔ R.D.Man & Field اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ سرخیوں نے صحافت کو مقبول عام بنایا۔

اخبار کا مقصد قاری کی توجہ کھینچنا اس کی دلچسپی ابھارنا اور اسے یہ دیکھنے پر آمادہ کرنا ہے کہ اخبار میں اہم باتیں کیا ہیں چنانچہ اخبار یہ مقصد سرخیوں کے آزادانہ استعمال سے پورا کرتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی خبر کے پڑھے یا نہ پڑھے جانے کا انحصار بڑی حد تک سرخی پر ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قارئین کی اپنی اپنی مخصوص دلچسپیاں ہوتی ہیں مثلاً سیاست، کھیل کود، تجارت اور فلم وغیرہ ہر قاری اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مطلوبہ خبریں تلاش کر کے پڑھنا چاہتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی خبریں

سب کے لیے یکساں طور پر دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں۔۔اگر کسی خبر کیسرخی سے انہیں متوجہ کرلیا تو وہاس خبر کو پڑھیں گے ورنہ نمایاں سرخیوں پر ایک نظر ڈال کر اخبار پھینک دیا جائے گا۔ یہ بھی بات صحیح ہے کہ اخبار عجلت میں نکلتا ہے اور فرصت میں پڑھا جاتا ہے اس لیے عجلت میں نکلنے والی چیز پر سرخیاں نہ صرف نفس مضمون کا تعارف کراتی ہیں بلکہ اخبار یا جریدے کے صحات کی زینت کو بھی بڑھاتی ہیں۔ ریورس سرخیاں، مختلف رنگوں اور مختلف ہستیوں میں چھپنے والی سرخیاں صفحے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں اور ایک ہی نظر میں قاری کو بتا دیتی ہے کہ کونسی خبر زیادہ اہم ہے اور کون سی کم اہم ہے۔

4. تشہیر کی اقسام بیان کیجئے؟

جواب: تشہیر کی اقسام کے لحاظ سے درجہ ذیل مختلف طریقوں سے درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔

1. تشہیر برائے مصنوعات:۔

تشہیر کی یہ سب سے عام قسم ہے۔اس تشہیر میں روزمرہ صارفین کی اشیاء کی تشہیر کی جاتیہے ایسی تشہیر میں کمپنی سے زیادہ اس کی مصنوعات Products کی تشہیر پر زیادہ توجہ مرکوز کی جاتی ہے اور Product کو ہر طرح سے مارکیٹ میں موجود دیگر مصنوعات سے عمدہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ایسے حربے استعمال کئے جاتے ہیں جن سے صارف (گاہک) اسے خریدنے پر آمادہ ہوجائے۔

2. صنعتی تشہیر:۔

اس قسم کی تشہیر میں مشینوں اور تکنیکی آلات وغیرہ کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں اور حقائق کو راست طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ایسی تشہیر کے مخاطب عموماً تکنیکی طور پر خواندہ ہوتے ہیں۔

3. ادارہ جاتی تشہیر:۔

ادارہ جاتی تشہیر کا مقصد عوام میں کسی ادارے کے مجموعی تاثر کو ابھارنا ہوتا ہے۔اس میں ادارے کے جن امور پر توجہ دی جاتی ہے وہ ادارے کی تحقیق، پیش رفت، معیار کے حصول کے ضمن میں کاوشیں، تعلیمی، کلچرل اور کھیل کود کے میدان میں ادارے کی سرپرستی وغیرہ ہیں۔ یہاں پر ادارے سے متعلق معلومات عوام کو فراہم کی جاتی ہیں۔مرکزی یا ریاستی حکومت کے اقدامات سے متعلق ایک بڑا ڈسپلے بورڈ اس کی عمدہ مثال ہے نیز کسی اخبار میں ریاستی وزیراعلیٰ کی تصویر کے ساتھ ریاست کی ترقی کی تفصیلات کا اشتہار جو اخبار کے پورے صفحہ پر شائعکیا جاتا ہے۔

4. جماعت بند تشہیر:۔

ڈسپلے تشہیر کے مقابلے اس قسم کے اشتہار میں کم سے کم الفاظ اور سیدھے سادے انداز میں اشیائے فروخت سے متعلق معلومات دی جاتی ہیں۔ایک ہی قسم کے اشتہارات کو ایک مشترک عنوان کے تحت شائع کیا جاتا ہے۔اس لئے ان کو زمرہ بند یا جماعت بند اشتہارات کہتے ہیں۔جس سے قارئین کو ایک ہی جگہ ان کی مطلوبہ اشیاء یا خدمات کے اشتہارات مل جاتے ہیں جیسے مکانات کی خرید وفروخت، مکانات کرایہ پر، پرانی اشیاء کی فروخت، ملازمت کے لئے اشتہار شادی بیاہ کی رشتے وغیرہ۔

5. عوامی خدمات کے لیے اشتہارات:۔

اس طرح کی تشہیر عموماً سماجی خدمات کی فراہمی کے لیے کی جاتی ہے ایسی تشہیر کو تشہیر برائے فروغ بھی کہا جاتا ہے۔جس میں سماجی خدمات جیسے قومی یکجہتی، مذہبی بھائی چارہ، خاندانی منصوبہ بندی، آلودگی سے نجات کے طریقے وغیرہ عنوانات کے تحت اشتہارات شامل ہیں۔ایسی تشہیر کا مقصد عوام کو پیغام پہنچانا اور قوم و سماج میں مثبت تصورات کی تعمیر ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ اور بھی اقسام کی تشہیر ہوتی ہے۔ جیسے ٹنڈرس، قانونی نوٹس، شیرس (حصص) بانڈس وغیرہ کے اشتہارات اخبارات کی ترقی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

5. الکٹرانک میڈیا کس طرح نقصان دہ ہے؟

جواب: بلاشبہ الکٹرانک میڈیا میں ٹیلی ویژن سب سے زیادہ مقبول ترین میڈیم ہے اور جہاں اس سے بے شمار نفع بخش فائدے ہورے ہیں وہیں بے انتہا نقصانات بھی ہورہے ہیں۔ بے شمار ٹی. وی چینلوں کے دن رات ٹیلی کاسٹ سے سماج میں منفی اثرات بھی دیکھے جارہے ہیں۔ٹی. وی آج ہر گھر کی ضرورت ہوگئی ہے لیکن ٹی. وی ہر مخرب الاخلاق فلمیں اور سیریلز گھر بیٹھے ہمارے ذہنوں کو پراگندہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جن کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ آئے دن سماج میں ایسے شرم ناک واقعات رونما ہورہے ہیں جو ٹی وی کی ایجاد سے پہلے کبھی دیکھنے سننے کو نہ ملے تھے۔

الغرض ہم اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ ہمیں ٹی. وی کے کون سے پروگرام دیکھنے چاہئیں اور کن اوقات میں دیکھنے چاہئیں تاکہ ہماری روزمرہ زندگی کے دوسرے اہم کام متاثر نہ ہونے پائیں۔ بچوں اور طالب علموں کی پڑھائی اور دیگر مصروفیات بھی ٹی. وی کی وجہ سے متاثر ہونے کی شکایت عام ہیں۔ضرورت اس

بات کی ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنے کے اوقات اور پروگرام مقرر کر لئے جائیں۔

6. سوانح نگاری کسے کہتے ہیں لکھئے؟ سوانح نگاری اور آپ بیتی میں کیا فرق ہے؟

جواب: سوانح نگاری میں کسی ایک فرد کی زندگی کے واقعات، ماحول، ادبی کاروائیوں کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے۔ یہ غیر افسانوی ادب کی ایک قسم ہے۔ جس میں فرد واحد کی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ، اس کی ذاتی فکر، دلچسپیاں اور اس عہد کے تمام حالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اردو میں باقاعدہ سوانح نگار کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔ جنہوں نے ''حیات سعدی'' لکھ کر اس صنف کی ابتداء کی۔ سوانح نگاری کی جھلکیاں اور نشانات حالی سے قبل تذکروں میں ملتے ہیں مگر مکمل فن کے ساتھ حالی کے پاس ہی یہ صنف ملتی ہے۔ حالی نے 'حیات سعدی' کے بعد اردو کے دوسرے بڑے سوانح نگار علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ جنہوں نے اسلامی سوانح 'عمریاں' لکھیں۔ ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں یہ ہیں سیرت نبویؐ، المامون، الفاروق اور سوانح ابوالکلام وغیرہ۔

سوانح نگاری میں ایک فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کے واقعات کو کوئی دوسرا فرد تحریر کرتا ہے جبکہ آپ بیتی خود کی کہانی ہوتی ہے جس میں ایک فرد خود اپنے تعلق سے اپنی تمام زندگی کے واقعات کو ایک کتاب کی شکل میں لکھتا ہے۔ سوانح نگاری میں کئی حقائق چھوٹ جاسکتے ہیں جب کہ آپ بیتی میں وہ تمام حقائق و واقعات سامنے آتے ہیں جس کو خود تحریر کرنے والا پسند کرتا ہے۔ ہاں بعض اوقات خودنوشت یا آپ بیتی میں ایسے واقعات عمداً چھوڑ دئے جاتے ہیں جس سے اس شخصیت کی برائیاں ظاہر ہو مگر سوانح عمری میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہاں ایک شخص کی زندگی کو دوسرا شخص بیان کرتا ہے۔ اردو میں ابتدائی دور میں شائع ہونے والی خودنوشت ''تواریخ عجیب'' ہے جس کا مصنف جعفر تھا۔ مشہور شاعر ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی کی خودنوشت ''داسانِ غدر'' ہے جبکہ خواجہ حسن نظامی نے اپنی خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے شائع کیا۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت کو 'یادوں کی برات'' کے نام سے شائع کیا۔

7. متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

''اتنے میں ایک آواز جنگل کی طرف سے بادشاہ کے کان میں آئی ''میں جاتی ہوں، ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے''۔

اوپر دی گئی عبارت سبق ''حق وفاداری'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف حیدر بخش حیدری ہیں۔

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ ایک رات بادشاہ اپنے محل کے بالائی حصے پر چہل قدمی کرتے ہوئے

نیچے دیکھتا ہے جہاں ایک پاسبان محل کی نگرانی کرتے ہوئے کھڑا ہے۔ بادشاہ اس پاسبان سے بات چیت کرتا رہتا ہے کہ اچانک جنگل سے ایک آواز آتی ہے میں ''میں جاتی ہوں ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے'' بادشاہ آواز کو سن کر پاسبان سے پوچھتا ہے کہ کس کی آواز ہے اور کیوں آرہی ہے۔ پاسبان کہتا ہے کہ یہ آواز کئی دنوں سے آرہی ہے مگر میں محل کی حفاظت کے لیے یہاں ہوں اس لیے یہ معلوم نہیں کرسکا کہ کس کی آواز ہے اگر بادشاہ اجازت دیں تو ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ پاسبان کو اجازت دیتا ہے اور پاسبان اس آواز کو معلوم کرنے کے لئے نکلتا ہے۔

اے قبلہ وکعبہ، وہ بادشاہ منصف وعادل ہے۔ ایسے ولی صاحب سخا، اہل ہمت، غریب وسرور کرم بخش کے بدلے ایک میں کیا اگر تمام گھر تمہارا کام آوے تو منصوانہ کرنا کیوں کہ ایک مجھ ناچیز اگر اس کے صدقے ہوا تو ہوا۔ وہ جیتا رہا تو ایک عالم کو پرورش کرے گا۔

مندرجہ بالا اقتباس سبق ''حق وفاداری'' سے لیا گیا ہے جس کے مصنف حیدر بخش حیدری ہیں۔

اس عبارت میں پاسبان کا بیٹا طبرستان کے بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ والد صاحب طبرستان کا بادشاہ بہترین سخاوت کرنے والا ہے۔ لوگوں میں عدل وانصاف کے لئے جانا جاتا ہے۔ وہ غریبوں کا مددگار اور غلطیوں کو معاف کرنے والا ہے۔ ایسے نیک بخت اور بہترین بادشاہ کے لئے میں ایک نہیں بلکہ تمام گھر کے افراد کی قربانی کی بھی ضرورت آئے تو ضرور قبول کرنا اور بادشاہ کی حفاظت کرنا۔ لڑکا مزید کہتا ہے کہ بادشاہ اگر زندہ رہا تو ایک سلطنت کی پرورش کرے گا۔ ایک عالم کی دیکھ بھال کرے گا۔ اسی لئے بادشاہ کی عمر میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔

8. ذیل کے عبادتوں کا بحوالہ متن تشریح کیجئے؟

(A) ''کھیت مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو چین سے کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس الگ''

مندرجہ بالا عبارت افسانہ ''پوس کی رات'' سے لی گئی ہے۔ جس کے افسانہ نگار منشی پریم چند ہیں۔

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ ہلکو جب منی کے پاس سے جمع شدہ تین روپے لے کر زمیندار شہنا کو لوٹانے جاتا ہے تو منی غصہ میں آکر کہتی ہے کہ کھیتی میں کام کرنے سے بہتر ہے کہ دوسروں کے پاس جا کر مزدوری کریں۔ مزدوری کرنے سے کھانے کے لئے روپے ملیں گے اور زندگی سکون سے گزرے گی۔ اپنی کھیتی

میں محنت کر کے زمینداروں کو روپے دینا اوپر سے ان کی گالیاں وجھڑکیاں بھی حاصل کرنا کوئی مصیبت وآفت سے کم نہیں ہے۔

(B) ابھی کتنی رات باقی ہے؟ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر پائے تھے۔ جب وہ اوپر آجائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک پہر سے زیادہ رات باقی ہے۔

مذکورہ عبارت سبق پوس کی رات سے ماخوذ ہے جس کے افسانہ نگار منشی پریم چند ہیں۔

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ ہلکو پوس کی رات میں اپنی کھیتی کی حفاظت کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس کے لیے رات کا وقت گذارنا ایک مشکل کام ہے۔ کتنی کوشش کے باوجود وقت بہت آہستہ سے گذر رہا ہے۔ وہ رات کے وقت صحیح وقت کی پہچان کے لیے ستاروں کو دیکھتا ہے اور صحیح وقت کا تعین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ستارے ابھی اپنا آدھا سفر بھی طے نہیں کئے ہیں۔ رات ابھی بہت باقی ہے۔

(C) اس نے دل میں کہا نہیں جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت میں نہیں آسکتا، نوچ ہی ڈالے گا۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ اب تو کچھ دکھائی نہیں دیتا مجھے بھی۔ کہا دھوکا ہوا۔

مندرجہ بالا اقتباس سبق پوس کی رات سے ماخوذ ہے جس کے افسانہ نگار منشی پریم چند ہیں۔

یہ عبارت افسانے کے اختتامی حصہ سے ہے جس میں ہلکو کی کاہلی اور لاپرواہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہلکو سخت ٹھنڈی رات میں کھیت کی حفاظت کے لئے آکر آگ لگا کر سردی کو دور کر رہا تھا اس کے قریب اس کا کتا جبرا بھی تھا۔ اچانک کھیت میں کسی جانور کی آواز آنے پر کتا جانور کے پیچھے بھونکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہلکو آلاؤ کے پاس بیٹھ کر یہ کہتے ہوئے اپنے ذہن کو سکون پہنچاتا ہے کہ جانور کا آنا ایک وہم اور گمان ہے جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی بھیجانور فصل کو برباد نہیں کرسکتا۔ اصل میں نیل گائیوں کا غول کھیت پر حملہ کر کے فصل کو برباد کر رہا تھا مگر ہلکو اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے الاؤ کے پاس اپنی پرانی شال جسم پر ڈھانپ کر سو گیا اور فصل برباد ہوگئی۔

9. اپنے گھر کے آس پاس کی کسی تقریب کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کیجئے؟

اگست: محلّہ عباس نگر کے چوراہے کے قریب آج ایک تقریب منائی گئی جس کا موضوع تھا ''شہر کی صفائی اور ہماری ذمہ داری'' اس تقریب میں شہر کے موجودہ ایم ایل اے، مونسپل کمشنر کے علاوہ کئی علمی وسماجی شخصیتوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایم ایل اے عبدالغفور صاحب بات کرتے ہوئے کہا کہ آج ہر انسان صرف اپنے

تعلق سے سوچ رہا ہے۔کل کیا ہوگا کل آنے والوں کے لیے کیا انتظامات کرتا ہے۔اس تعلق سے بے خبر ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ صفائی کا خیال رکھے۔اپنے گھروں کی صفائی کرنے کے بعد کوڑا کرکٹ کو باہر نہ پھینکے بلکہ مونسپلٹی کی گاڑی میں ڈالیں یا مونسپلٹی کی جانب سے انتظام کئے گئے بڑے بڑے ڈبوں کا استعمال کریں۔ اپنے گھروں اور محلوں کی صفائی سے ہی ہم صحت مند رہ سکتے ہیں ورنہ آج کل مچھروں سے کئی بیماریاں عام ہورہی ہیں۔حکومت اپنے طور پر صفائی کا کام کررہی ہے مگر عام عوام جب تک حکومت کا ساتھ نہیں دیتی تب تک کوئی بھی کام کامیاب نہیں ہوسکتا۔اس کے بعد مونسپل کمشنر راجو بات کرتے ہوئے میونسپلٹی کی جانب سے کی جانے والی صفائی کے پروگراموں کی تفصیلات بتائی اور عوام سے گزارش کی کہ وہ مونسپلٹی والوں کا ساتھ دیں اور شہر کی ترقی میں حصہ لیں اس طرح یہ تقریب ختم ہوئی۔

10. امیر خسرو کا مختصر تعارف؟

جواب: اردو شاعری کا آغاز تقریباً سات سو قبل ہوا ہے۔اردو کے پہلے قابل ذکر شاعر امیر خسرو ہیں۔حضرت امیر خسرو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔لیکن انہوں نے اردو شاعری کو رواج دیا اور اس کے لیے انہوں نے مختلف طریقے استعمال کئے۔ایک مصرع فارسی لکھا اور ایک اردو اور کبھی آدھا مصرعہ فارسی اور آدھا اردو اور کبھی دونوں مصرعے اردو کے لائے۔اس طرح بہت سی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، بابل اور پنگھٹ کے گیت ان سے منسوب ہیں۔وقت کی رفتاری کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی اپنی رفتاری کو جاری رکھا۔یہاں تک کہ وہ عادل شاہی دور تک پہنچ گئی۔اس دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فن تعمیر، خطاطی اور شعر و ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ خصوصاً سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل ہوئی کیونکہ شاعر اپنے دامن میں ہر قسم کے موضعات سمیٹنے لگی۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ نظم کے بارے میں کچھ گفتگو ہو جائے۔شاعر کا وہ حصہ جو غزل کے زمرے میں نہیں آتا نظم کہلاتا ہے۔نظم کے بہت سے اقسام ہیں مثلاً مثنوی، قصیدہ، مسدس، مخمس، نظم معریٰ، آزاد نظم وغیرہ لیکن دورِ جدید کے شعرأ نے مثنوی کی قسم کو خوب استعمال کیا ہے۔

11. اکبر الہ آبادی کا مختصر تعارف۔

جواب: سید اکبر حسین نام اور تخلص اکبر تھا۔16 نومرب 1846ء کو مقام باڑہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علم و فضل میں کمال رکھنے والے باپ سید تفضّل حسین سے ہی حاصل کی اور 1866ء میں وکالت کا امتحان اول درجے سے پاس کیا اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ضلع سیشن کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچ گئے۔

اکبر کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ انہوں نے شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی مگر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاری ان کی دائمی شہرت کا باعث بنی۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی:

''اکبر کے نام کو تالیوں نے اچھالا اور قہقہوں نے بلند کیا''

اکبر چونکہ انگریزی حکومت کے نوکر تھے۔ انگریزی تہذیب کے خلاف کچھ کہنا دشوار تھا اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ جو کچھ کہنا ہے اشارے کنایے اور ہنسی مذاق کے پیراہے میں کہہ جائیں چنانچہ انہوں نے ظریفانہ انداز اختیار کیا اور اپنا پیغام ظرافت کے پردے میں پیش کر دیا۔

شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بار پرس سے محفوظ رہے اور کبھی باز پرس ہوئی بھی تو گرفت میں نہ آسکے بالآخر یہ مرد مجاہد اپنی زندگی کی تمام منزلوں کو کامیابی سے طے کرنے کے بعد 9 ستمبر 1921 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

12. ساحر لدھیانوی کا مختصر تعارف۔

ساحر لدھیانوی کا نام عبدالحی تھا وہ 1922ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور چلے گئے۔ ترقی پسند شاعروں میں غالباً ساحر ہی ایسے شاعر ہیں جن کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ پڑھا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے طرز میں نہ تو جدید اشاریت ہے اور نہ ہی کھردراپن بلکہ اس میں ایک وضاحت اور شیرینی ہے جو براہِ راست عام نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی سب سے مقبول نظم تاج محل ہے۔

ممبئی جانے کے بعد وہ فلموں کے لئے گانے لکھنے لگے۔ لیکن فلمی گانوں میں بھی انہوں نے ترقی پسند رجحانات کو بڑی خوبی سے جگہ دی ہے۔ وہ اپنی نظموں اور گیتوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کا انتقال 1980ء میں ممبئی میں ہوا۔

13. مخدوم محی الدین کا مختصر تعارف۔

جواب: نام محی الدین اور تخلص مخدوم تھا۔ 3 فروری 1908ء کو میدک (حیدرآباد کا ایک ضلع) میں پیدا ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا اورسٹی کالج میں وہ بحیثیت لکچرر مقرر ہو گئے۔ لیکن ان کی منزل کہیں اور تھی اور ملازمت سے مستعفی ہو کر کمیونسٹ پارٹی کے مستقل کارکن بن گئے۔ مخدوم کا کلیات بساط رقص پر انہیں موت کے بعد ایوارڈ دیا گیا۔ مخدوم کے فنی خلوص کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انقلاب اور آزادی کے لئے خود بھی میدان میں اتر پڑے اور کچھ دنوں کے لئے شعر و شاعری کی دنیا سے

سنیاس لے گئے اور وہ چاہتے تو اس وقت بھی سیاسی اور انقلابی شاعری کا عمل جاری رکھتے اور اس وقت جس احترام سے انہیں دیکھا جاتا تھا اس کی بناء پر آپ کی ہر تحریر نوجوانوں کے لئے صحیفہ کا حکم رکھتی لیکن اس کے خلوص نے ہنگامی اور وقتی شاعری سے محفوظ رکھا۔

مخدوم بنیادی طور پر سیاسی آدمی تھے۔ان کی نظمیں سیاسی جلسوں میں گائی جاتی تھیں۔انہوں نے کم لکھا لیکن جتنا لکھا اچھا لکھا۔25 اگست 1969 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

14. جاں نثار اختر کا مختصر تعارف۔

جاں نثار اختر کا پورا نام سید جاں نثار حسین اور اختر مخلص تھا۔ان کے آباؤ اجداد خیر آباد ضلع سیتاپور (یوپی) کے رہنے والے تھے۔مگر جاں نثار اختر کی پیدائش 1914ء گوالیار میں ہوئی۔انہوں نے دسویں جماعت تک گوالیار ہی میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کامیاب کیا۔ حالات کی ناسازی کی وجہ سے ان کو گوالیار سے بھوپال منتقل ہونا پڑا اور خوش قسمتی سے ان کا وہاں کی حمیدیہ کالج میں بحیثیت صدر شعبہ اردو و فارسی تقرر ہو گیا۔پھر کچھ مدت کے بعد بھوپال کو بھی الوداع کہہ کر ممبئی آ گئے۔اور فلموں کے لئے گانے لکھنے لے۔ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے انہیں خاص شہرت حاصل ہوئی۔

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کا آغاز غزلوں اور ہلکی پھلکی نظموں سے کیا ہے۔ان کا ایک مجموعہ خاک دل ہے جس پر ان کو نہرو ایوارڈ اور ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ (بعد از مرگ) نواز گیا۔18 اگست 1976 کو بمبئی میں قلب پر حملہ کے باعث اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

15. فراق کی دوسری رباعی کا خلاصہ لکھئے؟

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

اس رباعی کا تعلق بے ثباتی دنیا سے ہے یعنی زندگی چند روزہ ہے یا کسی قسم کے بند و نصائح یعنی نصیحت سے نہیں ہے۔اس رباعی میں محبوب یا عورت کی خصوصیات کا شاعرانہ اظہار کیا گیا ہے کہ عورت کے بغیر یہ دنیا کسی ریگستان کی طرح ہے۔کوئی گھر ایک کھنڈر کی طرح ہے۔عورت اگر محبوب ہے تو یہ مرد یا عاشق کے لیے

سراپا رحمت ہے اس لیے پہلے مصرعے میں کہا گیا ہے کہ جب عاشق کا ہاتھ محبوب اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے تو اسی لمحہ زندگی کا ہر غم، ہر درد ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعے میں شاعر نے محبوب یا عورت کو ہری کھیتی کہا ہے۔ یعنی دنیا کے اس تپتے ہوئے ریگستان میں عورت کسی حسین سائے کی طرح ہے یا کھیتی کی طرح ہے۔ عورت کا وجود اس دنیا کے لیے ایک سائے کے مانند ہے۔ شادابی کے مانند ہے۔ ہری کھتی استعارہ ہے زندگی کی شادابی کا۔

16. محروم کی پہلی رباعی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

مذہب کی زبان پر ہے نکوئی کا پیام
حسن عمل اور رات گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذ ہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

شاعر نے اس رباعی میں مذہبی رواداری، نیک عمل، سچائی اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ لوگ مذہب کے نام پر کیوں لڑتے ہیں۔ مذہب تو میل ملاپ کی تعلیم دیتا ہے اور بھائی چارہ سکھاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہر مذہب یکجہتی، سچائی، ایکتا اور اچھے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کوئی بھی مذہب فتنہ و فساد، لڑائی، جھگڑا نہیں سکھاتا، شاعر اس بات پر حیران ہے کہ جب کوئی مذہب لڑائی جھگڑے کی تعلیم نہیں دیتا تو لوگ مذہب کے نام پر کیوں لڑتے ہیں؟

17. محروم کی دوسری رباعی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

فطرت کی دی ہوئی مسرت کھوکر
اوروں کو نہ کر ملول غمگین ہوکر
یہ عمر بہر حال گزر جائے گی
ہنس ہنس کے گزاریا رو رو کر

شاعر کہتے ہے کہ قدرت نے سب کو خوشیاں دی ہیں۔ ان خوشیوں کو کھو کر، اداس پریشان نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ اداس شخص دوسرے لوگوں کو بھی اداس اور رنجیدہ کر دیتا ہے۔ زندگی تو ہر حال میں گزارنی

ہے۔اس کو روتے ہوئے کیوں گزارا جائے زندگی ہنس کر گزاری جائے تو آپ دوسرے لوگوں کو بھی خوش رکھ سکیں گے۔

زندگی اسی کا نام ہے کہ اپنا غم بھلا کر دوسرے لوگوں کو خوش رکھا جائے۔ زندگی میں آنے والی پریشانیاں، دکھ اور غم تو سب کو سہنے پڑتے ہیں۔ان سے دکھی ہو کر اوروں کو کیوں دکھی کیا جائے؟ خوش رہو، سب کو خوش رکھو۔یہی اصل زندگی ہے۔

18. متن کے حوالوں سے تشریح کیجئے۔

غیرت حور ومہ جبیں نہ رہے
ہے مکاں گر تو وہ مسکیں نہ رہے

حوالہ: یہ شعر نصاب میں شامل مرزا شوق کی لکھی ہوئی مثنوی سے اخذ کیا گیا ہے جس کے شاعر نواب مرزا حکیم تصدق حسین خان شوق ہیں۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ اس بے وقعت دنیا میں خوب صورتی کی دیوی اور جنت کی حوروں کی طرح بے شمار نسائیں تشریف لائیں جنہیں اپنے حسن و جمال پر بے انتہا ناز تھا۔لیکن وہ سب کے سب ایک کے بعد دیگرے اس بے ثبات جہاں سے تشریف لے گئے ہیں اور اب وہاں صرف مکاں ہے ان حور پریوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ حسن رہے گا نہ حسن والے۔سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

جو تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم

حوالہ: نصاب میں شامل مثنوی سے درج بالا شعر اقتباس کیا ہوا ہے جس کے لکھنے والے مرزا شوق ہیں۔

تشریح: تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں ایسے ایسے نامور بادشاہ اور شہنشاہ گزرے ہیں کہ جن کی حکومت، مملکت اور سلطنت سارے جہاں پر تھی پھر شاعر نے اس مثنوی میں بعض مقبل ترین شخصیتوں کے نام گنائے ہیں۔جن کی بادشاہیت کے قصے اور ان کی سلطنتوں کی وسعت اور ان کی سامراجیت کی کہانیاں تاریخ کے اوراق میں بھرے پڑے ہیں۔ایسے بے شمار بادشاہ اس دار فانی میں آئے اور اپنی حصے کی زندگی سمیٹ کر دنیا سے چلے گئے۔

ان میں بعضوں نے تو بادشاہیت کے نشے میں خود کو خدا کہا تو کسی نے جنت بنائی تو کوئی ساری دنیا پر حکومت کا خواب لے کر پورا ہوتے ہوا دیکھ نہ سکا اور حد سے تجاوز کر گیا اور خالی ہاتھ دنیا سے چلا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ زندہ جاوید ہوا اور نہ ہی زندہ مشہور ہوا آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں سے ان کے خاکے اڑنے لگے اور وہ ایک کے بعد ایک جا جا کے زیر خاک مقیم ہو گئے یعنی مٹی میں دفن ہو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ آج ان کی ہڈیاں تک قبروں میں نہ ہوں گی۔

کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام

حوالہ: درج بالا شعر مثنوی سے لیا گیا ہے اور مرزا شوق اس کے خالق ہیں۔

تشریح: بہرام عراق کے ایک بادشاہ کا نام تھا جسے گورخر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ اس لیے عام طور پر اسے بہرام گور کہتے ہیں۔ 420ء تا 440ء 20 سال ایران کا ساسانی فرمان روا رہا وہ اپنی شجاعت اور بہادری کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ کہتے ہیں کہ باپ کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے تینوں بھائیوں میں تخت نشینی کا جھگڑا ہوا تو درباریوں نے یہ طے کیا کہ دو بھوکے شیروں کے درمیان تاج کو رکھ دیا جائے گا اور جو اٹھا لائے وہی تخت و تاج کا وارث ہو گا چنانچہ بہرام گور تاج اٹھا لایا اور تخت و تاج کا وارث بنا۔

اس لیے شاعر کہتا ہے کہ ایسی دلیری اور جواں مردی و شجاعت دکھانے والا جو بھوکے شیروں کے آگے سے تاج اٹھا لایا وہ بھی موت کے آگے عاجز ہو گیا اور اب پتا نہیں کہ کون سی قبر میں ہو گا اور اس کے ساتھ کیا حشر ہو رہا ہو گا اب تو بہتوں نے اس کا نام تک بھی بھلا دیا ہے۔

اب نہ رستم نہ سام باقی
اک فقط نام ہی نام باقی

حوالہ: یہ شعر مثنوی مرازشوق سے لی گئی ہے جس کو مرزا شوق نے لکھا ہے۔

تشریح: رستم اور سام ایران کے دو پہلوان تھے جن میں رستم نارس کا ایک مشہور بہادر پہلوان تھا جس کی بہادری کی داستانیں شاہ نامہ میں درج ہیں اور سام ایرانی پہلوان رستم کا دادا تھا گویا دونوں ایران کے خاندانی پہلوان تھے۔ سارے عالم میں اس قدر مشہور ہوئے کہ رستم کے نام کو آج بھی بچہ بچہ جانتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ رستم و سام دنیا کے مشہور و معروف پہلوان ہونے کے باوجود موت کے ہاتھوں سے نہ

بچ سکے اور لقمہ اجل بن گئے لیکن دنیا میں آج سوا اُن کے نام کے نہ ان کی داستانیں ہے۔ لوگوں کی زبانوں پر ہیں اور نہ لوگوں کے پاس ان کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے کا جذبہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ دنوں میں داستانوں سے بھی ان کی داستانیں حذف کر دی جائیں گی اور لوگ انہیں پوری طرح بھلا دیں گے۔ ایک وقت تھا کہ سارے عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا لیکن آج.....

رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسماں و زمیں

حوالہ: یہ شعر ہمارے نصاب میں شامل مثنوی کا ہے جس کو مرزا شوق نے لکھا ہے۔

تشریح: شاعر کہتے ہے کہ دنیا میں ایسی حسین وجمیل اور خوبصورت شخصیتیں گزری ہیں کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن پر رشک کرتے تھے اور ایسے ایسے نوجوان وہ خوب رو لوگ گزرے ہیں کہ جن کا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے باعث رشک تھا۔ آج ان کا نام ونشاں باقی نہیں ہے۔ آخر وہ گئے کہاں ہیں کیا انہیں زمیں نگل لی یا آسمان کھا گیا؟ ہاں زمین انہیں اپنے آغوش میں لے رکھی ہے۔

شاعر یہاں ان لوگوں کی مثالیں دے دے کر ہمیں ڈرا رہا ہے اور واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ اس دنیا کو تو یہی طریقہ ہے یہی ریت ہے جو کل تھے آج نہیں رہے اور جو آج ہیں کل وہ ختم ہو جائیں گے اور ان کا ذکر تک نہ ہوگا داستانوں میں۔ پھر اس فنا ہونے والی دنیا سے دل لگانے کا کیا فائدہ ہے؟

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

حوالہ: یہ شعر ہماری درسی کتاب کی مثنوی سے ہے جس کے شاعر مرزا شوق ہیں۔

تشریح: شیریں اور فرہاد دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے فرہاد فارس کا رہنے والا تھا اس کو کوہ کن بھی کہا جاتا ہے۔

واقعہ مشہور یہ ہے کہ فرہاد شہزادی شیریں پر عاشق تھا جس کی شادی خسرو پرویز سے طئے پا چکی تھی۔ لیکن جب خسرو پرویز کو اس بات کا علم ہوا کہ فرہاد شیریں سے بے انتہا عشق کرتا ہے تو اس نے فرہاد کا امتحان لینے کے ارادے سے اسے بلوایا اور کہا کہ اگر تم شیریں سے سچی محبت کرتے ہو اور اسے پانا چاہتے ہو تو ''کوہ بیتوں'' کے پتھروں کو کاٹ کر شیریں کے محل تک ایک نہر تیار کرو، فرہاد فرط مسرت سے اپنا تیشہ اٹھایا اور جی جان لگا کر نہر تیار کرنے میں جٹ گیا۔ خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد یہ ناممکن کام پر گز نہیں کر سکتے گا۔ لیکن جب اس نے

دیکھا کہ برسوں کی جان توڑ محنت رنگ لا رہی ہے تو اس نے ایک مکار عورت کا سہارا لے کر کہلا بھیجا کہ شیریں فوت ہوگئی ہے۔ یہ سننا تھا کہ فرہاد شیریں کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور فوراً ہتھوڑا مار کر اپنی جان گنوا بیٹھا دوسری طرف شیریں کو جب یہ ماجرا معلوم ہوا تو وہ بھی محل کے اوپری منزل سے گر کر خودکشی کر لی۔

نل دمن قدیم ہندوستانی حصوں میں راجا ''نل'' اور ''دمنی'' کے عشق کا قصہ بہت مشہور ہے یہ قصہ اردو کی داستان ''کلیہ ودمنہ'' میں بھی موجود ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ایسی جاں توڑ محنت کرنے والا فرہاد اور ٹوٹ کر عشق کرنے والا شیریں کا کوئی پتا نہیں ہے اور نہ ہی راجا نل و دمنی کا سراغ معلوم ہے۔

شاعر کہتا ہے یہ سب موت کے ظالم پنجوں سے نہ بچ سکے مگر ان کی محبت کی خوشبو آج بھی زمانے بھر میں زندہ جاوید ہے یعنی ان کی محبت کی داستانیں آج بھی کہی اور سنی جاتی ہیں۔

19. متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری بے حساب ہے

جواب: حوالہ: مرثیہ دبیر سے اخذ کئے گئے یہ مصرعے مرزا دبیر کے تخلیق کردہ ہیں۔

تشریح: حضرت امام حسینؓ فوج یزید سے مخاطب ہو کر ہر طرح کی منتیں کر کے عاجز آ چکے ہیں۔ لیکن ان پر اس کا بالکل اثر نہیں ہوا تو حضرت امام حسین اور علی اصغر کے مرتبے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ بے زباں کون ہے۔ یہ در نجف اور شہر بانو جو حضرت علیؓ کی بہو کا صاحب زادہ ہے تمہیں اس بے زباں، معصوم، شیر خوار کا واسطہ ہے اور قسم ہے اللہ ذوالجلال کی کہ بشرب کے شاہ زادے سے مراد یثرب مدینہ منورہ کا قدیم نام ہے جس کو محمدؐ نے بعد میں مدینہ کہا ہے یعنی اللہ کے نبی کے شہر کا شاہزادہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کا پوتا ہے اور اس کا سوال صرف پانی ہے یہ تم سے جاہ و منصب نہیں چاہتا صرف پانی کی چند بوندوں کا طلب گار ہے پھر اگر تم انہیں پانی پانی پلا دیں تو اس میں تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بے حساب اجر عظیم ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ تمہاری یہ دنیاوی غلطی کو بھی معاف فرما دے گا۔ اس طرح وہ تمہیں توبہ کا ایک موقع عنایت فرمائیں گا۔

20. دیکھا وہ بوڑھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کی ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے۔

جواب: حوالہ یہ جملہ مضمون امید کی خوشی سے لیا گیا ہے۔اس کے مصنف سرسید احمد خاں ہے۔اس جملہ میں تلمیح کو پیش کیا گیا ہے۔قرآنی سورت یوسف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ کے بیٹھے تھے۔وہ ملک کنعان (موجودہ فلسطین) میں پیدا ہوئے۔یہ بارہ بھائی تھے۔ان میں حضرت یوسفؑ سب سے ذہین اور خوبصورت تھے۔ان کی دیانت داری اور فرمانبرداری کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام بہت چاہتے تھے۔اس لیے سوتیلے بھائیوں کو ان سے حسد ہوئی۔ایک روز باپ سے جھوٹ بول کر شکار کھیلنے کے بہانے ان کو جنگل کی طرف لے گئے اور یوسفؑ کو ایک کنویں میں ڈھکیل دیا۔مکاری کر کے روتے پیٹتے آئے اور کہنے لگے کہ اے باپ! حضرت یوسفؑ کو تو بھیڑیا اٹھالے گیا۔دیکھئے ان کا کرتہ ہے جو خون سے تر ہے۔

اس کیفیت پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسفؑ کے غم میں روتے روتے رہے اور ان کی بینائی چلی گئی۔

سوال: وہ قومی بھلائی کا پیالا! اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔

حوالہ: یہ جملہ سرسید احمد خاں کے مضمون امید کی خوشی سے لیا گیا ہے۔

اس جملہ میں قومی بھلائی کا پیالا سے مراد خود سرسید ہیں وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ 1857ء غدر کے بعد انہوں نے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اور اصلاحی کوششیں شروع کیں جو سرسید تحریک کے نام سے مشہور ہیں۔وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری اور مایوسی دور ہوجائے۔مسلمان انگریزی اور سائنس کے تعلیم حاصل کریں۔فرسودہ رسم و رواج سے انحراف کریں۔انگریزی حکومت کی خوبیاں کو اپنائے جب کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو دین کے خلاف سمجھتا تھا۔سرسید نے جس قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا وہی قوم ان کی اصلاحی کوششوں میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی۔انہیں دیوانہ اور کافر تک پکارا گیا۔مگر وہ قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہے۔اور اس کے لیے علی گڑھ میں محمڈن انگلو اورینٹل کالج کھولا جو آج علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید کی اس تحریک نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں اہم روال ادا کیا۔

21. دلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی غزل میں کیا فرق ہے۔ وضاحت کیجئے۔

جواب: دہلی اور لکھنو پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اردو زبان کے اہم مراکز تھے۔ یہاں کے شعرأ نے اپنے اپنے ماحول اور سیاسی حالات سے متاثر ہوکر مختلف اصناف اور انداز میں طبع آزمائی کی۔ دونوں طرف غزل کی سرپرستی ہوئی اور اس میں نئے نئے تجربات کئے گئے۔ دہلی اور لکھنو اسکول کی شاعری اپنی ساخت، خصوصیات اور اصناف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے جسے ہم دبستانِ دہلی یا دہلی اسکول اور دبستان لکھنو یا لکھنو اسکول کہتے ہیں۔

دبستان دلی:۔

ولی دکنی جب 1700 میں دہلی میں آئے تو یہاں کے فارسی گو شعرأ نے بھی ان کے اردو کلام کو سن کر اردو میں شعروشاعری شروع کردی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں دہلی شعروشاعری کا مرکز بن چکی تھی۔ ہر طرف سے شعرأ دہلی میں آکر جمع ہو چکے تھے۔ امرأ و روسا بھی شعروشاعری سے گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔

سیاسی اعتبار سے شمالی ہند میں بہت ہنگاموں اور پریشانیوں کا تھا مگر اردو کی ترقی کے لیے یہ زمانہ بہتر تھا۔ اردو زبان وادب جب اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوئی تو اس وقت سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہل چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا اردو شاعری کے عروج کا دور رہا۔ حکومت کمزور ہونے کے سبب فارسی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے میں شمالی ہند کے شاعروں نے غزل کی روایت کو سنبھالا تو اس میں نت نئے تجربے کیے اور اردو غزل میں ایہام گوئی کا چلن عام تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اردو شعرأ نے غزل میں سادگی اور سیدھے طرز بیان کو اپنایا۔ سلاست اور روانی خیال کی بلندی اور پاکیزگی کا خیال رکھا جانے لگا۔ تصوف کے مضامین کو غزل میں جگہ دی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی اور ملک کی بدحالی کا ذکر غزل میں کیا گیا۔ یہاں کے کلام میں فطری جذبات کے ساتھ یہاں دہلی کی بربادی وتباہی کے اثرات سے یاسیت (مایوسی) اور محرومی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ دنیائے فانی اور اس کی بے ثباتی کا تصور یہاں کی غزلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ محبوب کی بے توجہی اور ستم کا ذکر بڑے دلکش انداز میں ملتا ہے۔

دلی اسکول کے دیگر شعرأ مرزا مظہر جاں جاناں، شاہ ظہور الدین حاتم اور سراج الدین علی خاں اور

آرزو نے زبان کی درستگی، صفائی اور سادگی پر زور دیا۔ سخت اور بھدے الفاظوں کو ختم کیا۔

نئے خیالات کو غزل میں پیش کیا اور ایہام گوئی کی روایت کو ختم کیا۔ عشق مجازی کے ساتھ ہی عشق حقیقی اور صوفیانہ خیالات غزل میں پیش کئے۔ ان کے کلام میں درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ غزل گو شاعروں کے یہاں بھی درد وغم کی کسک ہے اور بیتے ہوئے شاندار زمانے کی یادوں کی تڑپ ہے۔

خواجہ میر درد، میر تقی میر، میر سوز، سودا، انشاء، مصحفی اور جرات اس دور کے مشہور غزل گو ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل میں معنی کی ندرت، بیان کی وسعت اور فکر وخیال کی بلندی کو جگہ دی۔ میر درد نے تو خاص طور سے روحانیت اور تصوف کے مضامین کو غزل میں سمویا۔

لکھنؤ اسکول:۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں دلی پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگی تھیں اور ملک کے اندر نئی نئی ریاستیں تشکیل پائی۔ ان میں ایک اودھ کی حکومت بھی تھی۔ لکھنو کے پرسکون اور عیش وعشرت کے ماحول میں اٹھارویں صدی کے وسطی دور سے شعر وشاعری کا چرچا زور شور سے شروع ہوا۔ دلی میں آئی تباہی نے یہاں کے شاعروں کو دلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تمام لوگوں نے لکھنو کا رخ کیا۔ جہاں پر فارغ البالی اور اطمینان تھا۔ میر، سودا، مصحفی اور انشاء نے لکھنؤ کا رخ کیا۔

لکھنوی ماحول کی بے فکری اور خوش حالی نے عیش وعشرت کو بڑھاوا دیا۔ شاعری پر بھی اس ماحول کا گہرا اثر پڑا۔ زیادہ تر شاعروں نے زبان کے ظاہری حسن اور الفاظ کی شان وشوکت پر توجہ دینی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں غزل کی روح کمزور ہوگی۔ غزل محض عیش ومسرت اور دل بہلانے کی چیز بن گئی۔ خیال کی پاکیزگی اور فکر کی بلندی کی جگہ زبان کے چٹخارے پر زور دیا گیا۔

لکھنو کی غزل گوئی میں نسوانیت اور ریختی کو رواج دیا۔ غزل میں عورتوں کے لہجے اور ان کے جذبات کی عکاسی کو خاص دخل ہوگیا۔ یہاں کی شاعری میں تکلف وتصنع اور لفظی وخارجی رنگ پایا جاتا ہے۔ شاعری میں عریاں اور فحش نگاری کو پسند کیا جانے لگا۔

لکھنو والوں نے زبان وبیان پر خاص توجہ دی اور ناسخ نے اصلاح زبان کی تحریک کو پھر زندہ کر دیا۔ اردو شاعری خاص طبقے اور خاص موضوعات تک سمٹ گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں لکھنو کی اردو غزل الفاظ کا پلندہ بن گئی۔ شعریت، گہرائی اور مزیت کے بجائے ظاہری حسن کے تذکرے، معاملہ بندی اور بیان کی صناعی

کوجگہ دے گئی۔کلام سے اثر اور سوز و گداز غائب ہو گیا۔

غرض کہ دلی اسکول کی شاعری آہ اور لکھنو اسکول کی شاعری واہ ہے۔دونوں دبستانوں کی زبان اور موضوع بیان کا اعتراف غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔''مضمون دلی اور زبان لکھنو کی خوب ہے''

22. ''اب آزادی اور برابری کا حق ہے''اس جملے کی روشنی میں عورتوں کے جائز حقوق پر ایک مضمون لکھئے؟

خواجہ حسن نظامی نے انشائیہ''مس چڑیا کی کہانی''میں موجودہ معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔مرد اور عورت سماج کا حصہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں کی فطرت میں فرق رکھا ہے۔مرد کو قوی اور عورت کو صنف نازک بنایا گیا۔مرد ہمیشہ اپنے آپ کو برتر اور حاکم سمجھتے ہیں۔اور عورت کو محکوم یا گھریلو نوکرانی تصور کرتے ہیں۔یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ مرد اور عورت کے وجود ہی سے کائنات کی رونق برقرار ہیں۔

عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لئے یہ نعرہ''اب آزادی اور برابری کا حق ہے''دیا جارہا ہے۔موجودہ سماج ترقی کی جانب گامزن ہیں اور عورتوں کے حقوق عطاء کئے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔انہیں ترقی کے موقع فراہم کئے جائیں تاکہ خوشحال معاشرہ تشکیل پاسکے۔

سماج میں لڑکی کی پیدائش پر مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔یہ خیالی ر بدگمانی کو بدلنا ہوگا۔والدین میں شعور اجاگر کیا جائے کہ لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ایک لڑکی کی تربیت پورا خاندان کی خوشحالی کا ذریعہ ہے۔ان کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیں۔

مشرقی اور مغربی تہذیب میں فرق پایا جاتا ہے۔یہاں پر عورت کو ایک مقدس مقام دیا گیا جبکہ مغربی تہذیب میں ترقی اور آزادی کے نام پر عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔اس لیے انہیں مشرقی تہذیب واقدار سے واقف کروایا جائے۔اور دینی ماحول میں اخلاقی تربیت کی جائے۔وقت ضرورت عورتوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کئے جائیں۔''جہیز کی لعنت''برائی کا خاتمہ کیا جائے ازواجی زندگی میں گھریلو ظلم وستم کا خاتمہ ہونا چاہئے۔وہ گھر کی دیوی ہے جو اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کو اولین فریضہ سمجھتی ہے۔آزادی کے نام پر استحصال نہ کیا جائے۔

23. مصنف نے اس سبق میں مغربی تہذیب پر کیا طنز کیا ہے؟اس کہانی سے کیا سبب ملتا ہے؟

خواجہ حسن نظامی نے اس کہانی میں مغربی تہذیب پر راست طنز کیا ہے کہ مغربی تہذیب میں رشتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔آزادانہ ماحول اور فرد کی آزادی کے نام پر بڑوں کی عزت واحترام کو بھول گئے۔

ان کے دل میں ماں باپ کے لیے احترام ومحبت کے جذبات نہیں ہوتے ہیں۔انہیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ انہیں پالنے اور پرورش کرنے میں ماں باپ نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں بلکہ وہ تو اسے ان کی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔اس لیے مغربی ممالک پڑھا لکھا طبقہ اپنے والدین کو ضعیفی میں خدمت کو بوجھ سمجھتے ہیں۔والدین کو دارالمعمرین Old Age Home میں بھرتی کرواتے ہیں۔

مصنف نے مغربی تہذیب میں دن بدن اخلاقی گراوٹ پر گہری چوٹ کی اور خواتین آزادی اور برابری کا نعرہ دے کر بے پردگی اور بے حیا ہو رہی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے یہ نصیحت کی ہے کہ انسان پر صحبت کا بہت اثر ہوتا ہے۔اچھے لوگوں کے ساتھ رہ کر انسان خود بخود نیک بن جاتا ہے اور برے لوگوں کے ساتھ غیر ارادی طور پر برا بن جاتا ہے۔اس لیے ہمیں بری صحبتوں سے بچنا چاہئے اور ہمیشہ اچھی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔

بچوں کی تربیت میں والدین اور ماحول کی بہت اہمیت ہے۔بچہ بڑا ہو کر اچھا انسان بنے اس کا تمام دارومدار والدین کی بہترین پورش پر منحصر کرتا ہے۔

مشرقی تہذیب میں عورت کا ایک بلند مقام ہے لیکن مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں عورت آزادی کے نام پر اپنا وقار و مرتبہ کھو رہی ہیں اس لیے ہمیں چاہئے کہ ہمیشہ مشرقی اقدار کا لحاظ رکھیں۔

24. ہندوستان کے لوگ برج بانو سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

برج بانو اردو کا تمثیلی خاکہ ہے۔اس میں اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کو واضح کیا گیا۔جب ملک تقسیم ہوا ہندوستان اور پاکستان میں مذہب کے نام پر نفرت کا بازار گرم رہا۔اس کا اثر زبانوں پر بھی پڑا۔ بدقسمتی کہ اردو کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہوئے بدگمانی پیدا کی گئی اور ہندی کا چرچا ہونے لگا۔

ایسے ماحول میں کچھ لوگ برج بانو (اردو) سے نفرت کرنے لگے تھے۔نہ صرف زبان بلکہ اس کے بولنے والوں سے بھی ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔مصنف کے پڑوسی لالہ جی نے کہا کہ ''آپ کے گھر میں ایسی عورت (برج بانو) رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا اور کئی دوست بارہا کہہ دے آپ نے خوامخواہ اردو زبان کو پاکستان سے ہندوستان لے آیئے بجائے اس کے دریائے ستلج کی لہروں میں چھوڑ آتے ہوتے۔

ہندوستان کے لوگوں کی ایسی نفرت سے برج بانو (اردو) اور خود مصنف کو بہت رنج ہوتا تھا کہ زبانوں کا کیا قصور ہے؟ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔

7. برج بانو کہاں پیدا ہوئی۔اس کا بچپن اور شباب کہاں گزرا؟

جواب: برج بانو (اردو) کو پاکستان چلے جانے کا شدت سے اصرار بڑھا اور اس کو پاکستان کی متوطن کہا گیا تب وہ غصہ میں آخر اپنے تاریخی سفر بیان کہ میرا اصلی وطن ہندوستان ہے۔ دراصل ہندوستان میں آریاؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے سرحد پر ایک گاؤں میں میرا جنم ہوا۔اس کے بعد میرا بچپن دہلی کے اطراف و اکناف کے علاقہ میں گزرا۔ پھر جب مسلمان تجارت کے ساتھ حکمرانی کے لیے دہلی پہنچے تب میری جوانی لال قلعہ دلی میں بسر ہوئی۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا۔عوام نے پسند کیا۔ میرے اندر ایسی کشش ہے کہ جو بھی میری باتوں کو سنتا ہے وہ مجھ پر فدا ہو جاتا ہے۔

میں بالکل ہندوستان کے ماحول میں جواب ہو کر ملک کے کونے کونے میں پھیلی اور وسیلہ اظہار کا ذریعہ بنی۔

25. ڈرامہ دروازے کھول دو کے کرداروں میں سے کونسا کردار آپ کو پسند ہے اور کیوں؟

جواب: کرشن چندر اردو کے مشہور افسانہ نگار گزرے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک ہی ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' تحریر کیا۔اس میں ملک کی قومی یکجہتی، بھائی چارگی اور اتحاد کا پیغام ملتا ہے۔

اس ڈرامہ کے آخری حصہ میں پنڈت رام دیال کا کردار نہایت ہی سلجھا ہوا ہے۔ رام دیال ایک کٹر برہمن ہے۔ جو فلیٹس بنوا کر بیچتا ہے یا کرائے پر دیتا ہے اس کے پاس نو فلیٹس خالی ہیں لیکن وہ کسی ایسے آدمی کو کرائے پر دینے کو تیار نہیں جو اس کا ہم مذہب یا ہم ذات نہ ہو۔ رام دیال کے کردار میں مذہبی تعصب اور جنوب کو پیش کیا گیا۔

وہ مسلمان جوڑے کو واپس کر دیا کہ آپ تو جامع مسجد اور اردو بازار میں رہیں۔ایک پنجابی کو اس لیے فلیٹ نہیں دیا کہ وہ گوشت مچھلی کھاتا ہے۔ مدراسی کو چمار کا بیٹا ہونے کے باعث کرایہ پر فلیٹ نہیں دیا۔لیکن آخر میں ایک عیسائی لڑکی فلیٹ لینے آتی ہے۔

پرانے خیالات کا آدمی پنڈت رام دیال یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان یا عیسائی کو فلیٹ میں جگہ دینے سے اس کا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔اس کی سوچ بالکل غلط تھی۔ مذہبی تعصب کی عکاسی کرتی ہے۔

بیٹا کمل کانت نے اس عیسائی لڑکی کو باپ کے مشورہ کے بغیر فلیٹ کرایہ پر دیتا ہے۔ جب رام دیال کو معلوم ہوا تو افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میرا دھرم بھرشٹ ہو گیا'' اسی دوران گفتگو کے بعد اس کی طبیعت بگڑ

جاتی ہے۔ اچانک دل کا دورہ پڑتا ہے۔ وہی عیسائی لڑکی کا باپ جو ماہر قلب ہے۔ اس نے کمل کانت کی عاجزی پر علاج کرتا تب رام دیال کو ہوش آتا ہے اس وقت پنڈت رام دیال کی سونچ اور شخصیت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ موت کے جھٹکے سے انہیں انسانیت کا درس ملتا ہے۔

پنڈت رام دیال کو احساس ہوتا کہ مذہبی تعصب سے انسانیت اور ملک کو نقصان ہوگا۔ وہ ایک مکمل ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے دل کے دروازے کھول دیتا ہے اور تمام مذاہب کے لوگوں کو گلے سے لگالیتا ہے۔

رام دیال اپنی بلڈنگ کی چابیاں اپنے بیٹے کمل کانت کے حوالہ کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے گھر کے سارے دروازے کھول دو۔ تمام لوگوں کو واپس بلالوں۔ اس سے وہ مذہبی تعصب، نفرت کو چھوڑ کر قومی یکجہتی، اتحاد اور پیار کا پیغام دیتا ہے۔

II. مختصر جوابی سوالات

1. تم یہ چابیاں لے لو کمل، اور میرے گھر کے سارے دروازے کھول دو''۔

یہ اقتباس کرشن چندر کے ڈرامہ دروازے کھول دو سے لیا گیا ہے۔ پنڈت رام دیال کو ہوش آنے کے بعد وہ اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ اس کی ملاقات بلڈنگ کی آتما (روح) سے ہوئی۔ اس نے کامیابی کا راز بتایا۔ قومی یکجہتی، بھائی چارگی، اخوت اور محبت کا پیغام دیا۔ اس لیے میں اپنے تعصب والے ذہن کو قومی یکجہتی، پیار و محبت میں بدلنا چاہتا ہوں۔

کمل! یہ چابیاں لے لو! میرے گھر کے سارے دروازے کھول دو اور اس کے سارے بیٹوں کو بلالو۔ میں نے جن افراد کو مذہب کے نام پر ناراض کیا ان سب کو آواز دو اور اس بلڈنگ کے دروازے تمام مذاہب کے لیے کھول دو اب یہ گھر اکیلے پنڈت رام دیال کا نہیں، یہ گھر تم سب کا ہے۔ اس لیے ہندوستان تمام مذاہب کا گہوارہ ہے۔

2. محاورے کو جملے میں استعمال کیجئے۔

1. آپے سے باہر ہونا: بہت غصہ میں ہونا۔ آپ خوامخواہ آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔
2. آسمان سر پر اٹھا: بہت شور کرنا۔ نہم جماعت میں بچے استاد کے جاتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔
3. باغ باغ ہونا: خوش ہونا۔ کامیابی کی سند حاصل کر کے دل باغ باغ ہو گیا۔
4. سبز باغ دکھانا: دھوکا دینا۔ الیکشن میں سیاسی پارٹیاں ووٹ حاصل کرنے کے لیے عوام کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔

3. تذکیروتانیث لکھیے۔

دولہا: دولہن	نواب: بیگم
غلام: باندی	معلم: معلّمہ
بیل: گائے	محترم: محترمہ
اونٹ: اونٹنی	شاعر: شاعرہ
بکرا: بکری	دھوبی: دھوبن

4. محاورے کو جملے میں استعمال کیجئے۔

1. بال بھی بیکا نہ کرسکتا: کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ہم زندہ ہیں تمہارا بال بیکا نہیں ہوگا۔

2. پاپڑ بیلنا: بہت محنت کرنا: لاکھوں افراد ہندوستان میں آج بھی ایسے ہیں جو دن بھر پاپڑ بیلنے کے باوجود شام کو پیٹ بھر روٹی نہیں پاتے۔

3. پگڑی اچھالنا: بدعزت کرنا: الیکشن کے دنوں میں امیدوار اپنے مخالف کی پگڑی اچھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

4. پانی پانی ہونا۔ شرمندہ ہونا۔ راموسیکل چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تو پانی پانی ہوگیا۔

5. چراغ گل ہونا۔ برباد وختم ہوجانا۔ 1857ء کے غدر کے بعد سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا۔

5. متن کے حوالے سے تشریح کرو؟

تم غریب تھیں تو امیر کی کوٹھی میں گھونسلہ کیوں بنایا؟ کسی غریب کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا؟

جواب: یہ جملہ انشائیہ ''مس چڑیا کی کہانی'' سے لیا گیا ہے۔

اس جملہ میں مصنف نے مس چڑیا کی زبانی اس کے والدین چڑیا اور چڑے کی نصیحت کروائی کہ ہر آدمی کو اپنی حیثیت وحالات کے مطابق ہی زندگی گزارنی چاہئے۔ اپنے سے امیر اور خوشحال لوگوں کی نقل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آمدنی کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے ہم امیر تو نہیں بن سکتے لیکن حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے مس چڑیا نے اپنی ماں پر طنز کرتے ہوئے کہتی کہ تم غریب تھیں تو امیر کی کوٹھی میں گھونسہ کیوں بنایا؟ کسی غریب کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔

6. حسب ذیل الفاظ کے معنی لکھئے اور جملوں میں استعمال کیجئے۔

1. صحرا: ریگستان/بیابان/جہاں درخت وغیرہ کچھ نہ ہو: اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا گیا ہے۔

2. زماں: وقت/زمانہ: ظرف زماں وقت کو ظاہر کرتا ہے۔

3. مکاں: جگہ: ظرف مکاں جگہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

4. صدی: سو سال: ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں۔

5. بیدار: جاگتا ہوا/ہوشیار/چوکنا: بالغوں میں خواندگی کے لیے لوگوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

6. خلوت: تنہائی/گوشہ نشینی/سونے کا کمرہ: خلوت پسند انسان غیبت سے دور رہ سکتا ہے۔

7. فراق: جدائی/علیحدگی/ہجر: فراق میں جینا مشکل ہوتا ہے۔

8. تہذیب: اصلاح، آراستگی، خوش اخلاقی: ہندوستان کی تہذیب مثالی تہذیب ہے۔

9. غروب: سورج یا چاند کا ڈوبنا/زوال/خاتمہ: مغلیہ حکومت کا سورج غروب ہو چکا ہے۔

10. دکھ: تکلے/رنج/درد: دکھ میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

11. سنسار: جہاں/کائنات/دنیا: سنسار سرائے فانی ہے۔

12. ویرانے: اجاڑ/غیر آباد: ویرانے میں کوئی رہنا پسند نہیں کرتا ہے۔

13. سکھ: راحت/آرام/چین: سکھ کے سب ساتھی رہتے ہیں۔

14. شانت: مطمئن/امن/تسلی: خدا شانت رہنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

7. واحد کی جمع اور جمع کی واحد بنائیے۔

1. زماں: زمانے　　2. مکان: مکانات　　3. صدیوں: صدی

4. تہذیبیں: تہذیب　　5. کھیتی: کھتیاں

8. ضد لکھئے۔

1. صحرا x دشت　　2. زماں x مکاں　　3. بیدار x سویا ہوا

4. غروب x طلوع　　5. خلوت x جلوت　　6. دکھ x سکھ

7. ویرانے x آباد　　8. شانت x شور

9. ان الفاظ کے معنی لکھئے۔

1. فطرت: قدرت

2. دیوی: دیوتا کی بیوی/عزت دار عورت

3. دیدہ: آنکھ

4. عیش: آرام

5. بزم: محفل

6. عشرت: خوشی

7. دفعتاً: اچانک

8. ریشمی: ریشم کا

9. آنچل: دوپٹے کا سرا

10. پردہ: نقاب/حجاب

11. وحشت: گھبراہٹ/دیوانگی

12. تلخیاں: کڑواہٹیں

13. محرومی: کسی چیز کا نہ ملنا/شکست

14. ناکامی: محرومی/شکست

15. نادار: غریب

16. مستزاد: زیادہ ہونا

17. پروردہ: پالا ہوا

18. خس: سوکھی گھانس

19. خاشاک: خس

20. صدقہ: دکھ/درد

21. دین: بخش

22. دریا: پانی کی بڑی دھار جو پہاڑ یا جھیل سے نکل کر کسی بڑی جھیل، ندی یا سمندر میں مل جائے

23. آہ: افسوس

24. آنسو: وہ پانی جو زیادہ تکلیف یا خوشی میں آنکھوں سے جاری ہو جاتا ہے

25. بزم: محفل، سبھا

26. عشرت: عیش، آرام، خوشی

10. ان الفاظ کی جمع بنایئے:

1. جنگل + جنگلات

2. باغ + باغات

3. دیوی + دیویاں

4. دیدہ + دیدے

5. پردہ + پردے

6. تلخی + تلخیاں

7. محرومی + محرومیاں

8. ناکامی + ناکامیاں

9. نادار + ناداریاں

10. صدقہ + صدقے

11. دریا + دریائیں

12. الم + آلام

11. ان الفاظ کی ضد لکھئے۔

1. جنگل x شہر

2. دور x نزدیک

3. غم x خوشی

4. رونا x ہنسنا

5. سورج x چاند

6. پھول x کانٹا

7. ہار x جیت

8. پردہxبے پردہ.

12. مندرجہ ذیل الفاظ کی مدد سے خالی جگہوں کو پر کیجئے

(جنگل،عیش، دیوی،غم دیدہ، بزم عشرت، رونا، پردہ، دفعتاً، روتے، ہنس، ہلکی، کے، ریشمی آنچل، آنسو کہ وحشت)

1. یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی۔

2. وہ غم دیدہ دلوں کے غم کے بدلے عیش دیتی ہے۔

3. میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزم عشرت میں

4. دفعتاً سورج جو بے پردہ ہوا۔

5. روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

6. ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں۔

7. تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ دیتی ہے۔

8. میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی۔

13. درج ذیل الفاظ کے معنی بیان کیجئے؟

1. مورد: وہ جگہ جہاں سے کوئی گزر

2. نوبت: نقارہ

3. مہ جبین: مراد خوب صورت

4. مکیں: رہنے والا

5. ہفتہ اقلیم: سات سلطنتیں کل کائنات، پوری دنیا کا بادشاہ

6. مقیم: قیام کرنے والا

7. فرق: سر

8. خودسر: سرکش/مغرور

9. گردش چرخ: آسمان کی گردش

10. گوہر: موتی، ہیرے

11. گوہر:

12. منقلب: بدلتا ہوا

13. نل دمن: ایک سنسکرت کہانی کے اہم کردار

14. درج ذیل الفاظ کے معنی لکھئے اور جملوں میں استعمال کیجئے۔

1. جا: جگہ: جابہ جا اللہ تعالیٰ کا جلوہ ہے۔

2. سرائے: مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ: دنیا سرائے فانی ہے۔

3. گور: قبر: گور آخرت کی پہلی منزل ہے۔

4. بوم: الو: ہمارے شہر میں بوم بہت ہیں۔

5. خاک: مٹی: خاک ہند کا ہر زرہ مجھے دیوتا سمان ہے۔

6. جہاں: دنیا: سارے جہاں سے اچھا ہمارا ملک ہندوستاں ہے۔

7. حسیں: خوبصورت: حضرت یوسف علیہ السلام بہت حسیں پیغمبر گزرے ہیں۔

8. رشک: فخر کرنا: مجھے اوپن اسکول کے طلبہ پر رشک ہے۔

15. واحد کی جمع بنائیے اور معنی لکھئے۔

1. شگوفہ: غنچہ کلی + شگوفے

2. نشاں: علامت، جھنڈا + نشانات

3. قبر: دفن ہونے کی جگہ گور + قبور

4. کاسہ: پیالہ + کاسے

5. طائر: پرندہ، مرغ + طائران رطیور

16. معنی لکھئے اور ضد بنائیے۔

1. گل: پھول x خار: کانٹا

2. مرگ: موت x زندگی: حیات

3. فانی: فنا ہونے والا x باقی: ہمیشہ رہنے والا مراد اللہ تعالیٰ

4. غرور: گھمنڈ، تکبر، انانیت x عاجزی: انکاری

5. استخواں: ہڈی x لحم رچرم: گوشت رچمڑا

17. درج ذیل الفاظ کی وضاحت کیجئے

1. بہرام: ایران کا ایک بادشاہ جو اپنی شجاعت اور بہادری کے لیے مشہور تھا۔

2. رستم: ایران کا مشہور پہلوان رستم بن زال۔

3. سام: رستم پہلوان کے دادا اور زال کے باپ کا نام تھا۔

4. عطر مٹی: لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے، نواب نصیر الدین حیدر نے عطر گل بنی مٹی کا عطر ایجاد کروایا تھا۔

5. قیصر: شاہان روم کا لقب، مغرور بادشاہ۔

6. فغفور: چین کے ایک بادشاہ کا نام تھا۔ اس کے علاوہ یہ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب بھی ہے۔

7. یوسف: اللہ کے ایک نبی جو حسن اور خوبصورتی میں بے مثال تھے۔

8. کوہ کن: فرہاد فارس کا باشندہ تھا جو شیریں پر عاشق تھا اس کو کوہ کن بھی کہتے ہیں۔

9. قیس: قیس کا اصل نام قیس بن عامر تھا لیکن مجنوں کے نام سے مشہور ہوا وہ لیلیٰ کے عشق میں دیوانا تھا۔

10. لیلیٰ: قیس کی محبوبہ، قیس اس کی محبت میں اشعار کہتا بھٹکتا پھرتا تھا اس کی دیوانگی دیکھ کر سب امتے مجنوں کہنے لگے۔

18. ان الفاظ کے معنی لکھئے۔

1. سبط: نواسا، پوتا

2. التجا: گزارش، درخواست، عاجزی

3. منت: خوشامد کرنا، گڑگڑانا، التجا کرنا

4. آنرو: عزت، حرمت

5. پسر: بیٹا، لڑکا، فرزند

6. پدر: باپ، والد

7. غرض: ضرورت، حاجت

8. شش ماہہ: چھے مہینے کا

9. شیر خوار: دودھ پیتا

10. ہفتم: سات

11. مظلوم: جس پر ظلم کیا گیا ہو

12. درنجف: ایک سفید پتھر جو نجف میں پایا جاتا ہے

13. لال: پیار، لاڈلا، بیٹا، رنگ کا نام

14. زوالجلال: صاحب جلال، دبدبے والا یعنی اللہ تعالیٰ

15. یثرب: مدینہ منورہ کا قدیم نام یثرب اور بطحا تھا

16. شاہ زادہ: بادشاہ کا لڑکا، شاہی خاندان کا ایک فرد

17. نورعین: آنکھوں کی روشنی مراد بیٹا

18. تھرا: کانپنا، بہت خوف کھانا، بے حد ڈرنا

19. بانو: شہزادی، خاتون، ملکہ مراد حضرت شہر بانو جو حضرت حسینؓ کی بیوی اور علی اصغر کی والدہ تھیں

20. ناموری: نیک نامی، شہرت، نام آوری کا مخفف

19. ان الفاظ کی جمع بنائیے

1. قدم: پیر	+اقدام
2. فوج: جنگی آدمیوں کا مجموعی	+افواج
3. التجا: گزارش	+التجائیں
4. منت: گڑگڑانا	+منتیں
5. غرض: حاجت	+اغراض
6. زبان: لسان	+زبانیں
7. صدمہ: دکھ	+صدمے
8. مظلوم: جس پر ظلم کیا گیا ہو	+مظلومیں
9. در: موتی	+درات

10. پوتا: پوتے

11. آنکھ: آنکھیں

12. بات: باتیں

20. ان الفاظ کی ضد لکھئے۔

1. عدو: دشمنی x صدیق: دوست
2. آبرو: عزت x بے آبرو: بے عزت
3. قریب: نزدیک x بعید: دور
4. پسر: بیٹا x پدر: باپ
5. پیاس: پانی پینے کی خواہش x شکم سیر: پیٹ بھر
6. مظلوم: جس پر ظلم کیا گیا ہو x ظالم: ظلم کرنے والا
7. لال: سرخ رنگ x زرد: پیلا
8. آسمان: آکاش، فلک x زمین: خشکی
9. التجا: گزارش x بے التجا: بغیر گزارش کے
10. غرض: ضرورت x بے غرض: بے ضرورت

21. ان الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

1. سبط: نواسا: حضرت حسنؓ سبط محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔
2. قدم: پیر: اچھے کام کے لیے اٹھنے والا قدم نیکی ہے۔
3. قریب: نزدیک: میرا گھر مسجد کے قریب ہے۔
4. فوج: سپاہی: ہندوستان کی فوج بہت طاقت ور ہے۔
5. سوال: پوچھنا: علم وہ خزانہ ہے جس کی چابی سوال ہے۔
6. چہرے: صورت: مکھڑا: انسانوں کی شناخت کے لیے چہرے اہم رول ادا کرتے ہیں۔
7. بے زباں: گونگا: تمام جانور بے زباں کے زمرے میں آتے ہیں۔
8. نبی زادہ: حضرت حسینؓ نبی زادہ تھے۔
9. شیر خوار: دودھ پیتا بچہ: شیر خوار بچہ کے لیے ماں کا دودھ مفید ہے۔
10. قصوروار: گنہگار خطا کرنے والا: قصوروار شرمندہ رہتا ہے۔
11. بے قار: بے چین: حضرت علی اصغر سات دن سے پیاس میں بے قار تھے۔

12. ذوالجلال: جلال والا: اللہ کی ذات ذوالجلال ہے۔

13. شاہ زاد: بادشاہ کا لڑکا: شہزادہ بادشاہ کا وارث ہوا کرتا ہے

14. نورعین: آنکھوں کا نور: بچہ کالا ہو کہ بدصورت والدین کے لیے نورعین ہوتا ہے۔

22. درج ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

1. رنگ فق ہونا: بیاری یا خوف کے سبب چہرے کا رنگ فق ہوتا ہے۔

2. سوال کرنا: سوال کرنے والے کی حاجت پوری کرنا اچھا عمل ہے۔

3. تھرا جانا: دوزخ کا تذکرہ نکلنے پر مومن تھرا جاتا ہے۔

4. آنکھیں جھکانا: اطاعت اور فرمانبرداری آنکھیں جھکانے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

سوال: ان مصرعوں کے جوڑ ملایئے۔

23. محاورے کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

1. دل مار کر جھکا بیٹھا رہا: مجبوراً برداشت کرنا: میں کسی خیال سے دل مار کر جھکا بیٹھا رہا۔

2. زبان دے چکے تھے: وعدہ کر لینا: ابا مرحوم نے تمہارے والدین کو زبان دے چکے تھے۔

3. پتھر تلے ہاتھ ہیں: مجبور و بے بس ہو جانا: پتھر تلے ہاتھ ہیں ورنہ میں بھی دیکھ لیتی۔

4. میدان چھوڑ کر بھاگنا: شکست کھا کر بھاگ جانا: یہ کام پورا کر لینگے، میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں ہیں۔

5. ہاتھ پاؤں پھولنا: گھبراہٹ طاری ہونا: گلاس پھوٹنے سے ہاتھ پاؤں پھولنا شروع ہو گیا۔

6. چور کی داڑھی میں تنکا: مجرم کو خوف رہنا: کچھ کرتے نہیں صرف کہتے ہیں جیسے چور کی داڑھی میں تنکا۔

24. تلمیح سے کیا مراد ہے؟

جواب: تلمیح سے مراد وہ لفظ جو کسی مشہور واقعہ یا تاریخی قصہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے وہ پورا قصہ یا تاریخی پس منظر ہوتا ہے جس کی طرف شاعر یا مصنف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا اس کے حوالہ سے تشریح ہوتی ہے۔ اس پورے قصہ کو جانے بغیر مطلب سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ مثال: ابن مریم: عیسیٰ علیہ السلام اور انکے معجزے

کوہِ طور: موسیٰ علیہ السلام کا تاریخی واقعہ

25. الفاظ معنی

تدبیریں: کوشش

کام تمام کرنا: جان لے لینا

پیری: بزرگی، بڑھاپا

مختاری: بااختیار ہونا

یاں: دنیا

قشقہ: تلک، ٹیکا

بیماری دل: دل کی بیماری

عہد: زمانہ، دور

تہمت: الزام

عبث: بے کار، بے وجہ

سپیدہ سیاہ: سفید اور کالا، نظام کائنات

دیر: مندر، بت خانہ

26. الفاظ: معنی

وصال: ملاقات

وصال یار: دوست سے ملاقات

نیم: آدھا

کش: کھینچا ہوا

نیم کش: آدھا کھینچا ہوا

خلش: چبھن

جگر: مراد دل

مسائل: مسئلہ کی جمع

تصوف: صوفیانہ خیالات

مادہ خوار: شرابی، شراب پینے والا

27. الفاظ: معنی

قرار: اقرار، عہد، وعدہ

لطف: مہربانی

پیشتر: پہلے

گلہ: شکوہ، شکایت

نباہ: پورا کرنا

حکایت: کہانی، قصہ

روٹھنا: ناراض ہونا

جی: طبیعت، دل، مزاج

آشنا: واقف کار، جان پہچان

باوفا: وفادار

مبتلا: عشق میں گرفتار، عاشق

28. الفاظ: معنی

عالم: حالت

طالعی: قسمت، نصیب

روبرو: آمنے سامنے، مقابل

پیام: قاصد پہچانے والا

شرح آرزو: تشریح آرزو

مہر: سورج

جستجو: تلاش

برگشتہ: منحرف، باغی

باراں: بارش

بے تاب: بے چین، بے قرار

میسر ہونا: حاصل ہونا

مہ: ماہ کا مخفف، چاند

حبیب: دوست، محبوب

مو: بال

گریباں: پوشاک کا وہ حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے

رفو گر: پھٹے ہوئے کپڑے کی مرکت کرنے والا

عالم: حسن، خوبصورتی، عالم

چاک کرنا: پھاڑنا

زنجیر زلف: بالوں کی لڑی

اسیر: قیدی، گرفتار

29. سرکاری افسر، ذمہ دار عہدیدار، مزدور لیڈر کس لیے تیار رہتے ہیں؟

جواب: سرکاری افسر کارپوریشن کے ذمہ دار اور مزدور لیڈر اخباری نمائندوں کو جواب دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

30. اہم شخصیتوں کے انٹرویو کہاں شائع ہوتے ہیں؟

جواب: اہم شخصیتوں کے انٹرویو روزناموں ہفت روزوں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔

31. شخصی انٹرویو میں کیا ہوتا ہے؟

جواب: شخصی انٹرویو میں حقائق اور رائے ہوتی ہے۔

32. نامہ نگار تازہ خبروں کے لئے انٹرویو کب لیتے ہیں؟

جواب: نامہ نگار تازہ خبروں کے لئے واقع کے فوراً بعد انٹرویو لیتے ہیں۔

33. انٹرویو میں سوالات کیسے ہوتے ہیں؟

جواب: انٹرویو میں سوالات مختصر مگر مفید ہوتے ہیں۔

34. ذہانت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

جواب: بندز بانوں کو کھلوانے اور کم گو لوگوں کو تیز گفتار بنانے کے لئے ذہانت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

35. انٹرویو لینے کے لئے کون کون سی جگہ مناسب رہے گی؟

جواب: انٹرویو لینے کے لئے گھر اور دفتر مناسب جگہ رہے گی۔

36. گھر پر انٹرویو لینا کیوں فائدہ مند ہے؟

جواب: کیونکہ گھر پر ماحول سازگار اور انٹرویو دینے والے کا موڑ اچھا رہے گا۔

37. اہم شخصیتوں کی تفصیلات کہاں ملیں گی؟

جواب: اہم شخصیتوں کی تفصیلات who is who جیسی ڈائرکٹریوں میں مل سکتی ہے۔

38. صحافی کو اپنے ساتھ کیا رکھنا چاہئے؟

جواب: صحافی کو ہمیشہ اپنے ساتھ شناختی کارڈ ID Card رکھنا چاہئے۔

39. انٹرویو کے مقاصد کیا ہیں؟

جواب: انٹرویو لینے سے جہاں کئی فائدے ہیں وہیں ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انٹرویو سے بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جو عام ذرائع سے نہیں معلوم ہوتیں اور نہ ہی ریکارڈ میں رہتی ہیں عام طور پر انٹرویو کے دو مقاصد ہوتے ہیں پہلا مقصد یہ ہے کہ کس مسئلے یا واقعہ پر منتخب شخصیتوں سے سوالات کے ذریعے نقطہ نظر معلوم کیا جاتا ہے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی شخصیت کے خدوخال کا پورا پورا نقشہ کھینچا جا سکتا ہے وغیرہ۔

40. فروغ اطفال پروجیکٹ کا اولین فریضہ کیا ہے؟

جواب: پسماندہ، کمزور طبقہ ارنا خواندہ والدین میں بیداری پیدا کرنا فروغ اطفال پروجیکٹ کا اولین فریضہ ہے۔

41. ضلع مجسٹریٹ گیان پور نے پروجیکٹ کے افسران اور آنگن باڑی رضا کار خواتین سے کیا کہا؟

جواب: ضلع مجسٹریٹ نے کہا کہ وہ فروغ اطفال خدمت کو سرکاری حیثیت میں نہ مان کر سماجی خدمت تصور کریں۔

42. ضلع مجسٹریٹ نے فروغ اطفال اسکیم کے ملازمین سے مزید کیا کہا؟

جواب: انہوں نے مزید کہا کہ مفادات سے بالاتر ہو کر گاؤں کو اپنا کنبہ تسلیم کریں۔

43. گاؤں کی مثالی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: گاؤں کی مثالی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے بھائی چارہ، باہمی تعاون اور یکجہتی کی شمع روشن کرنا چاہئے۔

44. ضلع مجسٹریٹ سے عورتوں کو خواندہ بنانے سے متعلق کیا کہا؟

جواب: انہوں نے کہا کہ عورتوں کو خواندہ بنانے سے ملک کے بچوں کا مستقبل سنور سکتا ہے کیونکہ ماں کی گود ہی بچے کی پہلے درس گاہ ہوتی ہے۔

45. ضلع مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق ماہرین تعلیم کو کیوں بلایا گیا تھا؟

جواب: ضلع مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق کئی ماہرین تعلیم کو اس سلسلے میں مشورے دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔

46. ماہرین تعلیم اس سلسلے میں کیا مشورے دیئے؟

جواب: ماہرین تعلیم نے خواندگی مہم کا ماحول بنانے کے لئے ثقافتی پروگرام کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اس کام میں الکٹرانک میڈیا کا تعاون لینا چاہئے۔ سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں اور کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ اس مہم کو کامیاب بنانے میں اپنی سطح سے کوشش کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ضلع خواندگی کمیٹی کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ شائع کیا جانا چاہئے۔

47. پرائمری اسکولوں کا تعاون لینے پر کس نے زور دیا؟

جواب: پریس کلب بلیا کے صدر اور سابق پرنسپل نے دیہی سطح پر تشکیل کی گئی کمیٹیوں کو فعال بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اس میں پرائمری اسکولوں کا تعاون لینا چاہئے۔

48. نگر پالیکا کے صدر نے کیا مشورہ دیا؟

جواب: نگر پالیکا کے صدر نے مشورہ دیا کہ گاؤں اور بلدیاتی اداروں کو بھی خواندگی مہم چلانے کے لئے رقم فراہم کرنی چاہئے۔

49. علاقہ پنچایت پندہ کے پرمکھ نے کیا مشورہ دیا؟

جواب: علاقہ پنچایت پندہ کے پرمکھ نے مشورہ دیا کہ جو رضا کار اچھا کام کریں ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔

50. خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پر کیجئے۔

1. زیادہ تر خبریں.....سے حاصل ہوتی ہیں۔ (ایجنسیوں)

2. ہندوستان کی سب سے بڑی نیوز ایجنسیاں..... ہیں۔ (پی. ٹی. آئی اور یو. این. آئی)

3. دنیا کی سب سے پرانی ایجنسی..... ہے۔ (Reuter)

4. ریلوے، روڈ ٹرانسپورٹ اور ایرلائنوں کے ہیڈ کوارٹرس.....کا ذریعہ ہے۔ (خبروں)

5. سیاست دانوں کی تقریروں میں شرکت کرنے سے.....ہاتھ لگتی ہیں۔ (خبریں)

6. خبریں ذاتی ملاقات اور.....پر بھی مل سکتی ہیں۔ (ٹیلی فون)

7. ''ک'' سے شروع ہونے والے.....سوالات ہیں۔ (6 چھے)

8. ''ک'' سے شروع ہونے والے سوالات میں اہم سوال ہے۔ (کیوں ہوا؟)

9. غیر طے شدہ خبروں کو جمع کرنے کے لیے.....ضرورت ہوتی ہے۔

(تجربہ کار اور پھرتیلے نامہنگاروں کی)

10. سب سے پرانی اور قابل بھروسہ خبر رساں ایجنسی..... ہے۔ (رویٹر)

51. خالی جگہوں کو متن میں آئے ہوئے مناسب الفاظ سے پر کیجئے۔

1..... ہر دکان پر یا دوا فروش کے پاس مل جاتا ہے۔ (گلاب ٹوتھ پیسٹ)

2. گلاب ٹوتھ پیسٹ میں.....کا عرق شامل ہوتا ہے۔ (پیلو)

3. پیلو کا عرق.....کو مارنے میں کام آتا ہے۔ (جراثیم)

4. ہندوستان مین شیروانی.....شہر کی زیادہ مشہور ہے۔ (علی گڑھ)

5..... ہر گھر کی ضرورت ہے۔ (کمپیوٹر)

6.....کا موجودہ دور کی صحافت سے گہرا تعلق ہے۔ (اشتہار)

7. اخبار کو چلانے کے لیے.....کی ضرورت ہوتی ہے۔ (مستقل آمدنی)

8. اخبار کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ..... ہے۔ (اشتہارات)

9. اشتہار نویسی کے لیے.....کی ضرورت ہوتی ہے۔ (تصور اور تخیل)

10. موجودہ دور میں.....کو تجارت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ (صحافت)

52. درجہ ذیل خالی جگہوں کو متن میں آئے الفاظ کی مدد سے پر کیجئے۔

1. الکٹرانک میڈیا میں ریڈیو، فلم، ٹی. وی، انٹرنیٹ اور ای میل شامل ہیں۔

2. بمبئی کا اسٹیشن جہاں سے ریڈیو شروع کیا گیا تھا ڈیڑھ کلوواٹ کا تھا۔

3. 1936ء عیسوی میں براڈ کاسٹنگ سروس کا نام آل انڈیا ریڈیو ہو گیا۔

4. فلم اور ٹیلی ویژن کے اثرات اور ٹیکنک میں بہت فرق ہے۔

5. یونسکو کی مدد سے 15 ستمبر 1959ء میں پہلا ٹی. وی سنٹر بنایا گیا۔

6. مہاراشٹرا کے شہر پونے میں ریلے سنٹر قائم ہوا۔

7. دہلی میں نیشنل پروگرام کی شروعات کے ساتھ ساتھ اسی دن رنگین ٹی. وی نشریات کا آغاز ہوا۔

8. سٹیلائٹ کے ذریعہ ٹیلی کاسٹ کی آسانی کے بعد پرائیوٹ چینل شروع ہوئے۔

9. ہماری سماجی اور نجی زندگی کے معمولات میں T.V شامل ہو گیا۔

10. ٹیلی ویژن نے اچھائیوں کی تشہیر کے ساتھ بہت سی ذہنی، اخلاقی اور سماجی برائیوں کو بھی جنم دیا ہے۔

53. معلومات کے لیے الکٹرانک میڈیا کس طرح اہم ہے؟

جواب: الکٹرانک میڈیا معلومات کا خزانہ ہے کہ اس میڈیم میں موجود ریڈیو ہمیں مختلف طرح کے پروگراموں سے ہمارے معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور تفریحی مواقع فراہم کرتا ہے جب کہ ٹیلی ویژن کے ذریعے انسانی فلاح کے بہت سے کام کئے جا رہے ہیں اب ٹیلی ویژن صرف شوق کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک لازمی ضرورت بن چکا ہے۔ یہ معلومات کا اہم ذریعہ بھی ہے اور تفریح کا سامان بھی ہے اس کے ذریعہ گھر بیٹھے پوری دنیا دکھائی دیتی ہے اور کوئی بھی خبر سکنڈوں میں پوری دنیا تک پھیلائی جا سکتی ہے۔

الغرض کہ ٹیلی ویژن نے ہماری سماجی اور نجی زندگی کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ یہ ہمارے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہو گیا ہے۔

54. صنف رپورتاژ اردو میں کہاں سے آئی اور اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: رپورتاژ اردو میں فرانسی ادب سے آئی ہوئی صنف ہے۔ رپورتاژ فرانسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رپورٹ کیہیں۔ رپورتاژ صرف رپورٹ نہیں ہے بلکہ اس میں چشم دید واقعات ہوتے ہیں، سنے سنائے

واقعات نہیں ہوتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مصنف جس واقعہ پر رپورتاژ لکھنا چاہتا ہے وہ خود اس کا مشاہدہ کیا ہوا ہو۔ ایک اچھے رپورتاژ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کی سچائی اور جذبات وتاثرات کے ساتھ ساتھ گہرائی اور خلوص بھی شامل ہو۔ اس لئے رپورتاژ نگار کا کسی واقعہ، حادثے، ادبی جلسے، مشاعرے، کانفرنس وغیرہ کا ذاتی طور پر دیکھنا اور اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔

اردو میں رپورتاژ کا باقاعدہ آغاز ترقی پسند دور سے شروع ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کا رپورتاژ ''یادیں'' اردو کا پہلا مکمل رپورتاژ ہے۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور شاہد احمد دھلوی وگیرہ اردو کے اچھے رپورتاژ نگار ہیں۔

55. افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں کیا فرق ہے؟

جواب: افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں سب سے بڑا فرق کھائی پن کا ہے۔ غیر افسانوی ادب میں تذکرہ نگاری، تحقیق وتنقید، مکاتب، مضمون نگاری، صحافت، طنز ومزاح، آپ بیتی، خاکہ نگاری، انشائیہ رپورتاژ اور سفر نامے شامل ہیں۔ جس کے واقعات میں حقیقت وسچائی ہوتی ہے۔ اس میں چھوٹی باتیں یا من گھڑت واقعات نہیں ہوتے بلکہ جو واقعہ یا حادثہ پیش آیا ہے اسی کا ذکر ہوتا ہے۔ افسانوی ادب میں داستانِ ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں۔ جس میں حقیقت وسچائی کم اور افسانویت من گھڑت واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔ افسانوی ادب کے کسی بھی صنف میں واقعہ، بلاٹ، کردار مکالمہ اسی طرح کئی قسم کی پابندی ہوتی ہے جبکہ غیر افسانوی ادب کے اصناف میں یہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔

56. اردو کے چند تذکرہ کے نام لکھئے؟

جواب: اردو شعرأ کا پہلا دستیاب تذکرہ میر تقی میر کا ''نکات الشعرأ'' ہے جس کا سال تصنیف 1752ء ہے۔ اس کے بعد کئی تذکرے لکھے گئے جن میں محمد حسین آزاد کا ''آپ حیات'' کو کافی شہرت ملی۔ اس کے علاوہ اردو میں جو تذکرے لکھے گئے وہ یہ ہیں۔ اشار الشعرأ، جلوۂ خضر، یادگار صنعم، آپ بقا، گل رعنا، خم خانہ جاوید وغیرہ۔

57. تنقید کے ابتدائی نقوش کہاں نظر آتے ہیں۔

جواب: اردو میں تنقید کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی سے ہوتا ہے۔ حالی سے پہلے بھی تنقید کے نقوش ہم کو تذکروں میں ملتے ہیں۔ اکثر تذکروں میں تذکرہ نگار، شاعر کا نام، تخلص، استاد کا نام سکونت وغیرہ کا ذکر کے کلام پر ایک

دو جملوں میں تبصرہ بھی کرتا تھا جس کو ہم تنقید کے ابتدائی نقوش کہہ سکتے ہیں۔اس طرح تذکروں میں تنقید کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔

58. اردو کے چند ناقدین کے نام لکھئے؟

جواب: اردو کے چند مشہور ناقدین یہ ہیں مولانا الطاف حسین حالی،شبلی نعمانی،عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، احتشام حسین، آل احمد سرور،کلیم الدین احمد، ممتاز حسین، اختر حسین رائے پوری، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام،محمد حسن،شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ۔

59. حالی کی سوانح کتابوں کے نام لکھئے؟

جواب: مولانا حالی نے تین ادبی شخصیتوں پر سوانح کتابیں لکھی ہیں۔پہلی کتاب ''حیات سعدی'' ہے جس میں فارسی کے عظیم شاعر شیخ سعدی کی زندگی بیان کی گئی ہے اسی طرح ''حیات جاوید'' جس میں سرسید کی زندگی اور ''یادگارِ غالب'' میں غالب کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

60. حیدر بخش حیدری کے چند تصانیف کے نام لکھئے۔

جواب: حیدر بخش حیدری کی کئی ایک کتابیں جن میں سے چند مشہور کتابیں یہ ہیں۔گلزار دانش،گل مغفرت، ہفت پیکر،لیلیٰ مجنوں اور طوطا کہانی۔

61. ایک غریب کسان کو جاڑے میں کھیت کی حفاظت کے لیے کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: ایک غریب کسان کو جاڑے میں کھیت کی حفاظت کے لیے کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔سب سے پہلے اس کو سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی کھیت کی جانب چلنا ہوتا ہے۔کھیت میں اس کو رات گزارنے کے لیے کوئی آرام دہ کمرہ نہیں ہوتا بلکہ گھاس پھوس سے بنی مختصر سی جھونپڑی ہوتی ہے جس میں اس کو رات گزارنا ہے۔تمام رات کھیت کی حفاظت کے لیے اس کو نیند سے دور رہنا پڑتا ہے۔اگر یہ موسم سردی کا ہو تو ایک اور عذاب ہوتا ہے۔کھیتوں میں رات کے وقت شدید سردی کی لہریں چلتی ہیں۔جس سے کسان کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔اگر کوئی جانور کھیت کی فصل پر حملہ کرے تو کسان خود اکیلا اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اکثر کئی مرتبہ وہ اس کام میں کامیاب ہوتا ہے کبھی کبھی خونخوار جانور مثلاً شیر، ریچھ وغیرہ بھی رات کے وقت کسانوں پر حملہ کرتے ہیں۔جس سے کسانوں کی جانوں تک قطرہ لاحق ہوتا ہے غرض کہ کسان جاڑے کی رات میں کئی مصیبتوں کو سہہ کر کھیت کی حفاظت کرتا ہے۔

62. ہلکو مزدوری کے بدلے کھیتی کرنے پر کیوں ترجیح دیتا ہے؟

جواب: ہلکو ایک کسان کا بیٹا ہے اس کو کھیتی سے محبت ہے۔ وہ مزدوری سے گھبراتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک کسان کا بیٹا ہو کر مزدوری کرنا شرم کی بات ہے اس کی کاہلی اور سستی کی وجہ سے اس کی فصل برباد ہو جاتی ہے۔ جس پر وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ منی دل میں یہی خیال آتا ہے کہ کھیتی چھوڑ کر مزدوری کروں مگر جی گھبرا اٹھتا ہے۔ آگے وہ کہتا ہے کہ کتنی بھی بری حالت آئے کھتی کا کام نہ چھوڑونگا۔

63. صوت نقلی الفاظ کسے کہتے ہیں؟

جواب: صوت کے معنی آواز کے ہیں صوت نقلی الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ایسے الفاظ متن کے اندر جو آواز ہو وہی منی بھی ہو جیسے ٹن تن گھنٹے کی آواز، اسی طرح کتے کی کوں، کوں، جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر یا ہلکو اپنے کھیتوں میں چر رہی نیل گائے کو بھگانے کے لیے کہتا ہے۔ ہلو بلو، ہو بہو، ہاہا وغیرہ۔

64. شکایت کرنے والے کا پتہ کہاں لکھا جاتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے خط کے اوپری حصہ کے دائیں جانب جس کو ہم خط لکھ رہے ہیں اس کا پتہ لکھا جاتا ہے۔ آداب کے بعد خط کا اصل مقصد لکھا جاتا ہے خط کے اختتام پر خط کے بائیں جانب نیچے کے حصہ میں خط لکھنے والے یا شکایت کرنے والا کا پتہ لکھا جاتا ہے۔ مثال:

(مکتوب الیہ کا پتہ).....

.....

.....آداب

مقصد خط .....

.....

خاکسار

(شکایت کرنے والے کا پتہ.....

.....

65. دفتری نوٹ عام طور پر کون لکھتا ہے؟

جواب: دفتری نوٹ کسی بھی شعبے کا سینئر کلرک یا متعلقہ کلرک لکھتا ہے۔ کسی بھی دفتر میں دفتر کے سربراہ کے تحت

بہت سے شعبے ہوتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شعبے سے آنے والی فائل کا خود ہی مطالعہ کرے اور اس پر غور و فکر کر کے دستخط کرے۔ اس لیے شعبے کا متعلقہ کلرک یا سینئر کلرک یا فائل پر مسئلے کے سلسلے میں ایک نوٹ تیار کرتا ہے جس میں کسی بھی مسئلہ کا ذکر اس کی تفصیلات اور تجویز بھی شامل ہوتی ہے۔ اس نوٹ پر پہلے متعلقہ کلرک دستخط کرتا ہے اس کے بعد شعبے کا سربراہ دستخط کرتا ہے۔

66. دفتری نوٹ میں سب سے پہلے کیا لکھا جاتا ہے؟

جواب: دفتری نوٹ میں سب سے پہلے مسئلہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مسئلے کے حق میں یا خلاف میں جو دلائل ہیں وہ پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فیصلے کے لیے تجویز پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح دفتری نوٹ مکمل ہوتی ہے۔ مسئلہ کی ابتداء میں جس کا مسئلہ ہے اس کا نام پتہ اور منسلکہ کے کاغذات منسلک ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔

67. منسلکہ کاغذات کی تفصیل خط میں کس جگہ دی جاتی ہے؟

جواب: کسی بھی خط میں منسلکہ کاغذات کی تفصیل خط کے اختتام پر دی جاتی ہے۔ جس میں خط میں پیش کردہ مسائل کے دلائل اور ثبوت ہوتے ہیں اگر کوئی ملازمت یا عہدے کے لیے خط لکھا جا رہا ہو تو منسلکہ کاغذات میں سرٹیفکیٹس، تاریخ پیدائش کا نمونہ تجربہ کی نمونہ کاپی منسلک کی جاتی ہے۔ منسلکہ کاغذات سے خط میں پیش کردہ دلائل مستند مانے جاتے ہیں۔

68. نیم سرکاری خط لکھنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

جواب: نیم سرکاری خط فوری اور شدید ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ خط عام طور پر برابر کے افسر ایک دوسرے کو لکھتے ہیں یا بڑا آفیسر چھوٹے کو لکھتا ہے۔

69. آپ نے کبھی کوئی سیکل یا رکشہ یا بس کی ٹکر دیکھی ہوگی۔ اس کی رپورٹ لکھئے؟

جواب: حیدرآباد۔ 11 مئی شہر پبلک گارڈن کے علاقے میں آج ایک تیز رفتار لاری کی زد میں آخر آٹو رکشا میں سوار چار لوگوں کی موت ہوئی۔ دو لوگ زخمی ہوگئے۔ پولیس کی اطلاع کے مطابق لاری ڈرائیور راجو نے نشے کی حالت میں لاری چلاتے ہوئے مقابل کے آٹو رکشا کو ٹکر مار دیا۔ جس کی وجہ سے آٹو رکشہ لاری کے پہیوں کی زد میں آ گیا۔ اس موقع پر آٹو میں سوار چار لوگوں کی موت واقع ہوئی اور دو لوگ شدید زخمی کی حالت میں قریب کے دواخانہ میں شریک کئے گئے۔ لاری کا نمبر AP.2923224 تھا۔ ڈرائیور راجو کو فوراً لوگوں

نے پکڑ کر پولیس کی حراست میں دے دیا۔ لاری مٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اس کو بھی پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ مرے ہوئے لوگوں کی نشاندہی، کمل، اشرف، روحت، زوی سے کی گئی جو اپنے دوست یا دو کی شادی میں شرکت کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ زخمی شدہ لوگوں کی نشاندہی راگھو اور رامن سے کی گئی۔ پولیس اس معاملہ میں کیس درج کر کے تفتیش جاری رکھی ہوئی ہے۔

70. ذیل کی خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پر کیجئے۔

1. اداریہ.....کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ (مدیر)

2. اداریہ اخبار میں.....جگہ پر ہوتا ہے۔ (نمایاں)

3. اداریہ کی سرخی.....سے جڑی ہونی چاہئے۔ (موضوع)

4. اداریہ کی زبان.....ہونی چاہئے۔ (آسان، عام فہم)

5. اداریہ کا لب ولہجہ.....ہونا چاہئے۔ (اعتدال پسند)

71. خالی جگہوں کو پر کیجئے

پنڈت ہرج نرائن کا تخلص.....ہے۔

مدوجزا اسلام.....کی نظم ہے۔

قطب شتری.....داستان ہے۔

ساقی نامہ.....کی مشہور نظم ہے۔

جوابات:1. چکبست 2. حالی 3. عشقیہ 4. اقبال

72. ضد لکھئے۔

1. ترقی 2. نظم 3. تہذیب 4. صبح

جوابات:1. تنزل 2. نثر 3. بدتہذیب 4. شام

73. خالی جگہوں کو موزوں الفاظ سے پر کیجئے۔

1. تمہیں اس انقلاب.....کا کیا غم ہے اے اکبر۔

2. شاعر نے مغربی نغمے کو.....قرار دیا ہے۔

3. اکبر الہ آبادی.....میں پیدا ہوئے۔

4. اکبرالہ آبادی کا انتقال.....میں ہوا۔

جواب:1) دہرہ 2) بے تال وسم 3) 1846 4) 1921

74. الفاظ و معنی لکھئے

	جوابات
1. روئے صنم	محبوب کا چہرہ
2. حس	احساس
3. مغنی	گانے والا
4. تغیر	تبدیلی

75. خالی جگہوں کو موزوں الفاظ سے پر کیجئے۔

1. جاں نثار اختر کے والد کا نام.....ہے۔

2. .....مجموعے کلام پر 1974ء میں سویت دیس میں نہرو ایوارڈ دیا۔

3. ساہتیہ اکادمی ایوارڈ.....میں دیا گیا۔

جواب:1. مضطر خیر آبادی 2. خاک دل 3. 1976ء بعد از مرگ